ایک انقلابی مردِ مومن کی داستانِ حیات
ان کی تدبیرِ جہانبانی سے ڈرتا تھا زوال
تذکرۂ شیخ الہند
از
مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب
ناشر
مدنی دار التالیف بجنور، یوپی
کتبہ عاصم

اِن کی تدبیر جہاں بانی سے ڈرتا تھا زوال

تذکرہ شیخ الہند رح

ایک انقلابی مردِ مومن کی داستانِ حیات

از قلم
مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب

ناشر
اِدارۂ مدنی دار التالیف بجنور
قیمت .... ساڑھے چار روپے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نام کتاب — تذکرہ شیخ الہندؒ

مؤلف — مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب

صفحات — ۳۶۸

قیمت — ساڑھے چار روپے

سن طباعت — اگست ۱۹۶۵ء

مطبوعہ — مدینہ پریس بجنور

ناشر ادارہ مدنی دار التالیف بجنور یوپی

(عبد المنان خوشنویس)

فہرست عنوانات تذکرہ شیخ الہندؒ

مآخذ و حوالہ جات

۱۔ ماہنامہ الرحیم — حیدرآباد سندھ
۲۔ علمائے حق — از مولانا محمد میاں صاحب
۳۔ بزرگان پانی پت — "
۴۔ تذکرہ مشائخ دیوبند — از مؤلف
۵۔ اشرف السوانح — از خواجہ عزیزالحسن
۶۔ مسلک علمائے دیوبند — از قاری محمد طیب صاحب
۷۔ تسہیل البیان — از مولانا ذوالفقار علی صاحبؒ
۸۔ حیات شیخ الہند — از میاں اصغر حسین صاحب
۹۔ تذکرۃ الخلیل — از مولانا عاشق الٰہی میرٹھی
۱۰۔ تذکرۃ الرشید — "
۱۱۔ سوانح قاسمی — " محمد یعقوب
۱۲۔ " — " مناظر احسن گیلانی
۱۳۔ نقش حیات — از شیخ الاسلام
۱۴۔ مکتوبات — "
۱۵۔ اسیر مالٹا — "
۱۶ ایضاح الادلہ — از شیخ الہند

۱۷۔	احسن القریٰ	از شیخ الہند
۱۸۔	افادات محمود	" "
۱۹۔	مقدمہ قرآن شریف	" "
۲۰۔	مکتوب مولوی مجید حسن	از مولوی مجید حسن
۲۱۔	ضیاء القلوب	از حاجی امداد اللہ صاحب
۲۲۔	مکتوبات رشیدیہ	از حضرت گنگوہی
۲۳۔	شیخ الاسلام نمبر	الجمعیۃ دہلی
۲۴	فتویٰ کراچی	از مفتی محمد شفیع صاحب
۲۵۔	عمدۃ القاری	از علامہ بدرالدین عینی
۲۶۔	فیض الباری	از علامہ کشمیری
۲۷۔	مدینہ	بجنور
۲۸۔	روئداد	دارالعلوم دیوبند
۲۹۔	ہدیہ صدیقیہ	از دیوبند
۳۰	القاسم	از دیوبند
۳۱۔	الرشید	"
۳۲۔	شیخ الہند	از ڈاکٹر انصاری
۳۳۔	اصلاح	بجنور
۳۴۔	چٹان	لاہور
۳۵۔	الفرقان	لکھنؤ

۳۶۔	ہمدرد	دہلی
۳۷۔	تیج	"
۳۸	پرتاپ	"
۳۹۔	ملاپ	"
۴۰۔	خطبات	از علامہ سندھی
۴۱	تعلیمات	" "
۴۲	روشن مستقبل	از مولانا طفیل احمد صاحب
۴۳۔	مسلمانوں کا ایثار	از عبد الوحید خاں "
۴۴۔	مرد مومن	" عبد الحمید خاں
۴۵۔	الخلیل	بجنور
۴۶۔	افاضات الیومیہ	از حضرت تھانوی
۴۷۔	روایات	از مولانا محمد جلیل صاحب
۴۸۔	"	" فخر الدین "
۴۹۔	"	" محمد ابراہیم " انصاری
۵۰	"	" معراج الحق "
۵۱	"	از حضرت مولانا محمد زکریا صاحب
۵۲	"	از ماسٹر خورشید الحسن صاحب مراد آباد
۵۳۔	مکتوبات	حاصل کردہ از نسیم فریدی امروہہ
۵۴۔	"	از مولوی مجید حسن مدینہ بجنور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ابتدائیہ

حامداً ومصلیاً۔ اما بعد

تالیف عزیز حیات امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ سے فارغ ہوا ہی تھا کہ ایک رات کو خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت شیخ الہند کو۔ گود میں لئے بیٹھا ہوں اور بالکل اسی طرح جس طرح بچہ کو۔ دونوں ہاتھوں سے ان کو اپنی آغوش میں لے رکھا ہے اور انھوں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے مجھے۔ سامنے حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہٗ العزیز دونوں ہاتھوں میں کچھ کاغذات لئے کھڑے ہیں۔ ایک طرف کو حضرت مولانا سید فخر الدین احمد شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند کھڑے ہیں......... حضرت مدنی شیخ الحدیث ممدوح کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے فرما رہے ہیں ان سے دریافت کرو۔

اسی حالت میں آنکھ کھل گئی۔ دل پر ایک عجیب مسرت تھی اور ہونا بھی چاہیئے تھی۔ آخر بلا کرے دھرے اتنی فضیلت تو مل گئی۔ لیکن عقدہ نہ کھل سکا۔ دیوبند گیا۔ دریافت کیا۔ فرمایا اللہ تعالیٰ تم سے حضرت شیخ الہندؒ کے متعلق کوئی خدمت لیگا۔ ایک دوست سے ملاقات ہوئی۔ ان سے کوئی ذکر بھی نہ ہوا تھا کہ انھوں نے حیات شیخ الہند

از قلم مولانا سید اصغر حسین صاحب میرے سامنے ڈالدی اور فرمایا کہ اس کو قرینہ کے ساتھ ترتیب دیدو۔ اگر چاہو تو کچھ اضافہ بھی کر دو۔ فوراً ذہن خواب کی طرف گیا اور اس کتاب کو اشارۂ غیبی سمجھا۔ گھر آیا اور کتاب کو رکھدیا۔ دو ایک مہینہ ویسے ہی رکھے رہا۔ مگر شیخ الہند کا خیال تھا کہ دماغ پر طاری تھا۔ ایکدن دفتر مدینہ سے اسی سلسلہ کی تمام سیاسی کتابیں اٹھالایا اور پڑھنا شروع کیا۔

اسی اثنا میں ایک تبلیغی اجتماع کی شرکت کے لئے امروہہ گیا۔ وہاں مولانا نسیم فریدی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ باتوں باتوں میں حضرت شیخ الہندؒ کا ذکر آگیا۔ میں نے اپنا ارادہ ظاہر کیا۔ انھوں نے نہایت مسرت کے ساتھ میرے خیال کی تائید کی اور فوراً ہی حضرت شیخ الہندؒ کے چند مکتوب عنایت فرمائے اور ایک مکتوب مولوی جنید حسن صاحب مالک اخبار مدینہ کا ترجمہ قرآن پاک کے متعلق دیا۔ ان تمام چیزوں کو میں نے تائید غیبی تصور کیا۔

چند دنوں کے بعد جناب نسیم فریدی صاحب نے ایک رسالہ "شیخ الہند" دستی میرے پاس بھجوایا اس کے بعد نہٹور سے چند بوسیدہ رسالے دستیاب ہوئے۔ اپنے کتب خانہ کی ردی کھولنے کو دیکھا تو ایک رسالہ دار العلوم دیوبند کی بنیاد کیمتعلق نکل آیا۔ اسی طرح اسی سلسلہ کے چند القاسم اور الرشید نکل آئے۔ مدینہ اخبار کو دیکھا تو تمام خزانہ اس میں موجود پایا۔ اخبار "اصلاح[۵] بجنور" کو دیکھا تو اس میں مدینہ سے

---

[۵] یہ اخبار بجنور سے جاری ہوا۔ عمر کے اعتبار سے مدینہ کا معاصر ہے لیکن اس وقت کے معیار کے اعتبار سے مدینہ سے اعلیٰ ہے اس کا ایک فائل میرے پاس موجود ہے۔ کیا عرض کروں تاریخی خزانوں سے لبریز ہے۔ اس اخبار کے مالک اور منیجر جناب بابو ظہور الحق صاحب ابھی بقید حیات ہیں مد اللہ ظلہٗ۔

زیادہ خزانہ موجود تھا۔ بجنور کے ایک صاحب نے حضرت شیخ الہندؒ کے دس بارہ مکتوب عنایت فرمادیئے۔ اس پر بھی اگر میں اس کتاب کو ترتیب نہ دیتا تو یہ میری نحوست تھی۔

آپ خیال فرمائیں میں نے اس کتاب کی ترتیب کے لئے کیا کیا۔ جب سب چیزیں از خود میرے پاس پہونچ گئیں تو بس میرا کام تو اتنا ہی رہا ہے کہ ان سب کو سلیقہ کے ساتھ ترتیب دیدیا۔ اب معلوم نہیں کہ میں اس میں کامیاب ہوں یا نہیں۔

ترتیب تذکرہ

حسن اتفاق سے ایک جدید رسالہ "الرحیم کراچی" مل گیا۔ اس میں علامہ سندھی کا ایک مضمون تھا۔ اس مضمون اور حیات شیخ الہند" کو میں نے بنیاد بنایا اور تبرک کے طور پر علامہ مرحوم کے اس مضمون کو اس کتاب کے پیش لفظ کی جگہ شامل کر دیا۔ اور پھر ترتیب وار لکھنا شروع کر دیا۔ لیکن درمیان میں پہونچنے کے بعد میں نے مختلف فائل بنائے اور ان سب میں ایک ساتھ اندراج شروع کیا۔ اس طرح نصف کتاب کے بعد تمام عنوانات تقریباً ایک ہی ساتھ ختم ہوئے۔

معذرت کیساتھ

تذکرہ شیخ الہند" ایک مرد مومن کی داستان حیات ہے لہٰذا میرے نزدیک یہ تاریخی خیانت ہے کہ ماحول سے متاثر ہو کر یا عصبیت یا گروہ بندی کا شکار ہو کر حالات کو یا تو حذف کر دیا جائے یا پھر ان کا ایسا شان نزول بیان کر دیا جائے کہ معنی ہی تبدیل ہو جائیں اور اتفاق سے آج کل ایسا بکثرت ہو رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر تقسیم ہند نہ ہوئی ہوتی تو پھر قلمکاروں کے قلم سے کچھ اور نکلا ہوتا۔

احقر راقم السطور نے بھی حالات، واقعات کو قلمبند کیا ہے لیکن اس خیال کے تحت کہ قوم سے ماضی کو چھپا لینا اس کے مستقبل کو تاریک بنا دینے کے مترادف ہے۔ بلکہ

قوم کو موقع دینا چاہیئے کہ وہ ماضی کو دیکھے اور بغور دیکھے اور پھر مستقبل کے لئے سامان سفر کرے۔ اس بے حجابی سے زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ موجودہ نسل کے چند افراد مجروح ہو جائیں گے۔ تو اس کا خیال کرنا بیکار ہے اس لئے کہ چند افراد کے لئے پوری قوم کو بھینٹ نہیں چڑھایا جا سکتا۔

میرے اس نقطۂ نظر سے غالباً یہ بات ظاہر ہو گئی ہو گی کہ اس کتاب میں میں نے کسی قدر جرأت سے کام لیا ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ انشاء اللہ ثم انشاء اللہ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد قارئین کرام مجھے جنبہ داری کا شکار نہ پائیں گے۔ باتیں صاف صاف ہیں۔ اگر کسی کا قصور تھا تو اس کی تاویل نہیں کی۔ اور اگر قصور کے باوجود کسی میں خوبی تھی تو اس کا بلا دریغ اعتراف کیا ہے۔ اس لئے ممکن ہے کہ جب کچھ کڑوی باتیں یا وہ واقعات آئیں جن پر ہزاروں من خاک کے تودے جمے ہوئے تھے تو یقیناً ان نکھری باتوں کو دل تو قبول کر لیگا لیکن قلب نفاق اور چشم تعصب ضرور انکا انکار کریگی اور ممکن ہے کہ اسوقت دو چار مجھے بھی سنا دی جائیں لیکن

طبل و علم ہے پاس نہ کچھ اپنے مال و ملک
ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا

عزیز الرحمٰن غفرلہٗ
مدنی دار الافتاء بجنور
۱۷ صفر المظفر ۱۳۸۵ھ مطابق ۱۸ جون ۱۹۶۵ء

پیش لفظ

شاہ ولی اللہ اور ان کی تحریک

(از عبیداللہ سندھی)

ہمارے دوست عام طور پر جانتے ہیں کہ جب سے ہم ہند میں واپس آئے ہم نے کسی سیاسی جماعت سے پورے اشتراک کا کبھی ارادہ نہیں کیا، بلکہ ایک ایسے فکر کی دعوت دیتے رہے جو ملک کی عام ذہنیت سے بہت دور ہے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ جو پارٹی امام ولی اللہ کی فلاسفی پر بنے گی وہی ہماری وطنی ملی ضرورتیں پوری کرے گی ہمارا یہ فکر اور زمانہ کی وہ فضا کہ اہل علم بھی نہیں جانتے کہ امام ولی اللہ واقعی فلاسفر تھے۔ یا انھوں نے کوئی ایسا سیاسی تخیل پیدا کیا ہے جو آج جمہور کے ترقی کن طبقہ کے مزاج سے سازگار ہو سکتا ہے۔

آخر میں مفکرین کا ایک خاص حلقہ سنجیدگی سے ادھر متوجہ ہوا۔ وہ سمجھنا چاہتے ہیں کہ ہند جیسے براعظم میں اگر ایک ایسی سوسائٹی جو خاص فکر لے کر پیدا ہوتی ہے اور تخمیناً سات سو سال کی جد و جہد سے اپنے لئے عالمگیر ترقی کا پروگرام بنا لیتی ہے کیا اس عظیم الشان جماعت کی تمام ضرورتیں کسی ایسی نیشنل پارٹی کی تشکیل سے پوری

ہو سکتی ہیں. جو امام ولی اللہ کے فلسفہ اور سیاست سے اساسی تعلق رکھتی ہو.

ان کے افکار میں ہلکا سا تموج پیدا کرنے کے لئے ہم نے پہلے امام ولی اللہ کی حکمت کا اجمالی تعارف کرایا اس کے بعد ان کی سیاست کا، ہم امام ولی اللہ کو الہیات میں اور اقتصادیات میں ایک مستقل امام فرض کر کے مضامین لکھتے ہیں۔

پہلے رسالہ میں بھی اگرچہ بعض خیالات نئے تھے مگر انھیں ناقابل برداشت نہیں سمجھا گیا، البتہ دوسرے رسالہ میں جو کچھ لکھا گیا ہے۔ اس میں مختلف جماعتوں کے لئے مزاحمت کا کافی سامان موجود ہے۔

جس قدر احزاب پہلے سے امام ولی اللہ کی طرف منسوب ہیں یا جس قدر جماعتیں ان کی مخالف تحریکوں کو چلاتی ہیں اور اپنے تفوق کا دعویٰ بھی رکھتی ہیں ان کے افکار سے اس رسالہ میں تعرض نہ کرنا ممکن ہی نہ تھا اس لئے نسبتاً اس پر زیادہ توجہ ہو رہی ہے۔

ہمارے بعض دوستوں نے مشورہ دیا تھا کہ اسی سیاسی رسالہ میں بہت سے نئے خیالات ہیں ہم جلدی نہ کریں، اہل علم کو سوچنے کا موقعہ دیں۔ اس لئے سال بھر ہم خاموش رہے۔ اس عرصہ میں ہم نے ایک نیا رسالہ مرتب کیا ہے جس میں امام ولی اللہ کی تصانیف سے مختلف فوائد بغیر کسی حاشیہ آرائی کے جمع کر دیئے ہیں اس کے شائع ہونے پر اہل علم کے لئے غور کرنے میں آسانی ہوگی۔ لیکن بعض عزیز دوستوں کا تقاضا ہے کہ ہم اس موضوع پر ایک مقالہ ضرور لکھیں جس سے بعض غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی اسلئے مناظرہ) مجادلہ سے بچکر اپنے مطالب کی توضیح کیلئے ہم نے یہ تبصرہ تیار کر دیا ہے اگر اس طرح ہم بعض دوستوں کے ذہنی انتشار کو کم کر سکتے ہیں تو ہم اسے خدا کا خاص فضل سمجھیں گے۔ واللہ ہو المستعان۔

حکیم الہند امام ولی اللہ الدہلوی

چونکہ عقلی اجتماعی اصول پر تاریخ ہند کا مطالعہ کرنے میں ہم کسی مورخ کو امام نہیں مانتے اس لئے ہمارے لئے ضروری ہے کہ جس فلسفہ کا ہم تعارف کراتے ہیں۔ اس کی ماہئیت، اور جس زمین اور زمان سے ہم اسے ربط دیتے ہیں۔ اس کے متعلق اپنا طرز تفکر صراحتاً بیان کر دیں، تاکہ ہمارا نظریہ سمجھنے میں اصطلاحی اختلاف سے غلط فہمی نہ ہو سکے۔

(الف) جب انسانیت کا ایک حصہ کسی بڑے قطعہ زمین میں لمبی مدت تک مل جل کر رہتا ہے اور قدرت الٰہیہ اس کی طبعی ترقی کے ساتھ عقلی اور اخلاقی بلندی کا سامان بھی بہم پہنچاتی ہے یعنی اس میں انبیاء کرام اور اولیاء عظام کے ساتھ اصلح سلاطین اور حکام بھی پیدا ہوتے ہیں۔ یا حکماء اور شعراء کے ساتھ عدالت شعار بادشاہ اور بلند ہمت سپاہی برسر کار آتے ہیں۔ اس طرح وہ بڑی قوم ترقی کے تمام مدارج طے کرتی ہے۔ اپنی حکومت کا نظام بناتی ہے جس سے ظلم کی بیخ کنی ہو۔ شہر بساتی ہے علم و ہنر پھیلاتی ہے جس سے رفاہئیت عامہ کا سامان بہم پہنچتا ہے۔ اس کی ہمسایہ قومیں اس کی رفاقت اور سرپرستی میں اپنی فلاح سمجھتی ہیں۔ اگر اس کی اجتماعی تاریخ کو انسانیت کے عام پسند عقلی افکار و اخلاق پر مرتب کیا جائے تو اسے حکمت الادیان یا فلسفہ تاریخ کہا جائے گا۔

(ب) ہم ہند کی اسلامی تاریخ کا مطالعہ مسیحی تاریخ کے دوسرے ہزار سے شروع کرتے ہیں ۱۰۰۰ء میں سلطان محمود غزنوی نے ہند کا مشہور قلعہ "ہنڈ" فتح کیا اور لاہور کے ہندو راجہ کے نومسلم نواسے کو اس کا حاکم بنایا جس طرح امیر المومنین فاروق اعظم ؓ نے

مدائن فتح کر کے سلمان فارسی رضؓ کو اس کا پہلا حاکم بنایا تھا۔

(ج) ہنڈ دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر اٹک کے قریب واقع ہے۔ اس سرزمین کے عام باشندے پشتو بولتے ہیں، پشتان یا پٹھان ہندوکش سے بحر عرب تک ہند کے شمال مغربی پہاڑوں اور میدانوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ کابل، غزنی قندھار، پشاور، کوئٹہ اس کے مشہور شہر ہیں چونکہ علمی تحقیق سے ثابت ہو چکا ہے کہ پشتو بھی کشمیری، پنجابی، سندھی کی طرح سنسکرت کی شاخ ہے۔ اس لئے ہم اس قوم کو ہندوستانی اقوام میں شمار کرتے ہیں۔ اس قوم نے دوابہ گنگ و جمن میں ایک وسیع خطہ کو اپنا وطن (روہیل کھنڈ) بنایا ہے۔

(۴) سلطان محمود غزنوی سے شروع کر کے امیر تیمور کے حملہ تک ہم ہندوستانی تاریخ کا پہلا دور مانتے ہیں اور امیر تیمور سے بہادر شاہ تک دوسرا دور، دوسرے دور میں عالمگیر کے بعد تنزل شروع ہوا۔ عموماً تنزل شروع ہونے کے بعد ہی قوموں کا فلسفہ معین ہوتا ہے، ہمارے امام الائمہ بھی اسی عہد کے امام الانقلاب ہیں۔

(الف) کسی عقلی یا مذہبی تحریک کو کسی خطہ زمین کی طرف منسوب کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کا مرکز اسی سرزمین میں ہو۔ اسی لئے ہند کے اسلامی دور میں ہم مسلمانان ہند کی کسی تحریک کو اس وقت تک ہندوستانیت سے موصوف نہیں بنا سکتے جب تک اس کا مرکز ہند میں پیدا نہ ہو چکا ہو۔

(ب) امیر المومنین عثمان رضؓ کے زمانہ میں کابل فتح ہوا اور ولید بن عبدالملک کے زمانہ میں سندھ فتح ہوا مگر اسے ہم خلافت عربیہ کا ایک حصہ مانتے ہیں یہاں ہندوستانیت کا ذکر نہیں ہو سکتا۔

(ج) سلطان محمود غزنوی نے اسلام کے لئے ہندوستانی مرکز کی بنیاد قائم کر دی۔ وہ انہلواڑہ میں اپنا مرکز حکومت منتقل کرنا چاہتے تھے۔ خلیفۃ المسلمین نے سقوط بغداد سے تقریباً عرصہ پہلے دہلی کے حکمران کو سلطانی اختیارات استعمال کرنے کی اجازت دی گویا خلافت اسلامیہ کے اندر ہندوستانی مسلمانوں کا اپنا مرکز بن گیا اس دور کے اخیر تک سلاطین دہلی اسلامی خلافت سے کم و بیش تعلق رکھتے رہے ہیں۔

۴۔ امیر تیمور کے حملہ کے بعد ہندوستانی مرکز بیرونی تعلق سے آزاد ہو گیا۔ سکندر لودھی نے غالباً پہلی مستقل حکومت بنائی۔ اس نے آگرہ بسایا۔ ہندوؤں کو فارسی پڑھا کر دفتروں کے کام میں دخیل بنایا۔ اس کے بعد شیر شاہ نے مالی انتظام ہندوؤں کے سپرد کیا جسے اکبر نے درجہ تکمیل تک پہونچایا ہے۔ ہم جلال الدین اکبر کو ہندوستان کا موسس نہیں مانتے۔

(الف)۔ اکبر مذہبی عالم نہیں تھا۔ علماء اس کے ساتھ اخیر تک مشیر رہے ان کی رہنمائی سے اگر اس نے غلطیاں کی ہیں تو "اثم علی من افتادہ" ہم تو یہ جانتے ہیں کہ اگر اکبر نہ ہوتا تو عالمگیر جیسا مسلمان بادشاہ ہندوؤں کو نصیب نہ ہوتا جس کی نظیر دنیا کے شاہی نظام میں نہیں ملتی ہم عالمگیر کی ہی برکت مانتے ہیں کہ امام ولی اللہ جیسا ہند میں پیدا ہوا۔

(ب)۔ امام ربانی شیخ احمد سرہندی اکبری دربار کی اصلاح کرتے رہے اور اس میں وہ پورے کامیاب ہوئے آخر میں جہانگیر ان کا اتباع کرنے لگا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شاہجہاں امام ربانی کے پسندیدہ طریقہ پر حکومت چلاتا رہا اسکے ہوتے ہوئے ہم جانتے ہیں کہ شاہجہاں کا دربار انسانیت عامہ کو اسلام کا مرکز نہیں بنا سکا۔

ج۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ امام ولی اللہ شاہ جہانی سلطنت سے بہترین نظام کی دعوت دیتے ہیں گویا جس کام کی ابتدا امام ربانی سے ہوئی اس کی تکمیل اللہ تعالےٰ نے امام ولی اللہ کی معرفت کرائی۔ اس طرح ہم امام ولی اللہ کو خاتم الحکماء مانتے ہیں۔

۴۔ امام ولی اللہ نے اپنے مختلف الہامات کا ذکر کیا ہے۔ ہم ان میں سے ایک حصہ کو خاص ترتیب سے لکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

الف۔ امام ولی اللہ دعویٰ کرتے ہیں کہ خدا نے ہمیں ایسی تحریک کا امام بنایا ہے جسکا عنوان ہے "فک کل نظام" (فیوض الحرمین) کیا یہ انقلاب نہیں ہے۔

ب۔ امام ولی اللہ نے دعویٰ کیا ہے کہ اگر ہماری تحریک فوراً کامیاب ہو جاتی تو امام کا خروج اور مسیح کا نزول متاخر ہو جاتا مگر وہ آہستہ آہستہ اپنا اثر دکھلائیگی (تفہیمات) کیا یہ انقلابی پروگرام اس بڑے انقلاب کا قائم مقام نہیں ہے جس کیلئے مسلمانوں کے ساتھ یہود و نصاریٰ بھی صدیوں سے انتظار کر رہے ہیں۔

ج۔ امام ولی اللہ نے دعویٰ کیا ہے کہ ہماری اولاد کے پہلے طبقہ میں علم حدیث پھیلے گا اور دوسرے طبقہ میں علم حکمت کی اشاعت ہوگی (تفہیمات) کیا امام عبدالعزیز سے حدیث کا شیوع نہیں ہوا۔ کیا مولانا رفیع الدین کی تکمیل الاذہان اور مولانا محمد اسمٰعیل شہید کی عبقات نے حکمت کا نیا اسکول نہیں قائم کر دیا۔

د۔ امام ولی اللہ نے دعویٰ کیا ہے کہ ہماری بیٹوں کی اولاد سے افراد پیدا ہوں گے جو ہمارے بیٹیوں کے بعد ہمارا کام مکہ معظمہ میں بیٹھ کر کرینگے (قول جمیل بحوالہ اتحاف النبلا) کیا الصدر الحمید مولانا محمد اسحاق اور الصدر العمید مولانا محمد یعقوب اسکا مصداق پیدا نہیں ہوئے۔

۵- امام ولی اللہ نے فیوض الحرمین میں خلافت کی دو قسمیں بتائی ہیں خلافت ظاہرہ خلافت باطنہ۔

الف۔ خلافت باطنہ میں امام ولی اللہ حکومت کا وہ درجہ شامل مانتے ہیں جو تعلیم اور دعوت کے زور سے پیدا ہوتی ہے۔ امام ولی اللہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اس قسم کی حکومت اسلام نے قرآن عظیم کی دعوت کی تنظیم سے مکہ معظمہ میں پیدا کرلی تھی، اس کا ذکر فتح الرحمٰن میں سورہ رعد کے آخر میں اور فیوض الحرمین میں موجود ہے۔

ب۔ امام ولی اللہ خلافت ظاہرہ کے لئے محاربہ ضروری قرار دیتے ہیں۔ ملک کا خراج بزور وصول کرکے مستحقین کو پہونچانا، مصارف عامہ میں خرچ کرنا اور عدالت کا نظام بزور قائم کرکے مظلومین کی حمایت کرنا اس کے اہم اجزاء ہیں وغیرہ وغیرہ۔ یہ خلافت اسلام کے مدنی دور میں پیدا ہوئی۔

ج۔ قول جمیل اور فیوض الحرمین بار بار پڑھنے سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ امام ولی اللہ اپنے خاندان میں تصوف کا سلسلہ اس لئے قائم کرتے ہیں کہ وہ خلافت باطنہ کے قیام کا وسیلہ بن جائے۔ مولانا شہید[رح] جب امیر شہید[رح] کی فوجی طاقت کا ان کے محاربین سے مقابلہ کرتے ہیں تو امیر شہید کے مبایعین کو سپاہی کا درجہ دیتے ہیں۔ یہ اسی اصطلاح پر منطبق ہوسکتا ہے۔

د۔ ہم نے یورپین انقلابی پارٹیوں کے نظام کا کافی مطالعہ کیا ہے۔ اس سے ہمارے دماغ میں سیاسی پروگرام بنانے اور سمجھنے کا ملکہ پیدا ہوگیا ہے۔ ہم اگر امام ولی اللہ کی خلافت باطنہ کے فکر کو آج کے سیاستدانوں کے سامنے ذکر کرینگے تو اسے انقلابی پارٹی کا نام دینگے جو عدم تشدد (نان وائیلنس) کی پابند ہو۔

۶۔ امام ولی اللہ نے دعویٰ کیا ہے کہ خدا نے انھیں یوسف علیہ السلام کے قدم پر چلنے کے لئے مفطور کیا ہے۔

الف۔ یعنی وہ امت محمدیہ میں وہی کام کریں گے جو یوسف علیہ السلام ملت اسرائیلیہ میں کر چکے ہیں۔

(ب) ہم جانتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام نے ایک غیر اسرائیلی بادشاہ سے اختیارات حاصل کر کے اولاد یعقوب کی حکومت کا اساس قائم کر دیا تھا۔ اسی یوسفی حکومت کی ایک برکت ہے کہ وہ بنی اسرائیل کو اپنی حکومت قائم کرنے کے لئے تیار کر گئی۔

جـ۔ ہمارا خیال ہے کہ امام ولی اللہ اپنے زمانے میں دہلی کے بادشاہوں کو کسریٰ اور قیصر کا نمونہ جانتے تھے اس لئے ان کے سارے نظام کو بدلنا اپنا نصب العین بتلاتے رہے مگر عملی پروگرام فقط داخلی انقلاب سے شروع کیا تھا وہ امراء سلطنت میں اپنا فکر پھیلا کر نظام سلطنت درست کرنا چاہتے تھے۔

د۔ نجیب آباد کا مدرسہ اسی لئے حکمت الامام ولی اللہ کی درس گاہ بن گیا تھا۔ مرہٹوں کی شورش کو وہ احمد شاہ کے ذریعے ختم کرا دیتے ہیں۔ جن حضرات نے ہماری طرح امام ولی اللہ کی تحریک کا مطالعہ نہیں کیا جب وہ دیکھتے ہیں کہ امام ولی اللہ سلطانی اختیارات میں تبدیلی کی کوئی کوشش نہیں کرتے تو انھیں امام الانقلاب ماننے میں تامل کرتے ہیں۔

۷۔ امام ولی اللہ خیر القرون کو شہادت عثمان تک جو بعثت سے ۴۸ سال بعد واقع ہوئی محدود کر دیتے ہیں (ازالۃ الخفاء)

الف۔ اسی زمانہ کو وہ ھو الذی ارسل رسولہ بالھدیٰ ودین

الحق لیظھرہ علی الدین کلہ کا مصداق قرار دیتے ہیں۔ ازالۃ الخفاء کے ابتدائی مباحث میں اسی آیت کی تفسیر پورے غور سے پڑھنی چاہیئے۔ امام ولی اللہ کی حکمت کا یہ مرکزی مسئلہ ہے۔

ب۔ امام ولی اللہ اس دور کے علمی و عملی کارنامے مسلمانوں کے مشورہ اور اتفاق سے جاری مانتے ہیں۔ (یہ فکر شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی کتابوں میں بھی ملتا ہے) اسی زمانہ کو وہ نزول قرآن کے مقاصد کا نمونہ مانتے ہیں۔

ج۔ امام ولی اللہ حجۃ اللہ البالغہ میں اس دور کو انسان کی نیچرل ترقی کا آخری درجہ ثابت کرتے ہیں۔ باب الحاجۃ الی دین ینسخ الادیان غور سے پڑھنا چاہیئے۔

د۔ ہمارا خیال ہے کہ اس دور کی علمی اور عملی تاریخ جس قدر امام ولی اللہ نے ضبط کر دی ہے وہ ہمیں کسی مصنف کی کتاب میں نہیں ملتی اسلئے ہم ولی اللہ کی کتابیں بیت الحکمۃ میں پڑھانا چاہتے ہیں۔

ھ۔ ہم سمجھتے ہیں کہ امام ولی اللہ قرآن عظیم کی اس علمی اور عملی تعلیم کو انسانیت عامہ کے لیۓ انٹرنیشنل انقلابی پروگرام مانتے ہیں اس لئے ہم اس دور میں انھیں اپنا امام مانتے ہیں۔

و۔ اگر کیپٹل کے مصنفین کو انقلاب کا باپ مانا جاتا ہے تو جس حکیم نے خیر القرون کی انقلابی تاریخ کو ہند کی علمی زبان میں عام عقلی اصول کے مطابق بنا کر ضبط کر دیا ہے اسے امام الانقلاب ماننا محض خوش اعتقادی پر مبنی نہیں سمجھا جائیگا جب کہ اس نے یوسف علیہ السلام کی طرح انقلاب کا راستہ بھی صاف کر دیا ہو۔

"خطبہ محمودیہ"

۸۔ امام ولی اللہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہند کے مسلمانوں سے اپنی حکومت قائم کرنے کی طاقت اس وقت افاغنہ کی طرف منتقل ہو چکی ہے (خیر کثیر) ہم جانتے ہیں کہ افاغنہ بھی ہندوستانی اقوام میں سے ایک قوم ہے جس میں ایرانی، ترکی، اسرائیلی، عربی قبائل مخلوط ہو چکے ہیں۔

الف۔ ہمارا خیال ہے کہ اسی غرض سے امام عبدالعزیز اپنی انقلابی پارٹی کو افغانوں سے ملانا ضروری سمجھتے ہیں۔ امام عبدالعزیز کے آخری کاموں کا مرکز الامیر الشہید اور مولانا عبدالحی اور مولانا محمد اسمٰعیل کا اجتماع تھا۔ ان کے لئے افغانستان کی ہجرت کا فیصلہ امام عبدالعزیز نے کیا تھا اگرچہ عمل ان کی وفات کے بعد شروع ہوا۔

ب۔ ہمیں معلوم ہے کہ مولانا محمد قاسم کو رسول اللہ صلعم سے روحانی طور پر معلوم ہوا تھا کہ افغانوں کی طرف توجہ کرنی چاہیئے۔

ج۔ مدرسہ دیوبند اور اس کے متخرجین میں مولانا شیخ الہند کا مقام مخفی نہیں وہ تخمیناً چالیس برس مدرسہ چلاتے رہے ہیں۔ ہم دعوے سے کہہ سکتے ہیں کہ دیوبند سے جس قدر طالب علم یو پی میں پیدا کئے۔ اس کے بعد اس نے اپنے طالب علم سب سے زیادہ افغانستان اور اسکے دونوں طرف یاغستان اور ترکستان میں پھیلائے ہیں۔

د۔ مولانا شیخ الہند کی خاص تربیت کا نتیجہ تھا کہ ہم کابل میں سات سال حکومت کا اعتماد حاصل کر کے رہ سکے۔ ہمارا خیال ہے کہ جمعیۃ الانصار اور نظارت المعارف میں اگر کام نہ کر چکے ہوتے تو ہمارا کابل جانا محض بے کار ہوتا۔ عجب معاملہ ہے حضرت شیخ الہند کے حکم سے ہمیں بغیر پروگرام کے کابل جانا پڑتا ہے۔ پھر حکومت افغانی کے توسط سے ہمیں ہدایات مل جاتی ہیں۔ ہم باہر جا کر سمجھ سکے ہیں کہ امام عبدالعزیز سے

مولانا شیخ الہند تک۔ ہمارے تمام اکابر ایک سلسلہ میں کام کرتے رہے ہیں۔

سراج الہند امام عبدالعزیز دہلوی

امام عبدالعزیز بستان المحدثین میں موطا کا تذکرہ لکھتے ہوئے فرماتے ہیں حضرت شیخنا وقدوتنا فی کل العلوم والامور شیخ ولی اللہ قدس سرہٗ۔ گویا وہ اپنے تمام علمی اجتماعی سیاسی امور میں اپنے والد ماجد کے مقتدی ہیں۔

ا۔ جو انقلاب، امام ولی اللہ اپنے زمانہ میں خواص سے مکمل کرانا چاہتے تھے۔ وہ اگر نہیں ہو سکا تو اسی مقصد کو امام عبدالعزیز اپنے حالات زمانہ کے مطابق عوام سے پورا کرنا چاہتے ہیں۔ نصب العین میں کوئی فرق نہیں آیا۔

۲۔ امام ولی اللہ کے شروع زمانہ میں یہ خیال صحیح تھا کہ دہلی کی سلطانی حکومت کو تسلیم کرکے امراء کے ذریعہ سے خیر القرون کے نمونہ کا پروگرام جاری کیا جائے۔ مگر امام عبدالعزیز کے زمانہ میں سلطانی حکومت اتنی کمزور ہو چکی تھی کہ داخلی خارجی سارے نظام بدلنے کے سوا کام نہیں چل سکتا تھا۔ اس لئے انہوں نے ہند کے دار الحرب ہونے کا فتویٰ دیا۔

الف۔ اس کامل انقلاب کے لئے عوام مسلمانوں کو تیار کرنا امام عبدالعزیز کا خاص کارنامہ ہے۔ انہوں نے عوام کو سیدھا مخاطب کرنا شروع کیا۔ ہندوستانی زبان میں علوم دینی کا ترجمہ امام عبدالعزیز کے اصحاب کا کام ہے۔

ب۔ امام ولی اللہ نے جس قدر تصانیف لکھی تھیں وہ فقط اعلیٰ طبقہ کے کام آتی ہیں۔ ان کے مخاطب یا امراء ہیں یا اعلیٰ درجہ کے اہل علم یا کامل المعرفت صوفیائے کرام۔ مگر امام عبدالعزیز کشف وعقل کی عام فہم چیزیں نقلی علوم کی تفسیر میں استعمال کرتے ہیں

گویا اپنے والد کے علوم کو عوام کی زبان میں لکھتے ہیں۔ تفسیر فتح العزیز کو فتح الرحمٰن سے اور تحفۂ اثنا عشریہ کو ازالۃ الخفاء سے ملا کر پڑھئے۔

ج۔ ہمارا خیال ہے کہ الصدر الشہید مولانا محمد اسمٰعیل الصدر الحمید مولانا محمد اسحاق الصدر العمید مولانا محمد یعقوب بلکہ امام اہل العقل مولانا رفیع الدین اور امام اہل النقل مولانا عبد القادر سے اگر کوئی اجتماعی کام بن پڑا ہے تو اسے امام عبد العزیز کے نامہ اعمال میں لکھنا چاہیئے۔

د۔ الامیر الشہید کے مبایعین سب کے سب ان سے بیعت کرتے ہیں تو امام عبد العزیز کے طریقہ میں بیعت کرتے ہیں۔

ہمارا خیال ہے کہ امام عبد العزیز کیلئے یہی ایک کمال کفایت کرتا ہے کہ انکی تربیت سے ہندوستانی مسلمانوں میں سے عوام بھی اپنی سلطنت سنبھالنے کے قابل ہو گئے۔

الصدر الشہید مولانا محمد اسمٰعیل الدہلوی روح الانقلاب

مولانا شہید فرماتے تھے کہ میرا اس سے زیادہ کوئی کمال نہیں کہ میں اپنے دادا کی بات سمجھ کر اسے اپنے موقعہ پر بٹھا دیتا ہوں۔

ا۔ الف:۔ عبقات کے پہلے اشارہ میں شیخ اکبر اور امام ربانی کے مسالک وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کا فرق واضح کر کے ہر ایک فکر کے فوائد ضبط کرنیکے بعد امام ولی اللہ کو دونوں بزرگوں سے بلند ثابت کیا ہے۔

ب۔ صراط مستقیم میں الامیر الشہید کے مکشوفات اور ملفوظات لکھتے ہیں۔ مگر امام ولی اللہ کی اصطلاحات سے تطبیق دینے کے بعد گویا وہ ہر ایک امام کو امام ولی اللہ

کی میزان پر تولنے کے بعد قبول کرتے ہیں۔

۲. الف:۔ امام ولی اللہ نے خیر القرون کے علوم تحریر کئے ہیں اور خواص کو پڑھایا اس کے بعد امام عبد العزیز نے خواص کو تعلیم دیکر انھیں عوام کی تعلیم کا واسطہ بنایا۔ الصدر الشہید نے ہند کی مرکزی سوسائٹی (دہلی) کو ان علوم سے رنگین بنایا۔

ب۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر الصدر الشہید کے ساتھیوں کی خدمات مقبول نہ ہوتیں تو امام ولی اللہ کے علوم پر دو سو برس بعد بحث کرنا ناممکن ہو جاتا اسی انقلابی روح نے ان علوم کو زندہ کر دیا ہے۔

۳۔ ہمارا خیال ہے کہ الصدر الشہید کو اگر خلافت کبریٰ سونپی جاتی تو اسے فاروق اعظم کی طرح چلاتے امیر شہید نے انھیں خدمت خلق پر اپنے اسوۂ حسنہ سے لگایا تو وہ گھوڑوں کے لئے گھاس کھودتے تھے۔

۴۔ ان کی کتاب تقویۃ الایمان میرے ابتداءً الاسلام کا واسطہ بنی ہے اسلئے وہ میرے مرشد اور امام ہیں۔

امام محمد اسحاق الدہلوی الصدر الحمید نائب الامیر الشہید

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی فرماتے ہیں مولانا محمد اسحاق دہلوی مہاجر رحمتہ اللہ علیہ کہ تمام ہندوستان کے علماء محدثین کے استاذ و استاذ زادہ نواسہ و شاگرد و خلیفہ مولانا شاہ عبد العزیز قدس سرہ کے ہیں۔ (فتاویٰ رشیدیہ)

۱۔ الف:۔ ایک انقلابی تحریک میں پہلا درجہ ہے سوسائٹی میں انقلاب کے لئے عقلی نظام (فلسفہ) سوچنا، اس درجہ کو ہم امام ولی اللہ میں منحصر مانتے ہیں۔

ب۔ اس کے بعد دوسرا درجہ اس کے پروپیگنڈے کا ہے۔ پروپیگنڈے کی کامیابی پر پارٹی کا نظام بنتا ہے جو اپنے ممبروں پر حکومت پیدا کرتا ہے (یعنی خلافت باطنہ) اس درجہ کو ہم امام عبدالعزیز کا کمال مانتے ہیں۔

ج۔ اس کے بعد تیسرا درجہ دوسری پارٹیوں سے مقابلہ کرکے ان کے مقبوضات فتح کرنا ہے۔ اس سے انقلابی حکومت (خلافت ظاہرہ) پیدا ہوتی ہے۔ ہم امام ولی اللہ کی تحریک میں یہ درجہ امیر شہید اور انکے رفقا میں محدود کر دیتے ہیں۔

۲۔ پارٹی کا نظام مستقل ہوتا ہے حکومت کبھی بنتی ہے کبھی ٹوٹتی ہے۔ پارٹی کا وجود اس وقت تک سالم مانا جاتا ہے جب تک اس کی اساسی مصلحت قائم کرنے والی جماعت فنا نہیں ہوتی۔

الف۔ اس فرق کو واضح کرنے کے لئے ہم نے امیر اور امام کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ ہم امام عبدالعزیز کے بعد پارٹی کے نظام کا محافظ امام محمد اسحاق کو مانتے ہیں۔ اور حکومت میں امیر المومنین السید احمد الشہید ہیں۔ اس معاملہ میں امام محمد اسحاق ان کے ایک نائب ہیں۔

ب۔ یورپ کی سیاسی پارٹیوں میں نظام کا محافظ ایک بورڈ ہوتا ہے اسے ڈسپلن یا انضباط کا نام دیا جاتا ہے۔ اس بورڈ کا حکم پارٹی کے سب ممبروں پر نافذ ہوتا ہے اور حکومت چلانا وزرار کا کام ہے۔ اسی انداز پر ہم نے بالاکوٹ میں حکومت کا خاتمہ ایک حد تک مان لیا ہے مگر ہم پارٹی کے نظام کو دہلی میں محفوظ مانتے ہیں۔

ج۔ امام محمد اسحاق نے مکہ معظمہ ہجرت کر لی۔ بظاہر وہ اپنے کام سے معطل ہو گئے مگر ایسا نہیں سمجھنا چاہیئے اگر وہ مکہ معظمہ میں ہندوستانی کام جاری نہ رکھتے تو کبھی

بہادران کی جاگیر کیوں ضبط کرتی اور بمبئی سے ایسے ہندوستانی کیوں بھیجے جاتے. جو انھیں وہابی ثابت کرکے حجاز سے نکلوانا چاہتے تھے مگر قدرتی اتفاقات، سے وہ بچ گئے. اس زمانہ کا شیخ الحرم ایک ہندوستانی مہاجر کا بیٹا تھا اور یہ خاندان شاہ عبدالعزیز کا شاگرد اور مرید ہے. اس لئے شیخ الحرم کے توسط سے ترکی حکومت نے اپنے گھر میں ایک طرح نظر بند کر دیا. وہ مسجد حرام میں نماز پڑھتے تھے مگر کسی کو پڑھا نہیں سکتے تھے. اس قسم کی زندگی ہم کابل میں گزار چکے ہیں. اس لئے ہم مکہ معظمہ میں ان کے ملنے والوں سے بہت کچھ سمجھ سکتے ہیں۔

۴ الامیر امداد اللہ جو دیوبندی جماعت کے امام ہیں۔ امام محمد اسحاق کے خواص اصحاب میں سے تھے اس سے پارٹی کے نظام کا تسلسل ہم مولانا شیخ الہندؒ تک ثابت کر سکتے ہیں۔

الصدر العمید مولانا محمد یعقوب الدہلوی

وہ اپنے بڑے بھائی کے ساتھ ان کے معاون بن کر کام کرتے رہے ہیں۔ امام محمد اسحاق کی وفات پر وہی امام عبدالعزیز کی امانت کے محافظ رہے ہیں۔

ا۔ مولانا مظفر حسین ان کے خلیفہ تھے، جو مولانا محمد قاسم اور سر سید دونوں کے تسلیم شدہ بزرگ ہیں۔

الف۔ نواب صدیق حسن خاں نے روایت حدیث کی اجازت مولانا محمد یعقوب سے حاصل کی ہے۔

ب۔ الامیر امداد اللہ نے مولانا محمد قاسم کو صلوٰۃ احسانی کا طریقہ مولانا....

محمد یعقوب سے تلقین کرایا۔

۲۔ ان کی وفات سے پہلے مدرسہ دیو بند کے بانی ان کی امانت سنبھالنے کے لئے تیار ہو چکے تھے۔ یاد رہے کہ مولانا مظفر حسین نے ہی مولانا محمد قاسم کو منبر وعظ پر بٹھلایا تھا۔

امام ولی اللہ کی تحریک کا مستقل مرکز ان کے اتباع کے ہاتھ میں رہا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک محدود وقت تک ان کی اولاد بھی مرکزیت کی مالک رہی ہے لیکن ان سے اول و آخر اتباع ہی برسر کار رہے ہیں۔ امام ولی اللہ کی زندگی میں ان کے سب سے بڑے معاون مولانا محمد امین کشمیری اور مولانا محمد عاشق پھلتی تھے۔ ان کی اولاد میں امام عبدالعزیز سب سے بڑے ہیں اور سب کے استاذ امام ولی اللہ کی وفات کے وقت وہ بھی اپنی طالب علمی پوری نہیں کر سکے تھے۔ امام عبدالعزیز نے امام ولی اللہ کے انھیں خلفاء سے اپنی علمی تکمیل کر لی تھی۔

امام عبدالعزیز کے بعد تحریک کا مرکز اگرچہ پھر اتباع میں منتقل ہو گیا مگر اولاد کا دوسرا طبقہ بھی حصہ دار رہا ہے۔ اس طبقہ کے بعد تحریک کی مرکزیت اتباع کے مختلف احزاب میں تقسیم ہو گئی ہے۔

الامیر الشہید السید احمد قدس سرہٗ

امام عبدالعزیز کے بعد اتباع کا جو طبقہ تحریک کے مرکز کا مالک بنا ہے۔ ان کے امام امیر شہید ہیں۔ ان کی قوت کشفیہ نے عوام میں انقلابی لہر پیدا کر دی۔ امام عبدالعزیز کے تیار کردہ علماء کو اور عوام کو ایک پروگرام کا پابند بنانا امیر شہید کا کمال ہے۔ خدمت خلق اور اتباع سنت کے فطری اوصاف نے امامت اور

امارت کے اعلیٰ رتبہ پر پہونچا دیا تھا۔

۱۔ امیر شہید کے ذاتی اوصاف اور کمالات میں ہم انھیں معصوم مان سکتے ہیں ہماری تفتیش میں کئی صدیوں سے ان کی نظیر نظر نہیں آتی۔

الف۔ ہم امام ولی اللہ کے علوم میں نقل عقل کشف کے تطابق کو مابہ الامتیاز مانتے ہیں۔ ان سے متقدم شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے علوم میں عقل اور نقل کا تطابق پایا جاتا ہے۔ کشف سے وہ تعرض نہیں کرتے۔

ب۔ امام ولی اللہ کے بعد اس درجہ کا کامل ہم فقط امام عبدالعزیز کو مانتے ہیں امام عبدالعزیز کے بعد ان کی مثل ہمیں کوئی نظر نہیں آتا جس میں تینوں کمالات جمع ہو گئے ہوں۔

ج۔ امام عبدالعزیز کے شاگردوں کے پہلے طبقہ میں امام رفیع الدین عقل و نقل کے جامع ہیں اور امام عبدالقادر کشف و نقل کے جامع، دوسرے طبقہ میں امام مولانا محمد اسمٰعیل شہید عقل و نقل کے اول درجہ پر جامع ہیں اور مولانا عبدالحی عقل و نقل کے دوسرے درجہ پر۔

د۔ مولانا عبدالحی اور مولانا محمد اسمٰعیل کے قران السعدین کے ساتھ اگر کوئی کشف کا امام بھی مل سکے تو امام ولی اللہ کے واحدالی وجود کی دوسری مثال امام عبدالعزیز کے بعد اس اجتماع میں مل سکے گی۔

۲۔ ہمارا یقین ہے کہ امیر شہید اس قدر سلیم الفطرت تھے کہ ان کی قوت کشفیہ ہمیشہ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے موافق رہی ہے۔ انھیں خلاف سنت کبھی الہام نہیں دیا گیا۔ انھوں نے کافیہ تک کتابیں پڑھ لی تھیں۔ پھر قرآن عظیم کا ترجمہ اور

صحاح کا درس شاہ عبدالقادر سے سنتے رہے اس طرح وہ کشف اور نقل کے جامع بن گئے۔

الف۔ جادۂ قویمہ کی حکومت ہند میں پیدا کرنے کا عزم امیر شہید میں فطری تھا اور خدمت خلق ان کا اخلاقی شعار ہے جادۂ قویمہ حجۃ اللہ البالغہ اور مسوّیٰ پر عمل کرنے کا نام ہے۔

ب۔ امام عبدالعزیز نے الامیر الشہید کے ساتھ الصدر السعید اور الصدر الشہید ان تینوں بزرگوں کے مجموعہ کو اپنا قائم مقام بنا کر اپنے متبعین سے ان کا تعارف کرایا ہے جس سے وہ انقلابی سوسائٹی کا مرکز بن گئے۔ یاد رہے کہ اسی سوسائٹی کے ایک رکن الصدر الحمید کو اپنے ساتھ رکھا جو انقلاب کی مرکزی روح کی محافظت کریگا۔

ج۔ یوسف زئی کے علاقہ میں پہونچکر جب امیر شہید امیر المومنین مانے گئے اور ہند میں امام ولی اللہ کے اتباع نے اس امارت کو تسلیم کر لیا تو وہ حکومت کے مالک ہو گئے۔

۳۔ حکومت کی مصلحت میں ہماری تحقیق حزب کی آمریت (پارٹی کی ڈکٹیٹر شپ) تو مان سکتی ہے مگر کسی فرد کی ڈکٹیٹر بننے کو ہم قبول نہیں کر سکتے۔ اسے ہم شاد رہم فی الامم کے خلاف سمجھتے ہیں۔ اس کی تشریح ابو بکر رازی کے احکام القرآن میں ملے گی حجۃ اللہ البالغہ کے بعد اگر کسی کتاب نے ہماری سیاسی بصیرت بڑھائی ہے تو وہ یہی کتاب ہے۔

الف۔ ہم اس حکومت کو حکومت موقتہ کہتے ہیں۔ ہمارا مطلب یہ ہے کہ لاہور فتح کر کے یہ حکومت دہلی پہونچتی ہے تو مستقل حکومت کا فیصلہ اس وقت ہوگا یا تو شاہ دہلی اس انقلابی حکومت کے رئیس کو وزیر اعظم مان لیتا اور انکی پارٹی پارلیمنٹ (مجلس شوریٰ) بن جاتی دوسری صورت میں یعنی اگر شاہ دہلی اس حکومت کو تسلیم نہ

کرتا تو اسے معزول کرکے اس حکومت کا رئیس ملک کا حاکم ہوتا اور اس کی پارٹی اپنا قانون نافذ کرتی۔

ب۔ کیا امام عبدالعزیز کا خلیفہ دہلی کو بھول سکتا ہے جسکو وہ حرمین اور فارس اور نجف کے بعد ساری دنیا سے افضل مانتے ہیں۔

ج۔ مقامات طریقت جس سے سوانح احمدیہ کا مصنف بھی نقل کرتا ہے۔ ہم نے مکہ معظمہ میں دیکھی ہے اس میں ایک واقعہ مذکور ہے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے وکیل نے امیر شہید سے پوچھا کہ اگر مہاراجہ اسلام قبول کرلے تو آپ کی حکومت ہمارے ساتھ کیا معاملہ کرے گی۔ امیر شہید نے جواب دیا کہ مہاراجہ بادشاہ ہوں گے اور میں اپنی بیٹی ان سے بیاہ دوں گا۔ محض دینی معاملات میں اس وقت تک اس کا نائب رہوں گا جب تک وہ شریعت کا حکم چلانا سیکھ لیں (او کما قال) یہ وہ اساس ہے جس پر ہم امیر شہید کی حکومت کو حکومت موقتہ کہنا جائز سمجھتے ہیں۔

د۔ مقامات طریقت میں مذکور ہے کہ امیر شہید کے اصحاب میں سے ایک مجاہد عالم جو پہلے بھی حاکم لاہور سے مل چکا تھا بالاکوٹ کے معرکہ میں گرفتار ہو کر لاہور آیا حاکم نے اس مجاہد سے پوچھا اب خلیفہ کہاں ہے اس عالم نے جواب دیا میں خلیفہ ہوں۔ ہم امام ولی اللہ کی تحریک کو مساوات اور جمہوریت کا نمونہ مانتے ہیں اس لئے ہم مسلم اور غیر مسلم سے اس کا تعارف کراتے ہیں۔

ھ۔ ہم یقین رکھتے ہیں کہ اس وقت کی حکومتیں امیر شہید کی تحریک کو ناکام بنانے میں حصہ لیتی رہی ہیں۔

الف۔ یہ حکومتیں حکومت لاہور سے ساز باز کرکے امیر شہید اور حکومت لاہور

کو مصالحت کا موقعہ نہیں دیتی تھیں۔

ب۔ جن مسلمانوں کو امام ولی اللہ کی تحریک سے مذہبی مخاصمت ہے جیسے شیعہ اور جہال اہل سنت، ان کے توسط سے امیر شہید کی جماعت میں انتشار پیدا کرائی ہے۔ اس کی بعض مثالیں ہمیں مولانا حمید الدین مرحوم نے بتلائیں۔

جہ۔ جب سوانح احمدیہ کے مصنف جیسا فدائی کسی اثر سے امیر شہید کی پوزیشن بیان کرتے ہیں اور ان کے مقصد کی تعیین میں صریح غلط بیانی اختیار کر سکتا ہے تو بعض عرب رہنماؤں کے ذریعے ایسا پروپیگنڈہ کیوں ناممکن سمجھا جاتا ہے جس کے اثر سے تحریک اپنے اصلی مرکز سے منقطع ہو جائے اور جمہور کارندے قبل از وقت بلند پردازی کو اپنا مقصد قرار دیں کیا اس طرح دوستی کے لباس میں اسے ناکام نہیں بنایا جاتا۔

د۔ امیر شہید کی تحریک کو جاہل افاغنہ کے رہنماؤں سے جس قسم کا نقصان پہنچا ہے اس کے مطالعہ کے لئے سید جمال الدین افغانی کی تاریخ افاغنہ (عربی) اور امیر حبیب اللہ خاں کی لکھوائی ہوئی تاریخ افغانستان فارسی کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔

۵۔ الف۔ آخر میں ہم دوبارہ امیر شہید کے متعلق اپنا عقیدہ صاف صاف بیان کرتے ہیں ہم امیر شہید کو ایک معصوم امام مان سکتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ مولانا شہید انھیں اسی طرح منوانا چاہتے ہیں۔

ب۔ مگر جس وقت ہم انھیں امارت کی ذمہ داری سپرد کرتے ہیں تو اجتماعی غلطیوں کی مسئولیت سے انھیں مبرا ثابت نہیں کریں گے ورنہ اس نادر مثال سے تحریک کی آئندہ ترقی میں استفادہ ناممکن ہو جائے گا۔

الامیر ولایت علی صادقپوری کی جماعت صادقہ

جب کوئی امیر میدانِ جنگ میں شہید ہو جائے تو بقیۃ السیف مجاہدین کے لئے ضروری ہے کہ اپنا امیر انتخاب کریں۔ معرکہ بالاکوٹ کے بعد اس قسم کی امارت مولانا ولایت علی کے خاندان میں منحصر ہو گئی۔

۱۔ ہم اس امارت کو ایک مستقل پارٹی مانتے ہیں، جو امام ولی اللہ کی تحریک میں پہلی امارت کی راکھ سے پیدا ہوئی۔ اس پارٹی کی عظمت کا ہم اعتراف کرتے ہیں۔ مگر نہ تو ہم کبھی اس پارٹی کے ممبر بنے اور نہ اسکی دعوت دینا کبھی ہمارا مقصد رہا ہے۔

۲۔ الف۔ ہم اس پارٹی کے مجاہدین کے ساتھ ان کے مختلف مرکزوں میں کافی زمانہ تک ملتے رہے ہیں۔ اس پارٹی کے بہت سے راز ہمیں معلوم ہیں مگر وہ ایک امانت ہے ہم اسے افشا نہیں کر سکتے لیکن اس قدر تصریح میں عیب نہیں کہ ہماری ذہنیت اس اجتماع کا جزو بن کر مطمئن نہیں رہ سکتی۔

ب۔ ہمارے دیوبندی رفقاء کو یاغستان میں اور ہمیں وکیل مجاہدین سمرقند کے ساتھ کابل میں ساتھ مل کر کام کرنے کا تجربہ ہے۔ ہم لوگ ایک دوسرے کے تعاون و تناصر سے کبھی دست کش نہیں ہوئے۔ لیکن ایک پارٹی کے ممبر سمجھ کر ہمیں کسی نے قبول نہیں کیا۔ نہ حکومت کابل نے، نہ کسی بیرونی سیاسی جماعت نے، یہ وہ اساس ہے جس پر ہم دونوں پارٹیوں کا علیحدہ علیحدہ تعارف کرانا ضروری سمجھتے ہیں ورنہ ہم اپنا کام آگے نہیں بڑھا سکتے۔

۳۔ الف:۔ نواب صدیق حسن خاں نے جس اربعین کا ذکر کیا ہے وہ ہم نے

دیکھی ہے وہ خرافات کا مجموعہ ہے۔ اس میں اس قسم کے الفاظ بھی مرفوعاً موجود ہیں کہ امام مہدی ہند کے شمال مغربی کوہستان سے نکلے گا۔ وہ پنجاب کے کسی غیر معروف مطبع میں چھپی ہے اور خاص لوگوں میں تقسیم ہوتی ہے ہمیں معلوم ہے کہ اس وقت کے امیروں نے اس کی اشاعت ممنوع قرار دے رکھی ہے۔

ب۔ غالباً مولانا ولایت علی صاحب نے اپنے رسائل تسعہ میں امیر شہید کو مہدی متوسط قرار دیکر انکی غیبت کا ذکر کیا ہے۔

ج۔ امیر ولایت علی کے رفیق مولانا عبدالحق کا ترجمہ سلسلۃ العسجد میں دیکھنا چاہیئے۔ کیا نواب صاحب ان کی زیدیت یا تشیع سے ناواقف ہیں۔ ہم نے ایک رسالہ دیکھا ہے جو شاہی زمانے کی دہلی میں چھپا ہے۔ اس میں مولانا محمد اسحاق اور سید محمد علی رامپوری کے بعض بیانات بھی موجود ہیں۔ اس میں لکھا ہے کہ امیر شہید نے مولانا عبدالحق کو اپنی جماعت سے خارج کر دیا تھا۔ وہ رسالہ مکہ معظمہ میں مولانا احمد سعید کے خاندانی کتب خانہ میں موجود ہے اس پر مولانا عبدالغنی کی مہر ہے۔

د۔ جب سے اس پارٹی میں امام عبدالعزیز کے طریقے سے انکار کا غلو پھیلا ہے، عوام میں ایک طبقہ ائمہ فقہا پر سب وشتم کرنے والا بھی پیدا ہو گیا ہے انہی لوگوں کو چھوٹا رافضی کہا جاتا تھا۔ حاشا وکلا اس پارٹی کے کسی محترم رکن کو اس قسم کا الزام نہیں دیا جا سکتا۔ ہم نے سرحدی مراکز میں امیروں کو حنفی طریقہ پر نماز پڑھتے دیکھا ہے ہم سے کہا گیا کہ یہ اسی خاندان کا متوارث طریقہ ہے۔

الامیر امداد اللہ کی دہلوی جماعت

مولانا اسحاق کو ہم ان کے جدامجد کی تحریک کا ایسا

امام مانتے ہیں جن کے متعلق الہامی پیشین گوئی اس خاندان میں متوارث ہے یعنی ہم امام محمد اسحاق کو اس تحریک کی علمی اور سیاسی مصلحت کا محافظ مانتے ہیں اور منت کو کا ایک نائب امیر اسلئے امیر کی شہادت کے بعد وہ ایک امیر بن جائے گا۔

سیاسیات میں اگر کسی جماعت کا امام محمد اسحاق سے تعلق ثابت ہو جائے تو ہم اسے امام ولی اللہ کی تحریک میں ایک مستقل پارٹی تسلیم کرانا چاہتے ہیں۔ ہمیں اس سے بحث نہیں کہ اس تفریق کا باعث ہم بنتے ہیں یا ہمارے مقابل، یہ بحث دوسرے درجہ کی مانتے ہیں۔

ا۔ الف:۔ الامیر امداد اللہ کا تعلق امام محمد اسحاق سے اولاً و آخراً ثابت ہے۔ شروع میں امیر امداد اللہ مولانا محمد اسحاق کے مدرسہ میں طالب علمی کرتے رہے۔ اسی زمانہ میں مولانا محمد اسحاق کے داماد اور خلیفہ مولانا نصیر الدین سے کسب طریقہ کیا۔ یہ وہی مولانا نصیر الدین ہیں جنھیں مجاہدین نے بالاکوٹ میں پہلا امیر بنایا تھا۔ انکی جگہ پر آگے چلکر مولانا ولایت علی کا خاندان آیا ہے۔

ب۔ امام محمد اسحاق جس سال وفات پاتے ہیں۔ اسی سال امیر امداد اللہ حج کے لئے گئے۔ امام محمد اسحاق نے اپنے طریقہ کی خاص ہدایتیں دیکر انھیں ہند واپس بھیجا۔ یہ بھی روایت ہے کہ انھیں یہ پیشین گوئی بھی سنائی کہ ایسا وقت آئے گا جب تم مکہ معظمہ میں بیٹھکر کام کروگے۔

ج۔ امیر امداد اللہ شیخ نور محمد جھنجھانوی کے خلیفہ ہیں۔ اور وہ شاہ عبدالرحیم افغانی کے، یہ دونوں حضرت امیر شہید کے نامور خلفاء میں سے ہیں۔ شاہ عبدالرحیم تو بالاکوٹ میں شہید ہوئے ہیں۔

د۔ الامیر امداد اللہ کے رفقاء میں حکیم ضیاء الدین رامپوری[1] ہیں جو مولانا شہید کے خواص اصحاب میں تھے ان کا ذکر سوانح احمدیہ میں موجود ہے۔

۲۔ مولانا مملوک علی دہلی کالج کے مدرس تھے۔ دیوبندی تحریک کے اکثر اساتذہ مولانا مملوک علی کے شاگرد ہیں۔ جس سال مولانا محمد اسحاق مکہ معظمہ پہونچے اسی سال وہ حج کو گئے مولانا محمد یعقوب نے سوانح مولانا محمد قاسم میں کسی خاص مقصد کو ملحوظ رکھ کر اس کا اجمالی ذکر کر دیا ہے۔

الف۔ مولانا محمد اسحاق اور مولانا محمد یعقوب کی جاگیر سے جو روپیہ حاصل ہوتا تھا اس کا انتظام ایک جماعت کے ہاتھ میں رہا ہے۔ اس میں مولانا مملوک علی اور مولانا مظفر حسین خاص حیثیت رکھتے تھے۔

ب۔ مکہ معظمہ سے واپس آکر الامیر امداد اللہ بھی اسی سوسائٹی میں شامل ہو گئے۔

ج۔ یہ سوسائٹی مولانا ولایت علی کی جماعت سے علیحدہ مانی جاتی تھی چنانچہ یہ روایت بھی موجود ہے کہ جب مولانا ولایت علی سرحد کو گئے تو مومن خاں نے مولانا امداد اللہ سے دریافت کیا کہ آپ کی نظر (کشفی) میں انھیں کامیابی ہوتی نظر آتی ہے مولانا امداد اللہ نے نفی میں جواب دیا اس پر مومن خاں خفا ہو گئے۔ مولانا امداد اللہ نے معذرت کی کہ اگر آپ نہ پوچھتے تو ہم کچھ نہ کہتے۔

د۔ ان لوگوں کے متبعین کو ہم امام محمد اسحاق کی دہلوی پارٹی کہتے ہیں جس کے رہنما الامیر امداد اللہ تھے۔

---

[1] رامپور منہیاران۔

مولانا شیخ الہندؒ کی دیوبندی جماعت یا مولانا محمد قاسم کے اتباع

سقوط دہلی کے بعد اس دہلوی پارٹی کے افراد منتشر ہوگئے یہاں تک کہ الامیر امداد اللہ مکہ معظمہ پہونچے اور مولانا محمد قاسم بھی نام بدل کر حج کے لئے نکلے مولانا محمد یعقوب کے مکتوبات میں اس سفر کا پورا تذکرہ موجود ہے۔

۱۔ امیر امداد اللہ نے مکہ معظمہ میں فیصلہ کیا کہ امام عبدالعزیز کے مدرسہ کی طرح دہلی سے باہر مدرسہ بنایا جائے اور امام محمد اسحاق کے طریقے پر نئی جماعت تیار کیجائے۔

الف۔ مولانا محمد قاسم نے چند سال محنت کر کے دیوبند میں مدرسہ بنایا۔

ب۔ ہم جہاں تک سمجھ سکے ہیں اس جماعت کے اولین موسس امیر امداد اللہ اور ان کے دو رفیق مولانا محمد قاسم اور مولانا رشید احمد ہیں۔ امیر امداد اللہ کے سوا اس جماع کے ربط کو زیادہ مضبوط کرنے والے مولانا مملوک علی اور مولانا عبدالغنی بھی ہیں۔

ج۔ اس جماعت کے امتیازی اوصاف میں ہم وحدۃ الوجود، حنفی فقہ کا التزام، نیز کی خلافت سے اتصال، تین اصول معین کر سکتے ہیں جو اس جماعت کو امیر ولایت علی کی جماعت سے جدا کر دیتے ہیں۔

۲۔ مدرسہ دیوبند کی سالانہ روئداد مسلسل ملتی ہے۔ مولانا محمود حسن کی طالب علمی اور پھر مدرسی پھر صدارت اور اپنے مشائخ ثلثہ کی خلافت، پھر شیخ الہند بننے کے واقعات مشہور و معروف ہیں۔

دیوبند کے ایک نو مسلم طالب علم کا مولانا شیخ الہند سے تعلق

ا۔ میں چاہتا ہوں کہ حضرت مولانا شیخ الہند سے اپنا تعلق واضح کردوں۔ غالباً پچاس برس سے زیادہ عرصہ گزرا کہ میں نے بتوفیقہ تعالیٰ مدرسہ دیوبند کی طالب علمی سے فارغ ہوکر امام ولی اللہ کی حکمت وسیاست کے تدریجی مطالعہ کو اپنا مقصد حیات بنایا۔ یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس سارے سفر میں میری رہنمائی حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن کے ارشاد سے ہوتی رہی۔

الف ۔ اس سفر کی پہلی منزل ہم نے سات سال میں طے کی ہے۔ میرا یہ وقت سندھ میں گذرا۔ مولانا محمد قاسم کے نظریات سے شروع کرکے مولانا محمد اسمٰعیل شہید مولانا رفیع الدین امام عبدالعزیز کے توسط سے امام الائمہ امام ولی اللہ کی حجۃ اللہ البالغہ تک ہم پہنچ گئے۔

ب۔ ہمارے دل میں اس کتاب کے مطالب کا آہستہ آہستہ یقین اور پھر یقین میں رسوخ پیدا ہوتا رہا اس سے ہم کتاب وسنت کو اطمینان سے سمجھنے کے قابل ہوگئے۔ طالب علموں کی کئی جماعتوں کو ہم نے حجۃ اللہ پڑھائی۔ اس کے بعد ہمیں موقعہ ملا کہ حضرت شیخ الہند سے اس کتاب کے بعض اسباق سنے اسی زمانہ میں میں نے مولانا محمد قاسم کا رسالہ حجۃ الاسلام مولانا شیخ الہند سے سبقاً سبقاً پڑھا۔

ج۔ اس میں مبالغہ نہ سمجھا جائے کہ ہمیں حضرت شیخ الہند کے علمی مقام کی حیثیت اس کے بعد کسی قدر نظر آنے لگی۔ وہ بظاہر تو قاسمی سیرت کے نمونہ تھے۔ مگر باطن میں امام ولی اللہ کی حکمت کے متبحر ترجمان نظر آنے لگے۔ دیکھئے شیخ الہند اپنے موضح الفرقان کے

مقدمہ میں امام ولی اللہ کا نام کس کس مزے سے لیتے ہیں۔
حجۃ اللہ علی العالمین شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ۔

۲۔ حجۃ اللہ البالغہ کے اصول سمجھنے میں ہمارے لئے مولانا محمد قاسم کی کتابیں بہت مفید ثابت ہوئیں۔ ہم نے بچپن میں اسکول میں تعلیم پائی۔ ہماری ذہنیت ریاضی سے بہت مناسبت رکھتی تھی۔ آریہ سماج اور عیسائیوں کے مقابلہ میں مولانا محمد قاسم جو کچھ لکھتے ہیں۔ اور شیعہ کے شبہات کا جس طرح ازالہ کرتے ہیں۔ اسے میں خوب سمجھا۔ اس نے میرے ذہن کو عام اہل علم سے علیحدہ ہو کر عقلی مسائل کو محض مولانا محمد قاسم کے طریقہ پر سوچنے کے لئے تیار کر دیا۔

الف ۔ مولانا محمد قاسم محدود مسائل پر بحث کرتے ہیں اور مجھے قرآن عظیم اور صحاح کی ہر ہر حدیث کو اسی طرح سمجھنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اسی طرح میری پیاس مجھے امام ولی اللہ سے مانوس بناتی رہی۔ آہستہ آہستہ ان کے مخالف علماء کے نظریات سے انکار بھی پیدا ہونے لگا۔

ب۔ مولانا محمد قاسم کے نظریات میں رسوخ کا پہلا فائدہ یہ ملا کہ حجۃ اللہ البالغہ کے اصول سمجھنے سمجھانے میں ہم نے (۱) سرسید اور ان کے رفقاء کی تحریریں۔
(۲) مولانا محمد حسین بٹالوی اور ان کی جماعت کی کتابیں (۳) قادیانی تحریک کی تالیفات اپنے سامنے رکھیں۔ اس طرح اپنے دیوبندی رفقاء کی طرح اپنے خاص فرقے کے معلومات میں محدود نہیں رہے۔

ج۔ ہماری تحقیق میں متکلمین کی یہ جماعتیں دیوبندی اکابر کے سوا امام ولی اللہ کے تمام اصول تسلیم نہیں کرتیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم دیوبندی جماعت (اتباع

مولانا محمد قاسم) کی حکمت اور سیاست کو امام ولی اللہ کی حکمت وسیاست کا مقدمہ بناتے ہیں۔

د۔ جس قدر عرصہ ہم ہند میں علمی کام کرتے رہے دار الرشاد (سندھ) جمعیۃ الانصار (دیوبند) نظارۃ المعارف، دہلی میں ہمارا مرکز حجۃ اللہ البالغہ ہی رہی۔ اس کے بعد بیرونی سیاحت کے مختلف مقامات کابل، ماسکو، انقرہ، روما، توران میں بھی ہم نے حجۃ اللہ البالغہ کے عقلی اصول سے باہر جانا پسند نہیں کیا۔

ھ۔ مکہ معظمہ میں بیٹھکر ہم نے اپنا پروگرام بنالیا کہ ان تبدیل شدہ حالات میں ہم کس طرح اپنے مسلک پر قائم رہ سکتے ہیں۔ یورپین فلاسفی اور ہندو فلاسفی کے ماہرین سے ہم ولی اللہ فلاسفی کا کس طرح تعارف کرا سکتے ہیں۔ ہم اس راستہ پر گرتے پڑتے قدم بڑھا رہے ہیں۔ اور اپنی ہر ایک غلطی کی اصلاح کے لئے ہر وقت آمادہ رہتے ہیں۔ لیکن امام ولی اللہ کی حکمت وسیاست کی جو انقلابی روح ہماری سمجھ میں آچکی ہے اس میں ایک ذرہ کا فرق بھی برداشت نہیں کر سکتے۔

واللہ ھو المستعان وآخر دعوانا الحمد للہ رب العلمین

(بشکریہ الرحیم حیدرآباد جنوری ۱۹۶۵ء)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیوبند ــــ اور ــــ شیوخ دیوبند

سہارنپور اتر پردیش کے مغربی اضلاع میں ایک بڑا ضلع ہے۔ اسی کے مشہور و معروف اور قدیم قصبات میں ایک قصبہ دیوبند بھی ہے جو دہلی سے بجانب غرب ۹۰ میل اور سہارنپور سے بجانب جنوب ۲۲ میل ہے۔ اپنی شہرت اور قدامت کے اعتبار سے اس کو اپنے تعارف کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ مذہبی اور علمی نقطۂ نظر سے دارالعلوم دیوبند نے اس چھوٹے سے قصبہ کو بین الاقوامی شہرت کا مالک بنا دیا ہے۔

اس قصبہ کی قدامت کے متعلق یہاں کے شیخزادوں کی زبانی بعض حکایات سننے میں آئی ہیں۔ مثلاً یہ کہ اس قصبہ کو حضرت سلیمان علیہ السلام کے جنات نے آباد کیا تھا۔ اسی وجہ سے اس کو دیوبند کہا جاتا ہے۔ لیکن تاریخی نقطۂ نظر سے اس قسم کی حکایات کو طفلانہ پہیلیوں اور کہانیوں سے زیادہ وقعت نہیں دی جاسکتی۔ ہاں اس میں شک نہیں ہے کہ ہندوستان کی قدیم ترین بستیوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔

یہاں کی غیر مسلم آبادی اور ان کے قدیم ترین منادر خصوصاً دیوی کنڈ جس طرف ہے اس کو کبھی دیوی بن کہا جاتا تھا اور اسی مناسبت سے پوری آبادی دیوی بن یا

دیوبند کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہاں کے قدیم ترین منادر اور کھنڈرات کو دیکھنے کے بعد اس طرف خیال جاتا ہے کہ ایشیائے کوچک اور چینی ترکستان کے علاقے سے جب آرین قومیں ہندوستان میں داخل ہوئیں تو انھوں نے اپنے اور اپنے جانوروں کے لئے ہندوستان کے زرخیز علاقوں کو منتخب کیا چنانچہ وہ پنجاب اور یوپی کے علاقہ خصوصاً گنگا اور جمنا کے دوآبہ میں پھیل گئے۔ ان کی قدیم تیرتھ گاہیں انھیں علاقوں میں بکثرت موجود ہیں اس لئے ممکن ہے کہ یہ آبادی بھی آرین نسل کی آمد کی مرہون منت ہو۔ مولانا محمد میاں صاحب کی تحقیق کے مطابق دیوبند، ہندوستان میں برہمنوں کے دور حکومت کی آبادی ہے[۵]۔ قدیم تذکروں میں بھی دیوبند کا ذکر ملتا ہے۔ چنانچہ تاریخ دیوبند میں زبدۃ المقامات کے حوالے سے مذکور ہے۔ دیبن موضع است از مضافات سہارن پور[۶]۔

ہندوستان میں مسلم قرون وسطی میں دیوبند کی حقیقت یا حیثیت پر کوئی خاص روشنی نہیں پڑتی کیونکہ اس وقت اس کی حیثیت صرف ایک چھوٹی سی مشرک آبادی کی سی تھی۔ اس کے برخلاف اس زمانہ میں گنگوہ، تھانہ بھون، منگلور، وغیرہ کافی شہرت یافتہ تھے۔ اس لئے خیال اس طرف جاتا ہے کہ یہاں مسلمانوں کی یکطرفہ آبادی مسلم قرون وسطی میں کسی وقت ہوئی ہوگی اور غالباً اسی زمانہ میں شیخ شیرازی کی ادھر آمد ہوئی ہوگی[۷]۔

شیوخ دیوبند دیوبند میں عثمانی، فاروقی، صدیقی شیوخ آباد ہیں اور ان میں بھی غالب عنصر شیوخ عثمانی کا ہے کہ جن کا

۵؎ علماء حق ص ۶۲ ج ۱ ۶؎ زبدۃ المقامات ص ۱۰۲ ۷؎ علماء حق ص ۶۳ ج ۱

سلسلہ نسب چند واسطوں سے حضرت مخدوم کبیر الاولیاء پانی پتی متوفی ۷۸۰ھ سے جا ملتا ہے۔ گویا کہ پانی پت کے عثمانی شیوخ اور دیوبند کے عثمانی شیوخ چند واسطوں کے بعد مشترک ہیں۔ اسی عثمانی خاندان سے حضرت شیخ الہند کا تعلق ہے۔

عثمانی شیوخ کے متعلق حضرت مولانا محمد میاں صاحب نے اپنی کتاب بزرگان پانی پت میں ایک عجیب و غریب قسم کی حکایت تحریر فرمائی ہے جس کو یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

حضرت قلندر صاحب جن کی شفقت کی یہ حالت تھی کہ جب تک کبیر الاولیاء نظر نہ پڑ جاتے تھے چین نہیں آتی تھی۔ ایک روز کبیر الاولیاء کے مکان پر تشریف لے گئے تو معلوم ہوا کہ حضرت کبیر الاولیاء کھیت پر تشریف لے گئے ہیں اب حضرت قلندر صاحب نے کھیت کا رخ کیا۔ گھوڑے پر سوار ہوئے اور کھیت کی طرف چل دیئے۔ نوجوان کبیر الاولیاء نے حضرت قلندر صاحب کو دور سے دیکھکر پہچان لیا۔ تو آپ نے چنے (نخود) جو اس کھیت کی پیداوار تھے ایک چھاج (غلہ افشاں) میں بھرے اور جیسے ہی قلندر صاحب کھیت کے قریب پہونچے کبیر الاولیاء نے چنوں کی نذر پیش کی حضرت قلندر صاحب نے چنوں کا بھرا ہوا چھاج دیکھا تو مسکراتے ہوئے فرمایا بیٹا کیا لائے ہو۔ جوان صالح کبیر الاولیاء کا یہ حسن ادب تھا کہ آپ نے یہ عرض نہیں کیا کہ آپ کی خدمت میں چنے پیش کر رہا ہوں کیونکہ چنا کوئی قیمتی چیز نہیں ہوتا غلوں کی جنس میں بھی دوسرے درجہ کی جنس سمجھا جاتا ہے۔ آپ نے عرض کیا حضرت والا

کے گھوڑے کے لئے تھوڑا سا دانہ پیش کر رہا ہوں۔ حضرت قلندر صاحب نے فرمایا گھوڑے سے پہلے پوچھ لو۔ کیا وہ بھوکا ہے۔ کیا اس کو دانہ چاہیئے اگر وہ کھائے تو اس کو کھلا دو۔ حضرت مخدوم نے یہ چھاج گھوڑے کے سامنے پیش کر دیا۔ گھوڑے نے بھی کھانے سے انکار کر دیا۔ اب حضرت کبیر الاولیاء پریشان تھے۔ کہ نہ خود حضرت قلندر صاحب یہ پیش کش قبول فرماتے ہیں اور نہ ان کا گھوڑا۔ اس وقت قلندر صاحب نے فرمایا پریشان نہ ہو ہم نے تمہاری نذر قبول کر لی۔ اور اب یہ غلہ ہم تمہیں اپنی طرف سے بخش رہے ہیں اور میں اللہ رب العزت سے دعا کرتا ہوں کہ ہر دانہ کے عوض تمہیں لڑکا بخشے۔ اللہ تعالیٰ نے قلندر صاحب کی دعا قبول فرمائی چنانچہ اتنی اولاد ہوئی اور اتنی پھیلی کہ اگر آپ کو آدم ثانی کہا جائے تو مبالغہ نہیں ہوگا۔ الخ[1]

مولانا محمد میاں صاحب نے اگرچہ حضرت شیخ الہند کے اس سلسلہ نسب سے اختلاف کیا ہے لیکن اس کا وہ اقرار کرتے ہیں کہ حضرت شیخ الہند عثمانی شیوخ میں سے ہیں۔

حضرت سید شہید اور دیو بند

استخلاص وطن اور حکومت اسلامیہ کے قیام کے لئے حضرت سید احمد شہید نے ہندوستان بھر کا دورہ کیا تھا۔ بظاہر تو یہ پیری مریدی کا دورہ معلوم ہوتا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس دورہ میں مجاہدین کو تیار کیا جا رہا تھا۔ اسی وجہ سے بڑے بڑے مشائخ آپ کے دست حق پرست پر بیعت جہاد کر رہے تھے جیسے شاہ عبدالرحیم صاحب

---

[1] بزرگان پانی پت صفحہ ۲۰۲۔

شہید ولایتی، حضرت میانجی نور محمد صاحب جھنجھانوی وغیرہ۔ اور اسی وجہ سے حضرت سید صاحب قریہ قریہ شہر شہر پھر رہے تھے۔ چنانچہ سہارنپور سے لوٹتے وقت یا سہارنپور کو جاتے وقت آپ نے دیوبند میں بھی قیام فرمایا۔

دیوبند میں سید صاحب کا قیام مسجد قاضی میں ہوا۔ یہ مسجد آبادی کے بالکل مغرب میں ہے۔ پہلے اس جگہ جنگل ہی جنگل تھا۔ لوگ دن میں بھی آتے ہوئے گھبراتے تھے۔ یہ مسجد اگرچہ بہت چھوٹی ہے لیکن سید صاحب نے شاید بستی سے دور ہونے کی وجہ سے اس کو منتخب فرمایا ہو۔ سید صاحب دس دن تک یہاں مقیم رہے۔ اور لوگوں کو اپنے فیوضات سے مستفیض فرماتے رہے۔ چنانچہ تحقیق کے بعد دریافت ہوا ہے کہ یہاں کے باشندوں میں سے یہ چند حضرات آپ کے خاص رفقاء میں شمار ہوتے تھے۔

۱۔ مولانا سید مقبول احمد صاحب ۲۔ مولانا شمس الدین صاحب
۳۔ شیخ رجب علی صاحب ۴۔ شیخ منور علی صاحب
۵۔ مولوی بشیر اللہ صاحب ۶۔ مولوی فرید الدین صاحب
۷۔ شیخ عبدالرزاق صاحب ۸۔ شیخ حفیظ اللہ صاحب[۱]

ان حضرات میں سے مولانا فرید الدین صاحب کے بارے میں مشہور ہے کہ رات کو اکثر لوگوں نے آپ کی قبر سے تلاوت قرآن پاک کی آواز سنی ہے۔[۲]

مولانا فرید الدین صاحب کے چار بھائی اور تھے۔ محمد صابر، بلند بخت، مقصود علی سید احمد تینوں موخر الذکر حضرات معرکہ بالاکوٹ میں شہید ہو گئے تھے۔ مولانا فرید الدین صاحب نے ایک فرزند چھوڑا جن کا نام رفیع الدین تھا۔

---

[۱] تذکرہ مشائخ دیوبند ص ۱۶۷ [۲] یہ مزار دارالعلوم کے شمالی دروازہ کے سامنے ہے۔

حضرت شاہ رفیع الدین صاحب کی ولادت ۱۲۵۲ھ اور وفات ۱۳۰۸ھ میں ہوئی آپ نقشبندیہ سلسلہ کے اونچے درجے کے بزرگوں میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ حضرت شاہ عبدالغنی صاحب مہاجر مدنی کے خلیفہ ہیں۔ حضرت مولانا اشرف علی صاحب نے ان کے متعلق تحریر فرمایا ہے۔

> مولانا گنگوہی میں سوائے اس کے کوئی فرق نہیں کہ مولانا گنگوہی عالم ہیں اور وہ (شاہ رفیع الدین صاحب) عالم نہیں ورنہ نسبت باطنی کے اعتبار سے دونوں ایک درجہ کے ہیں۔[1]

حضرت شاہ رفیع الدین صاحب کو دنیا اور اس کے بکھیڑوں سے بالکل دلچسپی نہ تھی۔ اکثر اوقات گوشہ نشینی اور تنہائی میں گزار دیتے تھے غالباً اسی زہد و تقویٰ کی وجہ سے آپ کو دارالعلوم دیوبند کا مہتمم مقرر کیا گیا تھا۔ تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ حضرت شاہ صاحب اس خدمت کی تنخواہ نہیں لیتے تھے۔ لیکن اب وقت بدل چکا ہے۔ نہ وہ لوگ باقی ہیں اور نہ ان جیسی صفات کے مالک۔ ان اکابر کی اولاد ضرور دارالعلوم دیوبند سے وابستہ ہے مگر دیکھنے سے یقین نہیں ہوتا۔

باوجودیکہ حضرت شاہ صاحب ایک گوشہ نشین بزرگ تھے لیکن انتظام کی اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک تھے۔ آپ فرماتے ہیں۔

> یہ تو خیر جلسہ ہی ہے ہم کو تو اگر سلطنت بھی سپرد کر دی جائے تو انشاء اللہ اس کا بھی اسی سہولت کے ساتھ انتظام کریں گے۔[2]

حضرت شاہ صاحب نے صلبی اولاد میں ایک لڑکا چھوڑا تھا اور روحانی اولاد میں حضرت

---

[1] تذکرہ مشائخ دیوبند از اشرف السوانح ص۵۳ [2] ایضاً ص۱۷۵۔

مفتی عزیز الرحمٰن صاحب دیوبندی آپ کے خلیفہ تھے۔

مختصر یہ ہے کہ حضرت سید احمد شہید کے اس مختصر قیام کی وجہ سے دیوبند کی حالت میں نمایاں تبدیلی ہوئی اور یہ قصبہ ہر اعتبار سے دن دونی رات چوگنی ترقی کرنے لگا اور اب تو بین الاقوامی شہرت کا مالک ہے۔

دیوبند اور شیعیت

قاری محمد طیب صاحب، مہتمم دار العلوم دیوبند نے مسلک علمائے دیوبند میں تحریر فرمایا ہے

> یہاں کے شیوخ میں عموماً تفضیلیت کے اثرات رچے ہوئے تھے گو وہ شیعہ نہ تھے مگر ناموں اور کاموں میں شیعیت کے آثار سے کافی متاثر تھے اور کم سے کم تفضیلیت کا اثر اکثر و بیشتر پڑھے لکھے طبقہ میں سرایت کئے ہوئے تھا۔[1]

میں نے دیوبند اور سہارنپور کے بعض معتبر حضرات سے سنا ہے کہ ہمارے آباء و اجداد نے شیعیت کا زور ختم کرنے کے لئے یہ کیا تھا کہ ان خاندانوں کے نومولود بچوں کے نام بھی عبد اللہ اور عبد الرحمٰن رکھوانے شروع کر دیئے تھے جو نسلاً سید تھے۔ ... اس وقت یہاں سادات کا غلبہ تھا ان کی صحبت اور معاشرت کی وجہ سے یہاں کے علمی گھرانوں میں بھی مہتاب علی، ذو الفقار علی وغیرہ نام رکھے جاتے تھے۔

حضرت نانوتوی سے قبل یہاں سنیت کی کوئی تحریک نہیں شروع ہو سکی اور حضرت سید احمد شہید کا قیام چونکہ یہاں بہت مختصر ہوا تھا اس لئے عقیدے اور اعمال کے اعتبار سے ان ہی حضرات کے گھرانوں میں کچھ تبدیلی آئی جو حضرت سید صاحب سے

---

[1] مسودہ مسلک علمائے دیوبند ص۴۵۔

وابستہ تھے۔ لیکن جب حضرت نانوتوی یہاں تشریف لائے تو انھوں نے جان توڑ کوشش کی اور شیعیت اور تفضیلیت کا خاتمہ کر دیا۔

حقیقت یہی ہے کہ جو رسم و رواج توارث کے ذریعہ معاشرہ کا جزو بن جاتے ہیں ان کے نیست و نابود کرنے کے لئے مسلسل ایسی ہی جدوجہد کرنا پڑتی ہے جیسی حضرت قاسم العلوم والخیرات نے فرمائی تھی۔ تب کہیں جاکر وہ بے ہودہ اثرات ختم ہوتے ہیں۔ آج دارالعلوم دیوبند کے اتنے فروغ اور اثر کے باوجود۔ دیوبند سے بالکلیہ بدعات کا اخراج نہ ہو سکا وہاں آج بھی برابر اعراس ہوتے ہیں۔

حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب

دیوبند کے مشہور عثمانی شیوخ میں ایک صاحب تھے شیخ فتح علی۔ ان کے تین فرزند تھے۔ مولانا مہتاب علی صاحب، مولانا ذوالفقار علی صاحب، تیسرے صاحبزادے کے بارے میں معلوم نہ ہوسکا کہ ان کا کیا نام تھا۔ باقی یہ دونوں بھائی یعنی مولانا مہتاب علی صاحب اور مولانا ذوالفقار علی صاحب عربیہ کالج دہلی کے تعلیم یافتہ اور استاذ العلماء حضرت مولانا مملوک علی صاحب کے شاگرد رشید تھے۔ دونوں صاحب علم و فضل کے اعتبار سے اس زمانہ میں دیوبند کے ممتاز ترین علماء میں شمار ہوتے تھے۔

حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب نے تو سرکاری ملازمت کرلی تھی اور مولانا مہتاب علی صاحب کا قیام دیوبند ہی میں رہتا تھا۔ لیکن دونوں صاحب مدرسہ دیوبند کی بنیاد اور اس کے کاموں میں جناب سید عابد حسین صاحب کے ہمنوا اور مشیر کار رہے۔ اور حتی المقدور مدرسہ کو ترقی دینے میں دونوں حضرات نے انتھک کوشش کی۔

حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب نے اپنی علمی صلاحیتوں کی وجہ سے بہت جلد ترقی کرلی تھی چنانچہ وہ انسپکٹر مدارس بنادیئے گئے اس وجہ سے ان کا کسی ایک جگہ قیام نہیں رہتا تھا۔ مولانا کا انتقال سنہ ۱۳۲۲ھ میں ہوا اور آپ نے یادگار میں ۱۶۰ افراد ذکور اناث اور متعدد کتابیں چھوڑیں۔

حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب بہت بڑے عالم تھے۔ آج ان کی کتابیں

علماء کو محو حیرت کئے ہوئے ہیں۔ عربی، فارسی، اردو کے بے مثل ادیب تھے تینوں زبانوں میں آپ کو یکساں مہارت تھی۔ آپ کی چند کتابیں اب بھی موجود ہیں ان کے پڑھنے کے بعد آپ کی ادبیت کا پتہ چلتا ہے۔

مولانا کی تصنیفات

(۱) عطر الوردہ۔ یہ کتاب قصیدہ بردہ کی اردو شرح ہے۔ زبان سلیس۔ بامحاورہ۔ اور مقفی ہے۔

۲۔ الارشاد۔ یہ قصیدہ بانت سعاد کی شرح ہے۔ یہ کتاب رمضان ۱۳۱۷ھ مطابق ۱۹۰۰ء میں پہلی مرتبہ مطبع مجتبائی دہلی سے شائع ہوئی اس کا ایک قدیم نسخہ میرے پاس موجود ہے۔

۳۔ التعلیقات۔ یہ قصیدہ سبع معلقہ کی شرح ہے۔

۴۔ تسہیل الدراسہ۔ یہ دیوان حماسہ کی اردو شرح ہے۔

۵۔ تسہیل البیان۔ یہ دیوان متنبی کی اردو شرح ہے۔

اس کتاب کے متعلق مولانا نے خود ہی تحریر فرمایا ہے۔

> امید ہے کہ قاریان متوسط الاستعداد کی فہم معانی اشعار میں یہ نسبت شروح عربی کے زیادہ مدد کرے اور جو شخص فن ادب سے کسی قدر مناسبت رکھتا ہو وہ ان کے مطالب بے مدد استاد بے منت علم سمجھ لے۔[۱]

جی چاہتا تھا کہ مولانا کی شرح سے چند نمونے بھی پیش کر دیئے جائیں لیکن کتاب کے طویل ہو جانے کی وجہ سے ہم ایسا کرنے سے قاصر ہیں۔ مولانا نے اپنی اس شرح کے آخر میں ایک شعر درج فرمایا ہے۔

---

[۱] خاتمہ تسہیل البیان ص۳۰۹۔

شکر کہ ایں نامہ بعنواں رسید   پیشتر از عمر بپایاں رسید

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مولانا کی آخری تصنیف ہے۔

۶۔ معیار البلاغت :۔ یہ اردو زبان میں علم معانی و بیان میں مولانا کی لاجواب کتاب ہے اس کو اگر اردو کی مختصر المعانی کہا جائے تو زیادہ اچھا ہے کیوں کہ مولانا نے وہ تمام مباحث جو مختصر المعانی میں موجود ہیں اس کتاب میں تحریر فرما دیئے ہیں۔ پھر تعریف یہ ہے کہ اردو شعراء کے اشعار کی مثالیں اس طرح چسپاں کر دی ہیں کہ حیرت و استعجاب دانتوں میں انگلی دبائے کھڑے رہتے ہیں۔

۷۔ الہدیۃ السنیۃ :۔ اس کتاب میں مدرسہ عربیہ دیوبند کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ کتاب کی عبارت مقفیٰ ہے دیوبند کے تعارف میں فرماتے ہیں۔

کورۃٌ۔ قدیمۃٌ۔ وقصبۃ عظیمۃ۔ وبلدۃ فخیمۃ۔

مولانا کی اولاد

مولانا نے ۱۳۲۲ھ میں ۸۵ سال کی عمر میں وفات پائی۔ آپ کی وفات کے وقت آپکے گھر کے تقریباً ۲۰ افراد تھے۔ مولانا کی دو لڑکیاں تھیں جن کا عقد شہر ہی میں ہو گیا تھا۔ بیٹوں میں چار بیٹے چھوڑے۔

۱۔ حضرت شیخ الہند۔ جن کا مفصل تذکرہ اس کتاب کی زینت بنا ہے۔

۲۔ مولانا حامد حسن صاحب :۔ آپ کا انتقال ۱۳۲۹ھ میں ہوا۔ آپ کی ملازمت کا اکثر حصہ ضلع بجنور میں گزرا۔ ان کی اولاد میں سے بیٹے پوتے موجود ہیں۔

۳۔ مولانا حکیم محمد حسن صاحب :۔ آپ حضرت شیخ الہند سے عمر میں چھوٹے تھے۔ حدیث شریف حضرت گنگوہی اور طب حکیم عبد المجید صاحب دہلوی سے پڑھی تھی اور دیگر علوم حضرت شیخ الہند سے حاصل کئے تھے ایک عرصہ تک دار العلوم کے مدرس و طبیب رہے

۴۔ مولانا محمد محسن صاحب۔ یہ حضرت شیخ الہند کے سب سے چھوٹے بھائی تھے۔ ان کو حضرت شیخ الہند اور حضرت کو ان سے بہت زیادہ محبت تھی۔

ان سب حضرات کی والدہ ماجدہ دیوبند کے ایک معزز شیخ بو علی بخش کی نورِ نظر تھیں۔ یہ نہایت ہی سخی اور نیک بخت خاتون تھیں۔

❖ ❖ ❖

حضرت شیخ الہند اور انکے ابتدائی حالات

یہ گذشتہ سطور میں تحریر کیا جاچکا ہے کہ آپ حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب عثمانی دیوبندی کے فرزند ارجمند ہیں۔ آپ ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۱ء میں پیدا ہوئے گویا انقلاب ۱۸۵۷ء میں آپ کی عمر شریف تقریباً سات سال کی ہوگی۔ یہ عمر شعور کی عمر تو نہیں کہی جاسکتی ہاں اس میں شک نہیں کہ اس عمر میں ہونہار اور باہوش بچے کے ذہن میں اس زمانے کے کچھ دھندلے سے نقوش ضرور باقی رہ جاتے ہیں جن کو سن شعور کا زمانہ ابھارتا رہتا ہے۔

جس وقت آپ کی والدہ محترمہ کا انتقال ہوا یعنی ۱۳۰۰ھ میں اس وقت آپ کی عمر شریف غالباً ۳۲ سال کی تھی گویا آپ نے اپنی عمر شریف کا تقریباً نصف حصہ مادری شفقت کے سایہ میں گزارا اور نصف سے زائد حصہ شفیق باپ کی زیر تربیت بسر کیا اس لئے کہ حضرت شیخ الہند کا وصال ۱۳۳۹ھ میں ہوا اور والد محترم کا انتقال ۱۳۲۲ھ میں۔

کبھی کبھی حضرت شیخ الہند اپنی والدہ محترمہ کی شفقت اور محبت کا تذکرہ درسگاہ میں بھی فرمایا کرتے تھے۔ آپ نے متعدد مرتبہ فرمایا

میں اپنے درس و تدریس میں مشغول رہتا۔ گھر میں کھانا پک جاتا اور سب کھا لیتے۔ لیکن میری والدہ کسی قدر آٹا بچا کر میری منتظر رہتیں۔ گرمی کے دوپہر میں گھر جاتا تو خود فوراً تازہ روٹی پکا کر

مولانا کی تعلیم

آپ نے الف۔ با اور قرآن پاک کا اکثر حصہ ایک معمر بزرگ میاں جی منگلوری سے اور کسی قدر میاں جی عبد اللطیف صاحب سے پڑھا[1]۔ اس کے بعد فارسی کی سب کتابیں اور عربی کی ابتدائی کتابیں اپنے مشہور عالم چچا مولانا مہتاب علی سے پڑھیں۔

حضرت مولانا کو اگرچہ سیر و شکار کا بھی شوق تھا لیکن وہ کوچہ گردی اور رذیل کھیلوں سے ہمیشہ مجتنب رہے۔ آپ میں شکاریوں کی طرح کی عادت بھی نہ تھی کہ شکار تو تھوڑی دیر رہا اور حکایت شکار میں گھنٹوں صرف کر دیئے۔ غالباً اسی وجہ سے آپ ۱۵ سال کی عمر میں (محرم سنہ ۱۲۸۳ھ تک) قدوری اور شرح تہذیب وغیرہ کتابیں پڑھ چکے تھے۔ اس کے بعد ۱۵ محرم الحرام سنہ ۱۲۸۳ھ سے مدرسہ دیوبند کے مدرس اول ملا محمود صاحب کے سامنے پڑھنا شروع کیا حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی تذکرۃ الخلیل میں تحریر فرمایا ہے۔

> سنہ ۱۲۸۴ھ میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہ نے کنز الدقائق۔ میبذی اور مختصر المعانی کا امتحان دیا اور سنہ ۱۲۸۵ھ میں ہدایہ، مشکوٰۃ، مقامات حریری کے امتحانات میں شریک ہوئے۔ سنہ ۱۲۸۶ھ میں کتب صحاح ستہ اور بعض دیگر کتابیں اپنے فخر زمانہ استاذ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب سے پڑھیں۔ اس وقت مولانا میرٹھ میں منشی ممتاز علی صاحب کے مطبع میں تصحیح کی خدمت انجام دیتے تھے۔ سنہ ۱۲۸۸ھ

---

[1] حیات شیخ الہند از میاں اصغر حسین صاحب ص ۹

میں آپ فارغ ہوگئے اور اسی سال مدرسہ کے معین مدرس بھی بنا دیئے
گئے ۱۹ ذیقعدہ ۱۲۹۰ھ کو آپ کی دستار بندی ہوئی اور ۱۲۹۲ھ میں
آپ مدرس چہارم بنا دیئے گئے[۱]۔

اس تشریح سے یہ بات ظاہر ہے کہ مسجد چھتہ میں جس مدرسہ کا قیام ہوا اور جو آئندہ
چل کر دارالعلوم بن گیا اس کے پہلے سال میں آپ نے کنز الدقائق وغیرہ کتابوں کو
پڑھنا شروع کیا اس طرح آپ ۲۰ سال کی عمر میں درس نظامی کی تکمیل سے فارغ ہوگئے
آپ کی طالب علمی کے حالات لکھتے ہوئے میاں اصغر حسین صاحب نے تحریر فرمایا ہے۔

ہمارے حضرت مولانا ابتدائے مدرسہ کے بعد مدرسہ کے سابقین اولین طلبہ میں
داخل ہوئے ۱۲۸۴ھ میں آپ نے کنز الدقائق، میبذی، مختصر المعانی، وغیرہ پڑھ کر سالانہ
امتحان دیا اور آئندہ سال ہدایہ، مشکوٰۃ شریف، مقامات میں امتحانات دیئے ۱۲۸۶ھ
میں کتب صحاح ستہ اور بعض دیگر کتب اپنے فخر زمانہ استاذ حجۃ اللہ البالغہ مولانا محمد قاسم
صاحب سے شروع کیں۔ مولانا ممدوح میرٹھ میں منشی ممتاز علی صاحب کے مطبع میں
تصحیح کا کام کرتے تھے۔ پھر یہ مطبع دہلی منتقل ہوگیا تو مولانا ممدوح بھی دہلی مقیم ہوئے اور
کبھی کبھی دیوبند اور اپنے وطن نانوتہ بھی تشریف لے جا کر مقیم رہے۔ حضرت مولانا نے ان
سب مقامات میں اکثر اپنے باکمال استاذ کے ساتھ رہ کر دل و جان سے قابل رشک خدمت
کر کے سعادت حاصل کی اور سفر و حضر میں سلسلہ درس جاری رکھ کر استاذ کی شفقت اور
اپنی ذکاوت سے بکمال تحقیق کتابیں پڑھیں[۲]۔

اسی طرح رفتہ رفتہ ۱۲۸۹ھ تک حضرت نے تمام صحاح ستہ اور دیگر فنون کی

---

[۱] تذکرۃ الخلیل صفحہ ۱۱۱، تذکرہ مشائخ دیوبند صفحہ ۲۰۲ [۲] از میاں اصغر حسین صاحب صفحہ ۱۱

اعلیٰ کتابیں مولانا کی خدمت میں ختم فرمائیں اور اسی زمانہ میں باوقات مختلفہ ادب کی بعض کتب اپنے والد ماجد سے اور حساب وغیرہ دیگر فنون کی کتابیں مدرسہ میں پڑھکر علوم عقلیہ ونقلیہ میں اعلیٰ استعداد حاصل کرکے فارغ التحصیل ہو گئے اور معین المدرسین بن کر درس دینے لگے۔

۱۹ ذی قعدہ ۱۲۹۰ھ میں مدرسہ کے جلسہ دستاربندی اور اہل اسلام کے مجمع عام میں ہمراہی مولانا فخرالحسن صاحب گنگوہی، مولانا عبدالحق صاحب پوری وغیرہ سند فراغ اور دستار فضیلت اکابر علما اور خیار عباد اللہ کے دست حق پرست سے عطا ہوئی۔[۱]

حضرت مولانا میاں اصغر حسین صاحب کی مندرجہ بالا تشریحات سے مندرجہ ذیل چند چیزیں ظاہر ہوئیں۔

۱۔ حضرت شیخ الہند نے ۱۲۸۶ھ میں کتب صحاح ستہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب سے پڑھیں۔

۲۔ ۱۲۸۶ھ تک حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کا مستقل قیام منشی ممتاز علی صاحب کے مطبع میں پہلے میرٹھ اور پھر دہلی رہا۔

۳۔ حضرت مولانا کبھی کبھی عارضی طور سے اس مدت میں دیوبند اور نانوتہ آتے جاتے رہتے تھے۔

۴۔ حضرت شیخ الہند نے حضرت قاسم العلوم کے سفر و حضر میں ساتھ رہ کر یا بالفاظ دیگر مستقلاً میرٹھ اور دہلی میں حضرت ممدوح کے پاس رہ کر اور ان کی خدمت کرکے انسے کتابیں پڑھیں ہاں جب وہ اپنے وطن نانوتہ اور اپنے بہنوئی (شیخ نہال احمد صاحب) کے یہاں دیوبند

---

[۱] از میاں اصغر حسین صاحب ص ۱۲۔

تے ہوں گے تو یہاں بھی اکتساب کا سلسلہ جاری رکھا ہوگا۔

ان تنقیحات سے یہ امر بخوبی واضح ہو چکا ہے کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب سنہ ۱۲۸۶ھ تک کبھی دیوبند مستقل نہیں رہے اور نہ انھوں نے مدرسہ دیوبند میں ایک استاذ یا مدرس کی حیثیت سے درس ہی دیا۔ اگر مدرسہ دیوبند میں پڑھانا شروع کیا ہے تو وہ سنہ ۱۲۸۶ھ کے بعد کسی بھی سن میں پڑھانا شروع کیا ہوگا اس سے قبل نہیں۔

حضرت کے اساتذہ حضرت شیخ الہند نے جن حضرات کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا ان کے اسمارِ گرامی یہ ہیں۔

۱۔ میانجی منگلوری۔

۲۔ میانجی عبداللطیف صاحب ان ہر دو حضرات سے ابجد ہوز اور قرآن پاک پڑھا

۳۔ حضرت مولانا مہتاب علی صاحب عم اکبر حضرت شیخ الہند۔ ان سے عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔

۴۔ حضرت مولانا ملا محمود صاحب سے سنہ ۱۲۸۳ء تا سنہ ۱۲۸۶ھ پڑھا۔

۵۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب سے سنہ ۱۲۸۳ھ تا سنہ ۱۲۸۶ھ پڑھا۔ آپ سنہ ۱۲۸۳ھ کے آخر میں بیس روپئے ماہوار پر مدرسہ دیوبند میں مدرس مقرر ہوئے تھے۔

۶۔ حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب ان سے فارغ ہونے یعنی سنہ ۱۲۸۸ھ کے بعد ادب کی چند کتابیں پڑھیں۔ مثلاً دیوان متنبی، دیوان حماسہ، سبعہ معلقہ۔

۷۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب سے صحاح ستہ اور اس کے بعد فنون کی چند کتابیں پڑھیں۔ جس کی ابتدا سنہ ۱۲۸۶ھ یا اس کے بعد ہے لیکن افسوس ہے کہ قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے نہایت ہی غیر ذمہ دارانہ بات چپکے سے تحریر کر دی۔

اولاً حضرت بانی اعظم (یعنی مولانا محمد قاسم صاحب) نے دار العلوم
کی بنیاد رکھ کر درس و تدریس کا آغاز کرایا اور خود بھی چھتہ کی مسجد میں جو
اس دار العلوم کا نقطۂ آغاز ہے درس شروع فرمایا [۱]

اس ایجاد کے غلط ہونے کے لئے اولاً تو میری معروضات ہی بہت کافی ہیں مزید یہ
کہ حضرت قاسم العلوم کے معاصر اور دار العلوم دیوبند کے پہلے صدر مدرس حضرت مولانا
محمد یعقوب صاحب نے بھی یہ تحریر فرمایا ہے کہ مولانا محمد قاسم صاحب نے تصحیح کا کام ذی الحجہ
سنہ ۱۲۶۷ھ سے شروع کر دیا تھا۔ آپ نے کافی عرصہ تک مطبع احمدی میں کام کیا اور حضرت
مولانا احمد علی صاحب کی بخاری شریف کے ۵ یا ۶ پاروں کی تصحیح کی اس کے بعد میرٹھ میں
منشی ممتاز علی صاحب کے پریس میں کام کیا پھر دہلی چلے گئے۔ حضرت موصوف تحریر فرماتے
ہیں کہ "حضرت مولانا احمد حسن صاحب امروہوی، مولانا محمد صدیق صاحب مراد آبادی
اور حضرت شیخ الہند کو صحاح دہلی اور میرٹھ کے قیام کے زمانے میں [۲] پڑھائیں اسکے باوجود
بھی اگر قاری صاحب ممدوح کے پاس کوئی دلیل یا ثبوت ہو تو فرمائیں۔ ہاں میرا دعویٰ
تو یہی ہے کہ حضرت شیخ الہند نے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب سے سنہ ۱۲۸۶ھ لغایتہ
سنہ ۱۲۸۸ھ میں دورہ حدیث پڑھا اور وہ بھی دیوبند سے باہر (میرٹھ۔ دہلی) رہ کر حضرت
قاسم العلوم کا مدرسہ عربیہ دیوبند سے باضابطہ تعلق کا سراغ سنہ ۱۲۹۰ھ یا سنہ ۱۲۸۹ھ سے ملتا
ہے اس سے قبل نہیں۔ اس بحث کو ہم مفصلاً آئندہ سطور میں کسی عنوان کے تحت ذکر کریں گے۔

استاذ کی خدمت

حضرت شیخ الہند نے اپنے استاذ محترم کی بہت زیادہ خدمات
انجام دی ہیں۔ اس کی تفصیل اگرچہ زیادہ تو دستیاب نہ

---

[۱] مسلک علماء دار العلوم دیوبند صفحہ ۶۱ [۲] سوانح از قلم حضرت مولانا محمد یعقوب صدر مدرس دار العلوم

ہو سکی تاہم جسقدر رہے اس سے اندازہ ضرور ہوتا ہے مثلاً ایک دفعہ حضرت استاذ محترم کو بخار چڑھا ہوا تھا۔ زمانہ برسات کا تھا اور آنا دیوبند تھا۔ حضرت شیخ نے یہ کیا کہ حضرت استاذ کو گھوڑے پر سوار کیا۔ ایک ہاتھ سے اس کی لگام پکڑی اور ایک ہاتھ سے رکاب کے قریب ہو کر حضرت کی کمر کو سہارا دیا اور اسی طرح ۲۲ میل کا راستہ پیدل طے کیا۔[1]

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے وصال کے بعد حضرت شیخ الہند نے مدرسہ میں آنا ترک کر دیا تھا۔ شدت الم کا یہ عالم تھا کہ لوگوں سے ملاقات کا سلسلہ ترک کر دیا۔ یہ حالت حب شدید اور خدمات ماضیہ کی نشان دہی کرتی ہے۔ کیونکہ جس شخص پر استاذ کی محبت کا اسقدر غلبہ ہو وہ اپنے استاذ کی خدمت کیلئے نہ معلوم کیا کچھ کر چکا ہوگا۔

احترام استاذ

سنہ ۱۲۹۴ھ میں آپ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب اور حضرت قطب العالم مولانا رشید احمد گنگوہی اور دوسرے اکابر ہند کے ہمراہ حج کے ارادے سے روانہ ہوئے۔ ان ایام میں حضرت شاہ عبد الغنی صاحب مہاجر مدنی اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی بقید حیات تھے۔ بہت سے حضرات ان سے بیعت ہوئے اور سند حدیث حاصل کی لیکن حضرت شیخ الہند نے اس کا خیال بھی نہ کیا جب حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نے خود ہی حضرت شاہ عبد الغنی صاحب سے سند حدیث اور حضرت حاجی صاحب سے بیعت کے لئے عرض کیا تو پھر ان دونوں حضرات کے الطاف وعنایات کو بسر چشم قبول کر لیا۔ بس اسی ایک واقعہ سے استاذ کے احترام پر بہت پھیلی ہوئی روشنی پڑتی ہے۔

---

[1] تذکرہ مشائخ دیوبند ص ۲۰۲۔

مدرسہ عربیہ دیو بند کی مدرسی

حضرت ۱۲۸۵ھ میں ابھی پورے طور پر فارغ التحصیل بھی نہ ہوئے تھے کہ آپ کو معین مدرس مقرر کر دیا گیا۔ تقریباً پورے ایک سال آپ نے مدرسہ میں معین مدرس کی حیثیت سے طلبا کو مختلف کتابیں پڑھائیں۔ جب طلبا کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا رہا تو منتظمین حضرات کو اسٹاف بڑھانے کی ضرورت پیش آئی۔ اس وقت ۔۔۔ حضرت شاہ رفیع الدین صاحب (جو اس وقت مہتمم تھے) نے مدرس چہارم کے لئے حضرت شیخ الہند کو منتخب کیا۔

حضرتِ شیخ الہند کے والد ماجد چونکہ خوشحال آدمی تھے وہ تنخواہ لیکر پڑھانا پسند نہ کرتے تھے اس لئے معاوضہ سے انکار کر دیا۔ لیکن حضرت شاہ صاحب موصوف کے سامنے ان کو بھی مجبور ہونا پڑا۔ اس طرح حضرت شیخ الہند کو ۱۵ روپے ماہوار پر مدرس چہارم بنا دیا گیا۔ اس طرح ۱۲۹۲ھ میں مدرسہ عربیہ دیو بند کے باضابطہ چار استاذ ہو گئے۔

۱۔ حضرتِ مولانا محمد یعقوب صاحب صدر المدرس

۲۔ " " سید احمد صاحب دہلوی مدرس دوم

۳۔ " " ملا محمود " سوم

۴۔ " " محمود حسن صاحب شیخ الہند " چہارم

حضرت مولانا اگرچہ مدرس چہارم تھے لیکن طلبا کو بڑی بڑی کتابیں پڑھایا کرتے تھے۔ ارشاد فرماتے ہیں۔

میں ابتدا میں قطبی اور قدوری پڑھا لینے کو بھی غنیمت سمجھتا تھا۔[1]

---

[1] حاشیہ: میاں اصغر حسین صاحب ص۱۳۔

۱۲۹۳ھ میں یعنی تقرر کے دوسرے سال آپ نے ترمذی، مشکوٰۃ، ہدایہ وغیرہ کو کتابوں کے اسباق پڑھائے۔ اس وقت مدرسہ مسجد قاضی اور جامع مسجد سے منتقل ہوتا ہوا اپنی موجودہ عمارت میں آچکا تھا۔ ۱۲۹۴ھ میں آپ حج کے لئے تشریف لے گئے اور وہاں سے واپسی پر ۱۲۹۵ھ سے بخاری شریف وغیرہ بھی پڑھانا شروع کر دیں ۱۲۹۷ھ میں جب حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کا وصال ہو گیا تو آپ نے چند دنوں کے لئے پڑھانا بند کر دیا تھا لیکن حضرت شاہ رفیع الدین صاحب کے سمجھانے سے پڑھانا شروع کر دیا۔ اور ۱۳۰۲ھ یعنی حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کے وصال تک مدرس دوم کی حیثیت سے درس دیتے رہے۔ ۱۳۰۵ھ میں جب مولانا سید احمد صاحب مدرس اول بھوپال تشریف لے گئے تو آپ صدر مدرس بنا دیئے گئے اس وقت یعنی ۱۳۰۵ھ لغایۃ ۱۳۳۹ھ آپ دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس رہے۔ اس طرح آپ نے ۱۲۸۹ھ لغایۃ ۱۳۳۹ھ تقریباً پچاس سال علم نبوت کی اشاعت فرمائی۔

اس مدت میں حضرت نے کبھی ترتیب درجات اور مقدار مشاہرہ پر توجہ نہیں دی اور نہ اس کا خیال کیا وہ ہمیشہ دارالعلوم دیوبند کی خدمات خدا کا کام سمجھ کر کرتے رہے۔ مجھے صحیح روایات کے ذریعہ معلوم ہوا ہے کہ آپ مشاہرہ قبول ضرور فرماتے تھے لیکن بکراہت[1] اور بضرورت کیونکہ متاخرین فقہاء حنفیہ نے تعلیم پر ضرورۃً اجرت کو جائز قرار دیا ہے اور مشہور قاعدہ ہے۔

الضرورۃ یقدر بقدر الضرورۃ — ضرورت قدر ضرورت تک ہی محدود ہے۔

چنانچہ خلفائے راشدین اور اسلاف (جن کی زندگیاں ہمارے لئے مشعل راہ ہیں)

---

[1] از میاں اصغر حسین صاحب ص۲۔

کا یہی معمول رہا ہے کہ انھوں نے قومی اور ملی خدمات پر بقدر ضرورت رزق پر اکتفا کیا ہے بلکہ بہت سے واقعات تو اس قسم کے موجود ہیں کہ وہ حضرات ضرورتوں کو سمیٹے ہوئے تھے۔ اور عسرت کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے افسوس کہ آج ان اوصاف کے حامل نظر نہیں آتے۔

حضرت شیخ الہند کو بہت سے ایسے مواقع پیش آئے کہ وہ چاندی اور سونے کے چبوترے پر بیٹھتے مگر انھوں نے ہر حال میں دارالعلوم دیوبند کی فقیرانہ زندگی کو ترجیح دی۔ پیرجی عبدالرزاق صاحب گنگوہی نے ہر چند کوشش کی کہ مولانا دہلی تشریف لے آئیں اور شاہ ولی اللہ کی درسگاہ کو پھر سے آباد کریں لیکن مولانا نے ہرگز گوارہ نہ کیا۔[1]

۱۳۱۲ھ میں جب بوجہ گرانی دیگر مدرسین کے مشاہروں میں اضافہ ہوا تو بحکم حضرت مولانا رشید احمد صاحب قدس سرہٗ آپ کا مشاہرہ پچاس روپے ہو گیا۔ آپ نے خاموشی سے قبول فرمالیا۔ دو مرتبہ استاذ شفیق کو خواب میں فرماتے دیکھا "محمود حسن کب تک مدرسہ سے مشاہرہ لیتے رہوگے۔ دونوں مرتبہ پورا عزم کر لیا کہ اب نہ لوں گا مگر مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کے ادب سے مجبور تھے۔ اجازت نہ دی۔ ہنس کر فرمایا نہیں ان کو کہنے دو، ہرگز نہ چھوڑو۔ مگر جب حضرت مولانا ممدوح کی وفات ہو گئی اور ماتحت مدرسین کے اضافہ کے ساتھ آپ کے پچھتر روپے مقرر ہوئے تو آپ نے اضافہ بالکل قبول ہی نہ فرمایا اور کچھ عرصہ کے بعد مشاہرہ لینا بالکل بند کر دیا اور پھر بھی اسی پابندی اور دلسوزی سے درس دیتے رہے۔

---

[1] از میاں اصغر حسین صاحب صفحہ ۲۔

حضرت شیخ الہند پابندی کے ساتھ صبح کی نماز ادا فرما کر درس کے لئے تشریف لے آتے تھے۔ کبھی دفعہ یا پیشاب کے لئے درمیان میں اٹھتے تو مضائقہ نہیں تھا ورنہ مسلسل درس دیتے رہتے۔ گیارہ بارہ بج جاتے تھے اور ظہر کے بعد بھی یہی مشغلہ موجود رہتا تھا۔ سنہ ۱۳۲۰ھ سے پانچ چھ گھنٹہ درس دینا شروع کر دیا تھا اور بوجہ ضعف بقیہ اوقات درس سے فارغ رہتے تھے۔ پھر جب مولانا انور شاہ کشمیری اور مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی مدرس ہو گئے تو بخاری اور ترمذی دو تین گھنٹہ پڑھاتے تھے۔ حضرت مولانا سید فخر الدین احمد صاحب مدظلہٗ شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند بیان فرماتے ہیں کہ۔

"میں نے تو یہ دیکھا ہے کہ حضرت" صبح آٹھ بجے سے لیکر بارہ بجے تک درس دیا کرتے تھے اس طرح آپ چھ مہینہ میں ترمذی شریف ختم کرا دیتے تھے اور اس کے بعد بخاری شریف کا درس اسی وقت شروع کرا دیتے تھے۔ عصر کی نماز کے بعد مدرسہ کی مسجد میں ابو داؤد شریف کا سبق پڑھاتے تھے۔ مصلے پر آپ تشریف فرما ہوتے اور سامنے چٹائیوں پر طلباء بیٹھ جاتے تھے۔ اس وقت مسجد کے فرش پر صرف ہنڈیاں بچھی ہوئی تھیں۔ فرش ناہموار تھا۔ میں نے دیکھا ہے کہ اس وقت کے درس میں مدرسین حضرات مثلاً مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی۔ حضرت مولانا انور شاہ کشمیری وغیرہم بھی شرکت فرماتے۔ حضرت شاہ صاحب کی یہ عادت تھی کہ ہمیشہ حضرت کی پشت کے پیچھے ایک گز کے فاصلے پر اسی ناہموار ننگے فرش پر بالکل خاموش بیٹھے سنا کرتے۔ بعض دفعہ طلباء کے اعتراضات پر مسکرا بھی دیتے تھے۔

مولانا کا حلقۂ درس حضرت نے تمام عمر چٹائی پر بیٹھ کر درس دیا۔ اخیر عمر میں جب مرض بواسیر نے شدت اختیار کی، تو خدام نے

اسپرنگ دار گدا سنوا دیا تھا۔ لیکن آپ اس پر بیٹھتے ہوئے کراہت محسوس کرتے تھے۔ بواسیری دورہ کی شدت کے وقت آپ کو ذرا سا بھی وضو کے متعلق شک ہو جاتا تو فوراً حلقہ درس سے باہر تشریف لاتے اور وضو کر کے پھر درس دینا شروع کر دیتے[1]
مولانا کا حلقہ درس نہایت مہذب اور شائستہ ہوتا تھا جس میں ہر طرف سکون و وقار سایہ فگن رہتا تھا۔ دور دور سے ہر استعداد کے طلبا آتے اور آپ ہر ایک کو مطمئن فرما دیتے تھے۔ بہت سے طلبا تو کئی کئی سال دورہ حدیث پڑھانے کے بعد شریک درس ہوتے اور آپ ان سب کے شکوک و شبہات کا ازالہ فرماتے۔

حضرتؒ کی تقریر نہایت سلیس اور رواں ہوتی تھی۔ آواز میں نہ کرختگی اور نہ نرمی بلکہ متوسط آواز سے مسلسل بولا کرتے تھے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ جب آپ کو جوش آیا تو بولنے میں گلے کی رگیں پھولنے لگیں اور چہرہ کی رنگت بدل گئی۔ بلکہ پورے وقار اور متانت کے ساتھ سلسلہ تقریر جاری رہتا تھا۔ اور سامعین مضامین اور دلائل و شواہد کے اظہار سے محسوس کرتے کہ اس وقت مولانا پورے جوش و خروش سے تقریر فرما رہے ہیں۔

طرز استدلال اتنا عجیب تھا کہ پہلے ہر مسئلہ کا اثبات قرآن پاک کی آیات پھر احادیث اور پھر آثار صحابہ سے ترتیب وار بیان فرماتے۔ امام ابو حنیفہ کے مسلک پر جب قرآنی آیات تلاوت فرماتے تو سامعین یہ یقین کر کے اٹھتے تھے کہ یہی حق ہے۔
تمام ائمہ کا ادب و احترام حد درجہ ملحوظ رکھتے تھے کسی بھی مصنف اور امام کی شان میں کوئی گرا ہوا لفظ نہ بولتے اور اگر کبھی یہ محسوس فرماتے کہ کوئی طالب علم کسی مصنف

---

[1] روایت حضرت مولانا فخر الدین صاحب مدظلہ۔

یا امام کو اپنے نزدیک ہلکا محسوس کر رہا ہے تو پھر حضرت اسی مصنف یا امام کی اس قدر طرفداری فرماتے کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہی مصنف یا امام حق پر ہیں[1]۔

امام مسلم نے جو اپنی کتاب میں امام بخاری پر تعریض کرکے گرفت کی ہے اس پر فرمایا "جب ملاقات ہوئی تو بخاری کے خادم اور عقیدت مند ہوگئے۔ کاش اسی طرح امام بخاری اور امام ابوحنیفہ کی ملاقات ہوجاتی تو اپنے سب اعتراض واپس لے لیتے" لیکن افسوس کہ آج امام بخاری اور امام مسلم اور کسی بھی امام کی خیریت نہیں ہے میں تو یہی سمجھتا ہوں تھوتھا چنا باجے گھنا ؎

جو ظرف کہ خالی ہے صدا دیتا ہے

حضرت شیخ الہند اسباق پوری تیاری اور پورے مطالعہ کے بعد پڑھاتے تھے شروحات حدیث اور فقہ کو نہ معلوم کتنی کتنی مرتبہ دیکھ چکے تھے۔ میاں اصغر حسین صاحب فرماتے ہیں "ایک دن حضرت نے فرمایا میاں ذرا عینی لانا، میں نے عرض کیا حضرت! بخاری کی شرح عینی فرمایا نہیں اس کو تو دسیوں مرتبہ پڑھ چکا ہوں بلکہ ہدایہ کی شرح عینی لاؤ۔

حضرت شیخ الہند کا طریقہ درس اور جمع بین الاقوال والاحادیث وہی تھا جو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی درسگاہ کا تھا۔ آپ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے اقوال کو نہایت اعتماد اور احتیاط کے ساتھ پیش فرماتے تھے۔

حضرت مولانا سید فخر الدین صاحب شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند فرماتے ہیں[2]

حضرت ہمیشہ قسطلانی کے ذریعہ سبق پڑھایا کرتے تھے اور خود

---

[1] روایت حضرت مولانا سید فخر الدین احمد صاحب صدر مدرس دار العلوم دیوبند [2] اسی طرح شرح بخاری قسطلانی سے حضرت شیخ الاسلام بھی درس بخاری شریف دیا کرتے تھے۔

ہی قراۃ فرماتے لیکن کیا مجال قرأت میں ایک لفظ بھی شرح (قسطلانی) کا آجائے یا کوئی حرف بخاری کا رہ جائے۔ ایسا بھی اکثر ہوتا کہ آپ کی آنکھوں میں نیند کا غلبہ ہوتا اور آپ آنکھ بند کئے ہوئے قرأت فرماتے۔ ایک ایک ورق اسی طرح قرأت کرجاتے تھے۔ مگر کوئی حرف بھی نہیں چھوٹنے پاتا۔

یہ بھی عجیب اتباع ہے کہ سیدی وسندی ومولائی حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی بھی ہمیشہ قسطلانی سے درس بخاری شریف پڑھاتے تھے اور اتنی روانی سے قرأت فرماتے کہ ہم لوگ (جن کے پاس ہندوستانی چھاپہ کی بخاری ہوتی) سماعت میں موافقت نہیں کر پاتے تھے کتنی مرتبہ ہمیں سطریں چھوڑ کر آگے پڑھنا پڑتا تھا۔ اور کتنی مرتبہ ہم لوگوں نے حضرت کو آنکھیں بند کئے ہوئے قرأت کرتے دیکھا ہے یہ ہے "ظرف لبریز مدام گم نہ ہو" کا مصداق۔

حضرت مولانا سید فخر الدین احمد صاحب مدظلہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت شاہ صاحب سے سنا ہے کہ وہ فرمایا کرتے تھے کہ میں تو حضرت کا علم کی وجہ سے معتقد ہوں میں نے حضرت کے ساتھ نہ معلوم کتنی مرتبہ گھنٹوں مختلف علوم میں بات چیت کی لیکن میں نے حضرت کو ہمیشہ اپنے سے آگے آگے چلتے ہوئے پایا۔ میں نے ادب میں بھی حضرت سے بات چیت کی ہے میں ایک شعر پڑھتا تو حضرت اسی قسم کے دو شعر پڑھتے ایک عربی کا اور ایک فارسی کا اور کبھی ایک عربی کا اور ایک اردو کا۔ تب مجھے فیصلہ کرنا پڑا کہ حضرت سے کوئی ادب میں بھی سبقت نہیں لے جا سکتا۔

حضرت مولانا فخر الدین صاحب مدظلہ فرماتے ہیں کہ حضرت جب کبھی کسی مسئلہ پر کلام کرتے تو ہمیشہ یہ فرمایا کرتے تھے واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم، بات یوں معلوم ہوتی ہے۔

اور اس کے بعد سلسلہ شروع کر دیتے۔

سند حدیث

اگرچہ آپ کو حدیث میں حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب پانی پتی اور بلا واسطہ حضرت شاہ عبدالغنی صاحب سے بھی اجازت حاصل تھی لیکن آپ حلقہ درس میں اپنی سند اس طرح بیان فرمایا کرتے تھے۔

١- عن مولانا الشیخ محمد قاسم صاحب عن مولانا الشیخ عبدالغنی عن مولانا الشاہ محمد اسحٰق عن مولانا الشاہ عبدالعزیز عن مولانا الشاہ ولی اللہ دہلوی۔

٢- عن مولانا الشیخ احمد علی سہارنپوری عن مولانا الشاہ محمد اسحٰق عن مولانا الشاہ عبدالعزیز عن مولانا الشاہ ولی اللہ الخ

افتتاح حدیث کراتے وقت اسلاف کا یہی طریقہ رہا ہے اس لئے آپ بھی ہر سال پابندی سے اسی طریقہ پر قائم رہے۔

دارالعلوم کی صدر نشینی

ربیع الاول ١٣٠٢ھ میں دارالعلوم دیوبند کو حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب صدر مدرس مدرسہ عربیہ دیوبند کی وفات حسرت آیات کا جانکاہ صدمہ پیش آیا۔ مولانا کی شخصیت، شریعت و طریقت کو جامع تھی۔ آپ اپنے زمانہ میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے جانشین سمجھے جاتے تھے۔ ان کی وفات کے بعد حضرت مولانا سید احمد صاحب دہلوی (جو علوم عقلیہ کے ماہر تھے) کو چالیس روپے ماہوار صدر

مدرس منتخب کیا گیا اور ملا محمود صاحب دیوبندی ۳۵ روپئے ماہوار پر مدرس دوم اور حضرت شیخ الہند صاحب تیس روپئے ماہوار پر مدرس سوم اور مولانا عبدالعلی صاحب مدرس چہارم مقرر ہوئے۔

دو سال کے بعد حضرت ملا محمود صاحب کا انتقال ہو گیا تو حضرت شیخ الہند ان کی جگہ ۳۵ روپے مشاہرہ پر مدرس دوم مقرر ہو گئے جب ۱۳۰۵ھ میں حضرت مولانا سید احمد صاحب اپنی ذاتی ضروریات سے بھوپال تشریف لے گئے تو حضرت شیخ الہند کو ان کی جگہ مدرس اول مقرر کر دیا گیا۔ ویسے تو حضرت ۱۲۹۵ھ ہی سے درسیات کی بڑی کتابیں پڑھایا کرتے تھے۔ منطق، فلسفہ، علم معانی و بیان، تفسیر، حدیث، تمام علوم کو بلا تکان پڑھاتے تھے لیکن ۱۳۰۵ھ تا ۱۳۳۹ھ تقریباً ۳۴ یا ۳۳ سال آپ دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس اور شیخ الحدیث دونوں منصبوں کے تنہا مالک رہے۔

حضرت شیخ الہند نے ۱۲۹۵ھ تا ۱۳۳۹ھ کم و بیش ۴۴ سال دارالعلوم دیوبند کے ایک مستقل مدرس کی حیثیت سے دارالعلوم دیوبند کی خدمات انجام دیں اور تقریباً ۳۸ سال تو اس طرح پڑھایا کہ بجز چند اسفار کے کوئی سفر اختیار نہیں کیا۔ پڑھانے کے ساتھ ہی ساتھ آپ نے دارالعلوم دیوبند کی توسیع و ترقی کے لئے بیش از بیش خدمات انجام دیں۔ حقیقت یہی ہے کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نے جو بھی خاکہ اس مدرسہ کے لئے مرتب کیا ہوگا۔ اس کو مکمل کرنا اور دیوبند کے اس چھوٹے سے مدرسہ کو دارالعلوم دیوبند کی شکل دے کر اسلامی ممالک میں ممتاز مقام پر پہونچا دینا یہ صرف تنہا حضرت شیخ الہند کا کام تھا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور آپ کی مساعی جمیلہ کی وجہ سے اس مدرسہ میں آپ کے زمانے سے دوسرے ملکوں (کشمیر، پنجاب، سندھ،

افریقہ، افغانستان، بخارہ، سمرقند، تاشقند، برہما، رنگون، آسام، مدراس وغیرہ) کے طلبا آنے شروع ہو گئے تھے۔ اور یہاں کے فارغ طلبا عرب، حجاز، اور مذکورہ تمام ممالک میں پھیل کر یہاں کے نقطۂ نظر کے مطابق اشاعت دین کرنے لگے تھے۔ اگر ترقی ہی کی حیثیت کو سامنے رکھکر کسی کو بانی قرار دیا جا سکتا ہے تو یہ سعادت حضرت شیخ الہند کو بھی حاصل ہے لیکن دار العلوم دیوبند کے بانی ہونے کی سعادت حضرت سید حاجی عابد حسین صاحب کے لئے مخصوص کر دی گئی تھی۔ ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔

ممتاز تلامذہ

حضرت شیخ الہند کے تمام تلامذہ کی فہرست مرتب کرنا تو نہایت دشوار ہے۔ البتہ اس جگہ ان چند ممتاز تلامذہ کے اسماء گرامی درج کئے جاتے ہیں جو مشہور و متعارف ہیں۔

۱۔ حضرت سیدی و مرشدی حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی۔
۲۔ " مولانا اشرف علی صاحب تھانوی۔
۳۔ " علامہ بطل حریت عبید اللہ صاحب سندھی۔
۴۔ " علامہ انور شاہ کشمیری ۵۔ مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب۔
۶۔ " مولانا محمد میاں صاحب عرف مولانا منصور انصاری۔
۷۔ " مولانا حبیب الرحمٰن صاحب، سابق مہتمم دار العلوم دیوبند۔
۸۔ " مولانا سید احمد صاحب مدنی بانی مدرسہ شرعیہ مدینہ منورہ
۹۔ " مولانا اعزاز علی صاحب شیخ الادب۔
۱۰۔ " مولانا سید فخر الدین احمد صاحب صدر جمعیۃ علماء ہند و شیخ الحدیث۔

۱۱۔ مولانا عبدالسمیع صاحب مدرس دارالعلوم دیوبند۔
۱۲۔ " احمد علی صاحب مفسر قرآن لاہور
۱۳۔ " محمد صدیق صاحب مہاجر مدنی۔
۱۴۔ " محمد صادق صاحب کراچی ۱۵۔ مولانا عزیر گل صاحب
۱۶۔ " عبدالوہاب صاحب دربھنگہ
۱۷۔ " عبدالصمد صاحب رحمانی ۱۸۔ مولانا عبدالرحیم صاحب پوپلزئی[1]
۱۹۔ استاذی مولانا سید حامد حسن صاحب گنگوہی ثم نہٹوری۔
۲۰۔ مولانا رحمت اللہ صاحب نہٹوری
۲۱۔ حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی۔
۲۲۔ " " محمد الیاس صاحب بانیٔ تبلیغ۔
۲۳۔ مولانا احمد اللہ صاحب پانی پتی ۲۴۔ مولانا فضل ربی صاحب
۲۵۔ " محمد اکبر صاحب پشاوری
۲۶۔ جناب مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی شیخ انصاری

چند تصانیف

حضرت شیخ الہند کی زیادہ تصانیف تو نہیں ہیں اس لئے کہ ابتدائی پچیس تیس سال تو درس و تدریس میں مشغول رہے۔ اور اس کے بعد کی زندگی مجاہدانہ سرگرمیوں میں مصروف نظر آتی ہے تاہم جس قدر بھی آپ کی یادگار کتابیں ہیں جن کو ان ہی اوقات کے گوشوں میں لکھا گیا ہے۔ مختصر تعارف کے ساتھ درج کی جاتی ہیں۔

---

[1] علمائے حق ص۱۱۱ ج ا۔

۱. ادلہ کاملہ :- یہ حضرت کی سب سے پہلی کتاب ہے اس کا دوسرا نام اظہار حق ہے۔ اس کتاب کی وجہ تالیف یہ ہے کہ مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی نے مذہب حنفیہ پر اعتراض کرتے ہوئے ایک اشتہار شائع کیا تھا اور ہندوستان بھر کے حنفیوں کو چیلنج کر دیا تھا کہ رفع یدین، قرأت فاتحہ، آمین بالجہر، نفاذ قضا رقاضی وغیرہ۔ دس مسئلوں کو اگر کوئی حنفی عالم قرآن اور صحیح حدیث سے ثابت کرے تو ہر مسئلہ کے عیوض دس روپیہ انعام پائے۔

حضرت شیخ الہند نے اس چیلنج کو قبول کر لیا اور نہایت مدلل جواب تحریر فرمایا ساتھ ہی گیارہ اعتراضات غیر مقلدوں کے مسلک پر قائم کر دیئے جس کا آجتک کوئی جواب نہیں دے سکا۔ کتاب کی عبارت میں شوخی اور جوش ہے۔ غالباً یہ مولانا کے عنفوان شباب کی وجہ سے ہے[۱]

حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے فرمایا ہے کہ یہ رسالہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کی تصنیف ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ کیونکہ حضرت قاسم العلوم والخیرات کی تصانیف کی عبارتوں اور اس کتاب کی عبارت میں زمین و آسمان کا فرق ہے ہاں اس میں شک نہیں کہ یہ کتاب حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے مشورہ اور ان کے ایماء سے لکھی گئی انھوں نے اس کتاب کو سنا پھر یہ کتاب شائع ہوئی۔ حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب جو حضرت شیخ الہند کی حیات کے سوانح نگار ہیں اور حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب سے اقدم بھی ہیں اور ان کے استاذ بھی۔ تحریر فرماتے ہیں۔

حضرت مولانا نے استاذ مکرم کی اجازت و اشارہ سے قلم اٹھایا۔ اور

---

[۱] میاں اصغر حسین صاحب کی یہی رائے ہے ملاحظہ فرمایئے حیات شیخ الہند۔

اختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایسا جواب لکھا کہ قلم توڑ دیئے۔[1]

اس کے علاوہ حضرت شیخ الہند نے ایضاح الادلہ کے دیباچہ میں کوئی اشارہ اس طرف نہیں کیا جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ یہ کتاب حضرت قاسم العلوم والخیرات کی تصنیف ہے اگر ایسا ہوتا تو حضرت شیخ الہند نہایت فخر کے ساتھ اس کا اظہار فرماتے۔ میرے نزدیک یہ بھی ویسی ہی غیر ذمہ دارانہ بات ہے جیسی پہلی تھی۔

۲۔ ایضاح الادلہ: ادلہ کاملہ کے بعد یہ کتاب حضرت شیخ الہند کی دوسری کتاب ہے اور ادلہ کاملہ کے تھوڑے عرصہ بعد لکھی گئی ہے۔ ہوا یہ کہ غیر مقلدوں میں سے کسی نے ادلہ کاملہ کے رد میں مصباح الادلہ کتاب لکھ ڈالی۔ تب حضرت شیخ الہند نے ادلہ کاملہ کی وضاحت کرتے ہوئے مصباح الادلہ کا جواب دیا ہے۔ عبارت کے اندر وہی بات ہے جو ادلہ کاملہ میں ہے لیکن اس کے باوجود عبارت کا تسلسل، رنگینی حسب موقعہ اشعار کا موجود ہونا ساتھ ہی ساتھ تعریض بہت خوب ہے اور دلائل کی پختگی نے کتاب کو بہت بلند مقام پر پہونچا دیا ہے۔

سب سے پہلے یہ کتاب سنہ ۱۲۹۹ھ میں میرٹھ سے شائع ہوئی۔ دوسری مرتبہ سنہ ۱۳۳۰ھ میں حضرت مولانا میاں سید اصغر حسین صاحب نے اس کو شائع کیا۔ کتاب کے لکھنے کی ابتدا غالباً سنہ ۱۲۹۳ھ یا سنہ ۱۲۹۴ھ ہے۔ میاں اصغر حسین صاحب نے نشان دہی فرمائی ہے کہ اس وقت حضرت کی عمر ۲۵ سال کی تھی کیونکہ حضرت شیخ الہند کی پیدائش سنہ ۱۲۶۸ھ ہے اور ۲۵ سال سنہ ۱۲۹۳ھ میں پورے ہوتے ہیں۔ حضرت شیخ الہند نے ایضاح الادلہ کے دیباچہ میں تحریر فرمایا ہے۔

---

[1] حیات شیخ الہند ص۱۶۹۔

فقط تین یا چار دفعات کا جواب لکھا تھا کہ اتنے میں اس ضلع کے
مجمع علماء ربانین و مقتدایان دین و جماعت صالحین نے حج کا عزم فرمایا۔[1]
اور یہ زمانہ ۱۲۹۴ھ کا ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ ایضاح الادلہ کی ابتدا ۱۲۹۳ھ ہے
اور اس سے قبل ۱۲۹۲ھ ادلہ کاملہ کا سن تصنیف ہے۔

اس حج کے لئے حضرت شیخ الہند بھی تشریف لے گئے تھے ۱۲۹۵ھ میں اس قافلہ کی واپسی ہوئی اور حضرت قاسم العلوم والخیرات کی علالت کی وجہ سے یہ کام بند رہا کیونکہ حضرت شیخ الہند مولانا کی تیمارداری میں ہمہ تن مصروف رہتے تھے۔
۱۲۹۷ھ میں حضرت قاسم العلوم والخیرات کا وصال ہوگیا اور یہ کام تقریباً بند ہی کر دیا گیا تھا۔ کہ حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب نے اس کتاب کی تکمیل کی طرف توجہ دلائی جس کے نتیجہ میں یہ کتاب ۱۲۹۹ھ میں پہلی مرتبہ شائع ہوئی۔

۳۔ **احسن القریٰ**:۔ یہ رسالہ ایضاح الادلہ کے چودہ سال بعد یعنی ۱۳۱۳ھ میں لکھا گیا۔ یہ رسالہ حضرت گنگوہی کے رسالہ اوثق العریٰ کی وضاحت اور غیر مقلدوں کے علماء مولوی محمد سعید بنارسی اور مولوی محمد علی اعظمی کی تحقیقات کے رد میں لکھا گیا ہے اس کتاب میں ثابت کیا گیا ہے کہ گاؤں میں جمعہ کی نماز جائز نہیں ہے۔ میاں اصغر حسین صاحب نے اس رسالے کے تعارف میں تحریر فرمایا ہے۔

اس ضخیم کتاب کی عبارت مولانا کی تمام تصانیف سے زیادہ
شگفتہ اور سلیس و رواں ہے۔ مولانا کی مہذب ظرافت اور بذلہ سنجی
بہ نسبت دیگر تصانیف کے اس میں زیادہ نمایاں ہے۔[2]

---

[1] ایضاح الادلہ ص۴ [2] حیات شیخ الہند ص۱۸۲

حضرت شیخ الہند نے اس کتاب کے دیباچہ میں وجہ تالیف بیان فرماتے ہوئے تحریر فرمایا ہے۔

ان دنوں ایک فتویٰ دربارۂ صلوٰۃ جمعہ فی القریٰ کسی صاحب نے علماء کی خدمت میں پیش کیا۔ اور اس کا جواب اہل حدیث دہلی نے تحریر فرمایا جس کا خلاصہ یہ ہے۔ الخ

بالجملہ جب یہ فتویٰ بعض صاحبوں نے حضرت مطلع الانوار منبع الاسرار ذریعۂ مغفرت تہی دستاں وسیلۂ نجات درماندگان۔ رونق شریعت زینت طریقت سیدنا و مرشدنا مولانا الحاج رشید احمد صاحب بارک اللہ فی رشدہٖ وارشادہٖ کی خدمت میں بھیجا تو حضرت مولانا نے باوجود ضعف و معذوری و کثرت مشاغل مطابق مذہب حنفیہ فتویٰ مذکور کا جواب لکھوا دیا۔ الخ [۱]

اس کے بعد حضرت شیخ الہند نے مخالفین کے اعتراضات کا جواب اور اس مختصر رسالہ کی شرح احسن القریٰ کے نام سے لکھی جس کو سب سے پہلے حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب پدر بزرگوار حضرت مولانا محمد زکریا صاحب شیخ الحدیث نے اپنے کتب خانہ سے شائع فرمایا۔

اس کتاب کے آخر میں ضمیمہ کے طور پر ایک مختصر رسالہ التلمیح الی مفاسد التجمیع شامل ہے۔ اس رسالہ میں ایک صاحب مسمیٰ مولوی خدا بخش صاحب کے ان اعتراضات کا جواب دیا ہے جو انھوں نے اوثق العریٰ پر قائم کئے تھے۔

---

[۱] احسن القریٰ ص۲۔

عبارت کی لطافت حضرت شیخ الہند کی عبارت کا نمونہ اگرچہ مندرجہ بالا سطور میں گزر چکا ہے تاہم ایک آدھ نمونہ اور پیش کئے دیتے ہیں جس سے عبارت کی لطافت اور مزاح کی ظرافت کا بھی حال معلوم ہو جائے گا۔ مولانا تحریر فرماتے ہیں۔

> ہمارے مجیب یہ فرما رہے ہیں "جب دیکھا سنا تو یہی کہ حضرت مولانا اہل حدیث کے پیچھے پڑے رہتے ہیں" اجی صاحب یہ نہ فرمایئے کہ اہل حدیث کے پیچھے پڑے رہتے ہیں بلکہ یہ فرمایئے کہ آپ جیسے اہل حدیث خواہ مخواہ آگے آکھڑے ہوتے ہیں۔[1]

پوری کتاب کا یہی رنگ ہے یعنی دلائل اور براہین کے ساتھ جگہ جگہ چٹکیاں بھی لی گئی ہیں۔

۴۔ جہد المقل حضرت شیخ الہند کی تصانیف میں یہ رسالہ ایک مستقل شان کا مالک۔ سبب تصنیف اس کا یہ بتایا جاتا ہے کہ مولانا احمد حسن صاحب پنجابی نے امکان کذب کے مسئلہ میں حضرت شاہ محمد اسماعیل صاحب شہید اور ان کے معتقدین علماء کرام پر سخت ترین اعتراضات کئے تھے۔ حضرت شیخ الہند نے ان اعتراضات کا نہایت محکم اور مسکت جواب تحریر فرمایا۔ اس رسالہ کو حضرت نے عقلی اور نقلی دلائل کے امتزاج سے بہت اونچے مقام پر پہونچا دیا ہے۔ اہل علم کے دیکھنے کی کتاب ہے۔

۵۔ افادات یہ رسالہ حضرت شیخ الہند کے دو مضمونوں (ردّی اور اسکی عظمت۔ لا ایمان لمن لا امانۃ لہ) کا مجموعہ ہے یہ دونوں

---

[1] احسن القریٰ ص۸۔

مضمون القاسم کے ابتدائی شماروں ۱۳۲۸ھ اور ۱۳۲۹ھ میں شائع ہوئے تھے لیکن بقول حضرت شیخ الاسلام۔

حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ کے متوسلین کی عموماً اور میری خصوصاً دلی تمنا تھی کہ ان .... دونوں مضمون کو نہایت آب و تاب کے ساتھ شائع کیا جاوے سو بحمد اللہ یہ تمنا پوری ہوئی۔[1]

افادات محمود کو (۱۳۵۲ھ) میں کتب خانہ اعزازیہ نے شائع کیا تھا عبادت کی روانی و لطافت اور حسب ضرورت اشعار کی رنگینیت نے ایک عظیم علمی کارنامے کو باغ و بہار بنا دیا ہے۔

۶۔ الابواب والتراجم

بخاری شریف کے ابتدائی چند تراجم ابواب کی مختصر شرح ہے۔ اور اسارت مالٹا کی یادگار ہے مولانا عزیز گل صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

قطب العالم حضرت مولانا شیخ الہند کی یادگار اسیری میں کی پہلی تصنیف جو شائع کی جاتی ہے وہ کتاب الابواب والتراجم ہے۔[2]

کتاب کی خوبی اور اس کے کمالات کا تعارف ہمارے امکان سے باہر ہے اس کے آخر میں حضرت شیخ الہند کے قلمی مسودات میں سے ایک مسودہ جس میں بخاری شریف کے ابواب کی عالمانہ فہرست مرتب کی گئی ہے۔ منسلک ہے حضرت شیخ الاسلام نے اس کے متعلق تحریر فرمایا ہے۔

یہ رسالہ اس ناتمامی کی حالت میں بھی اگر بدر کامل کا کام نہ دیگا

---

[1] دیباچہ افادات محمود [2] ضروری اعلان۔

تو وہ ماہ دہ روزہ ضرور ثابت ہوگا۔[۱]

۷۔ کلیاتِ شیخ الہند

حضرت شیخ الہند کے منظوم کلام کا مجموعہ ہے جس کو حضرت مولانا میاں اصغر حسین صاحب نے شائع فرمایا تھا۔ یہ کتاب صرف ایک مرتبہ طبع ہو کر نایاب ہو چکی ہے۔ اس کتاب کے پڑھنے سے حضرت شیخ الہند کا استاد سخن ہونا بھی ظاہر ہوتا ہے۔

۸۔ حاشیہ مختصر المعانی

مختصر المعانی کا یہ حاشیہ مالک مطبع مجتبائی نے حضرت شیخ الہند سے کہہ کر لکھوایا تھا۔ سب سے پہلے ۱۳۲۴ھ میں یہ کتاب منظر عام پر آئی۔ اس کے بعد اسی مطبع سے تین چار مرتبہ شائع ہوئی اس کے بعد بھی اس حاشیہ کے ساتھ یہ کتاب کمیاب ہونے لگی تو ۱۳۷۴ھ میں مکتبہ امدادیہ نے اس کو شائع کیا۔ اب بسہولت یہ کتاب دستیاب ہو جاتی ہے۔

۹۔ تصحیح ابی داؤد

حضرت شیخ الہند کو احادیث رسول سے جو خاص شغف تھا اسی وجہ سے آپ نے فن حدیث کی مختلف عنوانات سے خدمت کی۔ فہرست الابواب والتراجم اگرچہ لفظاً ہر ایک فہرست ہی ہے لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو اس میں حضرت شیخ الہند کا نہایت عمیق مطالعہ جھلکتا ہے۔

صحاح ستہ میں ابوداؤد شریف بھی نہایت اہم کتاب ہے۔ محدثین کرام نے اسکو نہایت احتیاط اور اہتمام سے پڑھایا ہے۔ حضرت شیخ الہند نے بھی برسوں اس کا درس دیا ہے۔ اثنائے درس میں آپ کو کتابت اور اختلاف عبارات کی خامیاں معلوم ہوئیں تو آپ نے فراغت درسی کے بعد یہ اہتمام کیا کہ چند ذی استعداد طلبا کو اپنے سامنے

---

[۱] رسالہ مذکور ص ۶۹۔

دکاکر مختلف نسخوں سے عبارت کے اختلاف کو ختم کیا اور ابوداؤد شریف کا ایک صحیح ترین نسخہ ترتیب دیدیا۔ جس کو مولانا عبدالاحد صاحب نے ۱۳۱۸ھ میں اپنے مطبع مجتبائی سے شائع کیا۔ ناشر نے کتاب کے آخر میں تحریر فرمایا ہے۔

اور پھر خاکسار نے عمدۃ العلما۔ قدوۃ الاذکیا ماہرفن مولانا مولوی محمود حسن صاحب مدرس اعلیٰ مدرسہ عالیہ دیوبند سے اس کی تصحیح کا کام لیا۔ صحت کے لئے اکثر مطبوعہ اور غیر مطبوعہ قدیم نسخے جمع کئے گئے۔ خاص کر وہ نسخے جو گذشتہ اور موجودہ بڑے بڑے محدثین کی درس و تدریس میں سالہا سال رہ چکے ہیں۔[1]

ظاہر ہے کہ یہ کام اپنی تصنیف سے کہیں زیادہ دشوار ہے۔ بحمداللہ ۱۳۱۸ھ کا اصل نسخہ میرے پاس موجود ہے۔

۱۰۔ فتاویٰ

حضرت شیخ الہند ہمیشہ اس اہم کام سے مجتنب رہے تاہم دارالعلوم دیوبند سے جاری ہونے والے تمام فتاویٰ پر الجواب صحیح کے بعد آپ کے دستخط ضرور ہوتے۔ بعض اہم سوالات کے جوابات آپ نے مکتوبات کے رنگ میں مکتوب الیہم کو دیئے ہیں۔ افسوس کہ حضرت شیخ الہند کے مکتوبات شائع نہیں ہو سکے۔ میرے پاس حضرت شیخ الہند کا ایک فتویٰ جنگ بلقان اور اوقاف کے متعلق ہے اس کو ان شاءاللہ آئندہ کسی خاص عنوان کے تحت درج کر دیا جائے گا۔

---

[1] عرض ناشر ابی داؤد۔

۱۱۔ ترجمہ قرآن شریف

حضرت شیخ الہند کا یہ بہت بڑا علمی کارنامہ ہے جس کی افادیت اور عمومیت ہندوستان کی حدود کو متجاوز ہو گئی ہیں اور اب یہ مبارک تحفہ دنیا کے چپہ چپہ پر موجود ہے اسلئے ہم چاہتے ہیں کہ اس کی تاریخ ذرا تفصیل سے بیان کریں۔ حضرت شیخ الہند نے اس ترجمۂ قرآن پاک کی وجہ تصنیف یا تالیف بیان کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے۔

> بعض احباب و مکرمین نے بندہ سے درخواست کی کہ قرآن پاک
> کا ترجمہ سلیس اور مطلب خیز اردو زبان میں مناسب حال اہل زمانہ
> کیا جائے جس سے دیکھنے والوں کو فائدہ پہونچے[1]

تقضا حضرت شیخ الہند اپنی مصروفیات کی وجہ سے ٹالتے رہتے آتا ہی اہل علم کا اصرار بدستور جاری رہا الحاصل آپ نے ربیع الاول ۱۳۲۷ھ کو ترجمہ قرآن مجید کی ابتداء فرمائی اس وقت آپ دارالعلوم دیوبند میں مقیم تھے۔ درس و تدریس اور ارشاد و تلقین سے جس قدر وقت باقی بچتا آپ ترجمہ قرآن پاک پر صرف فرماتے تھے اس طرح ۲۵ جمادی الثانی ۱۳۳۰ھ تک سوا تین سال میں دس پاروں کا ترجمہ کیا۔

۱۳۳۳ھ کو آپ نے عزم بیت اللہ فرمایا اور وہاں سے آپ کو گرفتار کر کے مالٹا بھیجدیا گیا وہاں آپ ۹ ہر ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ کو پہونچے اور شوال ۱۳۳۵ھ کو آپ نے پھر قرآن پاک کے ترجمہ کا کام شروع کر دیا۔ صبح کو اوراد و وظائف سے فارغ ہو کر دن کے اول حصہ میں آپ قرآن پاک کا ترجمہ یا اس پر نظر ثانی کرتے اور جہاں کہیں بحث طلب مقامات آتے وہاں اپنے رفقاء جیل شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد

---

[1] مقدمہ ترجمہ قرآن شریف۔

صاحب مدنی، مولانا عزیر گل صاحب سے گفتگو اور تبادلِ خیال کرتے اس طرح ایک سال کی قلیل مدت میں بقیہ بیس پاروں کا ترجمہ ۲۰ شوال ۱۳۳۶ھ کو اختتام پذیر ہوا۔ اس کے بعد ترجمہ کے حواشی اور فوائد لکھنا شروع کئے۔ ابھی آپ سورۂ نساء تک حواشی لکھ پائے تھے کہ ۲۲ ربیع الثانی ۱۳۳۸ھ کو آپ کو قیدِ فرنگ سے آزادی ملی اور آپ ہندوستان تشریف لے آئے۔

جس وقت آپ واپس تشریف لا رہے تھے تو سمندر میں بے پناہ طوفان آیا اور جہاز کی سلامتی کی کوئی امید باقی نہ رہی۔ تب آپ نے قرآن پاک کے اس مسودہ کو محفوظ کرکے حضرت مولانا عزیر گل صاحب کے سینہ سے بندھوا دیا اس وجہ سے کہ وہ تیرنا جانتے تھے اور فرمادیا کہ اگر تم بچ گئے تو ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اس ترجمہ کی اشاعت کا کوئی بندوبست فرمادے۔ حضرت شیخ الہند نے اس ترجمہ کا تعارف کراتے ہوئے تحریر فرمایا ہے۔

اس لئے اس ننگ خلائق کو یہ خیال ہوا کہ حضرت شاہ صاحب ممدوح کے مبارک مفید ترجمہ میں لوگوں کو جو کل دو غلجان ہیں یعنی ایک بعض الفاظ و محاورات کا متروک ہوجانا دوسرے بعض بعض مواقع میں ترجمہ کا مختصر ہوجانا جو اصل میں تو ترجمہ کی خوبی تھی مگر ابنائے زمانہ کی سہولت پسندی اور مذاقِ طبیعت کی بدولت اب یہاں تک نوبت آگئی جس سے ایسے مفید و قابلِ قدر ترجمے کے متروک ہونیکا اندیشہ ہوتا ہے۔ سو اگر غور و احتیاط کے ساتھ ان الفاظ متروکہ کی جگہ الفاظ مستعملہ لے لئے جائیں اور اختصار و اجمال کے موقعوں کو بقدر ضرورت کے ساتھ کوئی مختصر لفظ زائد کرکے کچھ کھول دیا جائے تو پھر انشاء اللہ

حضرت شاہ صاحب کا یہ صدقہ فاضلہ بھی جاری رہ سکتا ہے اور مسلمانان ہند بھی ان فوائد مخصوصہ سے خالی نہ رہ جائیں گے. اس مضمون کو سوچ سمجھ کر جو اپنے مکرمین و مخلصین کی خدمت میں پیش کیا تو ان حضرات نے بھی اس عاجز کی رائے سے اتفاق ظاہر فرمایا۔[1]

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت شیخ الہند نے بجائے جدید ترجمہ کرنے کے حضرت شاہ عبدالقادر صاحب کے ترجمہ کی حفاظت فرمائی اور زیر ترجمہ الفاظ کو بجا ہر بدلباس عطا کردیا. اسی نقطۂ نظر کو حضرت نے فوائد و حواشی میں بھی ملحوظ رکھا ہے۔

تاریخ طباعت

حضرت مولانا مجید حسن صاحب نے عرض ناشر میں بیان فرمایا ہے۔ ۱۲ ذیقعدہ ۱۳۴۰ھ مطابق ۲۸ جولائی ۱۹۲۲ء کو میری قسمت کا ستارہ چمکا اور بصد مشکل حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے ورثاء سے اس دولت دارین کو باضابطہ طور پر حاصل کرنے میں کامیاب ہوا. مشتاق نگاہیں بیتاب تشنہ کامان ہدایت مضطرب اور تقاضے شدید تھے اس لئے فوراً ہی پہلے اڈیشن کی طباعت کا انتظام ۱۹۲۵ء میں) شروع کر دیا گیا تھا اور ۲۶ پاروں کے حواشی جو حضرت شیخ الہند اپنی حیات میں پورے نہ فرما سکے تھے ان کی جگہ حضرت شاہ عبدالقادر صاحب کے حواشی سے پر کردی گئی تھی جو بہت مختصر تھے مگر اب دوسرے اڈیشنوں میں اس کمی کو حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی کے ذریعہ پورا کرا کر شائع کیا جا رہا ہے۔

---

[1] مقدمہ ترجمہ قرآن شریف۔

مولانا مجید حسن صاحب مالک اخبار مدینہ متقی، پرہیزگار اور پرانی وضع کے سچے اور پکے مسلمان ہیں۔ ہوا یہ تھا کہ حضرت شیخ الہند کے وصال (۱۳۳۹ھ) کے بعد مولوی محمد حسن صاحب نے ایک خواب دیکھا تھا جس کی تعبیر جناب نصر اللہ خاں عزیز سابق ایڈیٹر مدینہ نے یہ دی تھی کہ حضرت شیخ الہند کا ترجمہ قرآن پاک رکھا ہے۔ آپ کسی طرح اس کو طبع کرائیں۔ یہ تعبیر سنکر مولوی صاحب موصوف کو لگن لگ گئی، چنانچہ دیو بند پہونچ کر کسی نہ کسی طرح مبلغ سات ہزار روپے میں باضابطہ حضرت شیخ الہند کے ورثاء سے یہ ترجمہ حاصل کیا۔

جیسا کہ مولوی صاحب موصوف نے عرض ناشر میں بیان فرمایا ہے کہ اس ترجمہ قرآن کو اولاً موضح القرآن فوائد حضرت شاہ عبد القادر کے ساتھ شائع کیا۔ مولوی صاحب نے یہ نسخہ نہایت اہتمام سے شائع کیا۔ طباعت کی نزاکتیں و لطافتیں اور رنگینیوں کو اس اشاعت میں داخل کر دیا۔ (میں نے بذات خود اس عظیم نسخہ کو دیکھا اور پڑھا ہے) لیکن مولوی صاحب کی امنگیں جولانیوں پر تھیں۔ وہ اس ترجمہ کو اس کے شایان شان فوائد کے ساتھ شائع کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ بعد مشورہ کے یہ طے پایا کہ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی سے بقیہ ۲۶ پاروں کے فوائد لکھوائے جائیں۔ چنانچہ حضرت موصوف کو اس کام کے لئے آمادہ کیا گیا۔ اور دو سو روپے فی پارہ ان کے معاونین کار کے لئے مقرر کر دیئے گئے لیکن افسوس کہ حضرت موصوف اپنی سیاسی اور درسی مصروفیات کی وجہ سے دو سال تک ایک پارے کے فوائد بھی نہ لکھ سکے تب حضرت نے مولوی مجید حسن صاحب کے پاس جاکر دو سال کی رقم واپس کر دی اور عذر پیش کر دیا۔ اس کے بعد تحریر فوائد کے لئے حضرت مدنی کے مشورے سے مولانا عبد الرحمٰن صاحب

مفسر امروہی کا انتخاب عمل میں آیا۔ مولوی مجید حسن صاحب اور آغا رفیق کشمیری ایڈیٹر دونوں امروہہ گئے اور مولانا کو اس کام کے لئے آمادہ کیا۔ جب مولانا دو پاروں کے فوائد تحریر فرما چکے تو بعض مخالفین اور درانداز وں نے کام میں رکاوٹ پیدا کر دی جس کی بنا پر...... مولانا موصوف نے تحریر فوائد کا کام بند کر دیا۔ مولانا مجید حسن صاحب نے ہر چند کوشش کی لیکن مولانا عبدالرحمٰن صاحب آئندہ تحریر کے لئے کسی طرح آمادہ نہ ہوئے۔

سطور ذیل میں مولوی مجید حسن صاحب کا ایک مکتوب بنام مولانا عبدالرحمٰن صاحب پیش کیا جا رہا ہے جس سے تحریر فوائد کے معاملہ میں کافی روشنی پڑتی ہے۔ یہ مکتوب جناب مولانا نسیم احمد صاحب فریدی امروہوی کے ذریعہ مجھے دستیاب ہوا ہے انہی کے شکریہ کے ساتھ اس کو اس جگہ پیش کر رہا ہوں۔

مکتوب مولوی مجید حسن صاحب

دفتر مدینہ بجنور۔ یوپی ہندوستان

۲۷ر جولائی ۱۹۲۸ء

مولانا المحترم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مزاج گرامی! والا نامہ نے شرف صدور بخشا۔ پڑھ کر رنج اور افسوس ہوا۔ معلوم نہیں کس درانداز نے آپ سے یہ کہہ دیا کہ فوائد مفید عام اور پسند نہیں۔ ممکن ہے کہ یہ کارروائی کسی مخالف کی ہو اور مدینہ کے کام میں روڑا اٹکانے کے خیال سے ایسا کیا گیا ہو۔ بہر نوع میرا اور کسی متعلق شخص کا ہرگز یہ خیال نہیں ہے کہ فوائد پسندیدہ نہیں

ہیں۔ مولانا! میں قرآن مجید کی جو خدمت کر رہا ہوں خدا بہتر جانتا ہے۔ وہ خالصتاً لوجہ اللہ ہے۔ قرآن مجید کی موجودہ اشاعت پر پچاس ہزار روپے خرچ آیا ہے۔ اس حساب سے دس روپے فی کلام مجید غیر مجلد لاگت ہوتی دو روپے جلد سازی پر فی کلام مجید صرف ہوتا ہے گویا بارہ روپے فی کلام مجید مصارف آئے ہیں اور پندرہ روپے میں ہدیہ کیا جا رہا ہے اور تین روپے فی کلام مجید کا منافع۔ اس وقت حمائل شریف کی تیاری پر صرف ہو رہا ہے۔ اس سے آپ میری ذاتی اغراض اور شخصی منافع کا حال معلوم فرما سکتے ہیں۔ حقیقت حال یہ ہے کہ میرے ذاتی منافع کا تعلق دوسرے کاروبار سے ہے قرآن مجید سے نہیں اور میں اس خدمت کو خالصتاً لوجہ اللہ انجام دے رہا ہوں اور آپ نے بھی یہی فرمایا تھا کہ خالصتاً لوجہ اللہ تحریر فوائد کا کام کروں گا۔ غرض دونوں کی نیت اور غرض ایک ہی ہے اور الاعمال بالنیات کے فرمان رسول کے مطابق میری اور آپ کی یہ خدمت یقیناً عاقبت میں انجام بخیر ہونے کی ضامن ہوگی پھر معلوم نہیں آپ خدا کے کام میں کسی کی رخنہ اندازی سے کیوں متاثر ہوتے ہیں۔ مولانا! دراندازوں کا حال مجھ کو اچھی طرح معلوم ہے مولانا حسین احمد صاحب کے فوائد لکھنے میں بھی لوگ مزاحم ہوئے۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ آپ پر بھی اثر ڈالا جا رہا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ دراندازوں کا یہ فعل کہاں تک حق بجانب ہے جبکہ میں اور آپ دونوں خلوص کے ساتھ خدا کے کام میں مصروف ہیں گویا یوں کہنا چاہیئے کہ یہ لوگ میرے اور آپ کے کام میں نہیں خدا کے کام میں دراندازی کر کے اس کو روکنا چاہتے ہیں لیکن مجھ کو خدا پر کامل بھروسہ ہے اور کامل یقین ہے کہ وہ اپنا کام اپنے بندوں سے لے گا اور کام ضرور تکمیل کو پہونچے گا۔ خواہ درانداز کتنی ہی دراندازی کریں یدون

نبطفو نوراللہ

مولانا جس مکاتبت کا حوالہ آپ نے دیا ہے اس میں کبھی یہ ظاہر نہیں کیا گیا کہ
فوائد پسندیدہ نہیں بلکہ جو کچھ لکھا ہے۔ خدا بہتر جانتا ہے محض خادمانہ مشورہ تھا جو
آپ کے ارشاد کے مطابق پیش کیا گیا تھا۔ اور آپ کے وسیع اخلاق کو پیش نظر رکھکر
عرض کیا گیا تھا ورنہ اس کی ضرورت بھی نہ تھی۔ اب رہا خدمت و اعانت کا مسئلہ۔ مولانا
معاف کیجئے! میں آپ کے مافی الضمیر یا طبیعت کے خلاف اس بحث کو چھیڑ رہا ہوں۔
واقعہ یہ ہے کہ انسان حوائج دنیا سے مجبور ہے اور اس مجبوری کا مجھ کو کافی احساس ہے
اور میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ آئندہ مستقل طور پر خدمت کرتا رہوں گا۔ اور افکار و حوائج
سے پریشان نہ ہونے دوں گا اس وقت تک اس معاملہ میں جو فروگذاشت ہوئی وہ
واللہ باللہ کسی خاص وجہ سے نہ تھی اور نہ تساہلی اس کا سبب تھا بلکہ بعض کاروباری
پریشانیاں تھیں۔ انشاء اللہ آئندہ خدمت میں کوتاہی نہ ہوگی۔ مولانا! آپ خدا کا
کام کر رہے ہیں۔ اچھا کام کر رہے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ مفید اور بہترین کام کر رہے
ہیں کسی کی دراندازی سے متاثر نہ ہو جیئے۔ میں آپ کے فوائد کو خاص وقعت دیتا ہوں
ورنہ حقیقت حال یہ ہے کہ متعدد اہل علم مشاہیر نے خود اس کے اتمام کی تحریک کی اور
جلد اتمام کو پہونچانے کا وعدہ کیا لیکن میری نظر میں جو وقعت آپ کی ہے اور جو اعتماد
آپ پر مجھ کو ہو سکتا ہے وہ کسی دوسرے پر نہیں اس لئے میں نے آج تک کسی دوسرے
سے کام نہیں لیا۔ آپ بھی اسی طرح مجھ پر کامل اعتماد رکھئے جس طرح میں آپ پر بھروسہ
رکھتا ہوں۔ اور بے تکلف اپنی ضروریات سے مجھ کو آگاہ فرما دیا کیجئے۔ میں انشاء اللہ
خدمت کروں گا آپ خدا کا کام کر رہے ہیں خدا پر آپ کو کامل بھروسہ ہے اس لئے

یقین رکھیے کہ

خدا خود میر سامان است ارباب توکل را

آپ خدا کا کام کریں اور خدا آپ کا کفیل نہ ہو ناممکن۔ ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین ..... قل من یرزقکم من السماء والارض ..... مولانا میں پھر عرض کرتا ہوں کہ آپ بہترین کام کر رہے ہیں اور کبھی میرے قلب میں ایک لمحہ کے لئے بھی یہ خطرہ پیدا نہیں ہوا کہ آپ کے فوائد پسندیدہ نہیں۔ رہا اب وہ مشورہ جو وقتاً فوقتاً تحریری یا زبانی دیا گیا وہ محض آپ کے ارشاد کے مطابق تھا۔ اور خادمانہ مشورہ۔ بہر نوع اس کام میں جو خالصتہً لوجہ اللہ کیا جا رہا ہے آپ دراندوزونکی باتوں میں نہ آیئے۔ اس کام کو میرا کام نہ سمجھئے خدا ہی کا کام خیال فرمایئے۔ اور پھر یہ رائے قائم کیجئے کہ اس میں مزاحم ہونے والے لوگ خدا کے نزدیک کون ہو سکتے ہیں یہ خدا کا کام ہے ہو کر رہے گا خداوند بزرگ و برتر جس خادم ملت کو اس کام پر مامور فرمائے گا وہ اس خدمت کی سعادت کو حاصل کرے گا۔ خدا ہی کا کام ہے خدا ہی کام لینے والا ہے نہ میرے بس کا ہے نہ کسی دوسرے کے۔ خدا کا کام رکا نہیں کرتا وہ اپنے کام اپنے معمولی بندوں سے بھی لے لیتا ہے۔ شرح صدر عنایت فرماتا ہے اور کام کی توفیق دیتا ہے کام ہو جاتا ہے دنیا میں سینکڑوں مثالیں اس قسم کی موجود ہیں ممکن ہے خدا نے یہ خدمت آپ ہی کے حصہ میں رکھی ہو۔ آپ قلبی اور انسانی وساس سے متاثر نہ ہو جیے۔ خدا کے اس کام سے گریز نہ فرمایئے۔ پھونکیں مارنے والوں کی پرواہ نہ کیجئے اور ہمہ وقت ذات باری پر بھروسہ رکھئے لیکن خدانخواستہ اگر دراندازوں کی جدوجہد آپکے ارادوں اور خدمت دین الہی کے سچے جوش پر غالب آجائے تو میں یہ سمجھوں گا کہ یہ خدمت کسی

اور کے حصہ میں ہے اور یہ سعادت کسی دوسری ہستی کو حاصل ہوگی۔ اس صورت میں میری کوشش غیر مفید ہوگی اور در اندازکامیاب خدا کا کام پھر بھی ہوگا اور ضرور ہوگا اور وہ کسی دوسری ہستی کو مامور فرمادے گا۔ مولانا! آپ وساوس کو قلب میں پیدا نہ ہونے دیں اور در اندازوں کی پھونکوں کی پرواہ نہ کریں اور کام کئے جائیں جہاں تک میرا خیال ہے یہ خدمت آپ ہی کے حصہ میں آئی ہے اور آپ ہی اس کو انجام دیں گے۔ وساوس کے امتحانات اس کا ثبوت ہیں۔ امتحان میں ثابت قدم رہیئے۔ استقلال کی ضرورت ہے الا ان حزب اللہ ھم الغالبون کو پیش نظر رکھئے۔ آخر میں عرض ہے کہ عنقریب چند خزف ریزے حاضر کئے جائیں گے اور ضرورت ہوئی تو میں خود ہی حاضر ہوں گا۔ مجید حسن مالک اخبار مدینہ بجنور یو پی۔ از طرف آغا رفیق سلام مسنون عرض ہے مضمون واحد۔ دیوبند سے کتابیں آگئی ہیں عنقریب پیش کر دونگا۔

الحاصل۔ مولانا عبدالرحمٰن صاحب کسی طرح راضی نہ ہوئے تب حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد صاحب مدنی کے مشورے سے یہ کام حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کے سپرد کیا گیا۔ حضرت علامہ نے فرمایا کہ مجھے تو اس کام پر معاوضہ لینے کی ضرورت نہیں ہے البتہ میرے دو معین کار ہوں گے ان کی مدد کرنا ہوگی چنانچہ دو سو روپیہ فی پارہ کے حساب سے کام شروع کرایا گیا۔ حضرت علامہ موصوف نے ہر مہینہ میں ایک پارے کے فوائد تیار کر کے بھیجنا شروع کر دیئے اس طرح دو سال دو مہینہ میں فوائد مکمل ہوئے۔

اس کے بعد قرآن کی کتابت کا نمبر آیا تو ہندوستان کے مایۂ ناز کاتبوں کی کتابت کے نمونے منگائے گئے۔ مولوی صاحب موصوف چونکہ خود بھی بہت اچھے کاتب ہیں

اس لئے بہت دیکھ بھال کے بعد عربی خط کے لئے جناب محمد قاسم صاحب انبالوی کو۔ اور اردو خط کے لئے جناب منشی عبدالقیوم خاں صاحب مرادآبادی کو منتخب کیا اور کام شروع کرا دیا گیا۔

اس کے بعد نہایت رقم کثیر صرف کر کے بلاک تیار کرائے گئے اور مل سے اسپیشل سائز کا کاغذ تیار کرایا گیا۔ مشین پر کام کرنے والے تمام ملازمین کو حکم تھا کہ وہ ہر وقت باوضو رہیں۔ مولوی صاحب سے بڑھ کر ان کی اہلیہ محترمہ مرحومہ نے اس قرآن پاک کی طباعت سے خاص دلچسپی رکھی۔ ہر وقت ان ملازمین کے کھانے پینے، ناشتہ دودھ وغیرہ کا انتظام کیا۔ گویا بڑے لاڈ۔۔۔ پیار اور الحمد آمین کے بعد یہ قرآن پاک طبع ہوا۔ جس وقت یہ قرآن پاک طبع ہو چکا تو حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی حضرت شیخ الہند کے فوائد بقدر دو پاروں کے اور لائے لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ اب بھی یہ مسودہ موجود ہے خدا کرے اسکی طباعت کا انتظام ہو جائے۔

متوسط سائز کی طباعت کے بعد حمائل شریف اور اس کے بعد بڑے سائز کے قرآن پاک کی طباعت کا نمبر آیا۔ ان کے بلاک تیار کرائے گئے۔ غرضکہ مولوی صاحب موصوف جو کچھ کماتے رہے اس کے بیشتر حصہ کو اسی قرآن کی نشر و اشاعت پر صرف کرتے رہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت شیخ الہند کے ترجمہ کا یہ قرآن پاک دنیا کے گوشہ گوشہ میں پہونچ گیا اور اس ادارہ مدینہ کی شہرت میں چار چاند لگا دینے کا باعث بنا۔
تقسیم ہند کے بعد پاکستان والوں نے پہلے تو اس کو ہانگ کانگ میں طبع کرایا۔ اور پھر خود پاکستان ہی میں چھاپنا شروع کر دیا۔ پاکستان نے اس کی طباعت کا یہاں تک اہتمام کیا اور طباعت میں اس کو اس مقام پر پہونچا دیا کہ اب یہی قرآن پاک

پاکستان کا قومی تحفہ قرار دیدیا گیا۔ افغانستان نے بھی اس قرآن پاک کا فارسی ترجمہ کرا کر نہایت آب و تاب کے ساتھ شائع کیا۔ حاصل یہ ہے کہ دنیائے طباعت و اشاعت میں جتنی عمومیت اور مقبولیت اور شہرت اس ترجمہ قرآن پاک اور فوائد عثمانی کو حاصل ہوئی کسی دوسری کتاب کو نہیں۔ یہ قرآن پاک جہاں ایک پھوس کے جھونپڑے میں ملتا ہے وہاں شہنشاہوں کے محلات کی بھی زینت بنا ہے اور یہ سب کچھ حضرت شیخ الہند کے خلوص کا نتیجہ ہے اور موصوف کی یہ اتنی بڑی کرامت ہے کہ اولیاء عظام کی کراماتوں کی فہرست میں سرفہرست مقام حاصل کرنے کی مستحق ہے۔

۱۲۔ مکتوبات شیخ الہند

حضرت شیخ الہند نے اپنے متعلقین کو بکثرت خطوط لکھے تھے۔ جن میں علمی، سیاسی قسم کے اہم امور کا تذکرہ ہے۔ وہ مکتوب آج بھی بہت سے حضرات کے پاس تبرکاً موجود ہیں۔ بہیں افسوس ہے کہ ملک و قوم کی یہ گرانقدر امانت ضائع ہو رہی ہے۔

جہاں تک راقم سطور کی محنت اور کوشش کا تعلق ہے تو راقم نے متعدد حضرات، اخبارات، رسائل سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر چند مکتوبات کو اس کتاب کے آخر میں شامل کر دیا ہے۔

سلوک اور تصوف

انسان فطری طور پر اپنے اندر لیسے اخلاق و عادات اور جواہر لطیف رکھتا ہے کہ اگر ان کو ماحول اور معاشرے کی آلودگیوں سے محفوظ رکھا جائے تو وہ ہمیشہ اسی صراط مستقیم کی طرف قدم بڑھاتا ہے جو اس کے لئے خالق کائنات نے مقرر فرما دی ہے جناب رسول صلعم نے ارشاد فرمایا ہے۔

انما الولد یولد علی الفطرة	بچہ اپنی فطرۃ اصلیہ پر پیدا ہوتا
فابواہ یھودانہ او ینصرانہ	اسکے ماں باپ اسکو یہودی یا نصرانی
او یمجسانہ۔ (الحدیث)	یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔

چنانچہ جتنے اخلاق رذیلہ ہیں ان کی کم تر سے کمتر اور بدتر سے بدتر صورت ماحول اور معاشرے کی پروردہ ہے مثلاً فطرت انسانیہ کا تقاضہ تو یہ ہے کہ وہ صرف اپنی کسب سے مستفید ہو اور دوسروں کے کسب پر نظر نہ رکھے لیکن اس کے خلاف، چوری، ڈاکہ زنی قطع طریق، طراری، نباشی، سود، سٹہ، کسب مال کی تمام بدترین صورتیں انسان اپنے ماحول و معاشرے سے متاثر ہو کر اختیار کرتا ہے۔

اسی طرح اطوار خوش اور اخلاق پسندیدہ کا مظاہرہ انہی شخصیتوں سے ہوتا ہے کہ جن کی تربیت صالح ترین ہاتھوں میں ہوئی ہے۔ کیونکہ مبدائے فیاض کے عطا کردہ جواہرات جب نمو پذیر ہوتے ہیں تو وہ اپنی لطافت و نزاکت کے باعث مربیانہ

ماحول و معاشرے کے اثرات جلد قبول کر لیتے ہیں۔ جیسا کہ کوئی شجر نو خیز اپنے نمو کے وقت راہ میں آڑ پا کر اپنی بڑھوتری کے لئے راہ کج اختیار کر کے ٹیڑھا ہو جاتا ہے ورنہ سیدھا چل کر برگ و بار لاتا ہے۔

اسلام اور تعلیمات اسلام کا صرف یہی منشا ہے کہ انسانی دل و دماغ نے جب اپنے نمو کے وقت ماحول سے متاثر ہو کر جو اخلاق رذیلہ اور اطوار ناپسندیدہ اختیار کر لیئے تھے کہ جنھوں نے اپنے عروج پر پہونچ کر کفر و شرک، یہودیت، نصرانیت دہریت، فسق و فجور، عصیان و طغیان کی صورتیں اختیار کر لی تھیں۔ ان سب کو ملیا میٹ کر دیا جائے۔ اور فطری اخلاق کے اوپر سے ان سیاہ ترین تودوں کو کھرچ دیا جائے تاکہ یہ اخلاق پلٹ کر اپنی فطری راہ (جس کو صراط مستقیم کہا جاتا ہے) پر گامزن ہو جائیں۔

دل بدل جاتے ہیں تعلیم بدل جانے سے

چونکہ ان فطری اخلاق و عادات میں ایک قسم کی نورانیت ہے لہٰذا جب ان کو صالح ترین معاشرہ نیک ترین مربی مل جاتے ہیں تو ان کی نورانیت کا پاور بڑھ جاتا ہے گویا یہ سب چیزیں ان اخلاق کے نئے پاور ہاؤس کا کام کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ ان اخلاق حسنہ کا مجسمہ نورانیت کے پسندیدہ القاب ولایت، قطبیت، غوثیت ابدالیت، کا مسمیٰ ہوتا ہے جس کو ہر وقت اپنے خالق کا قرب حاصل ہوتا ہے اور یہی منشا ربانی ہے۔

وما خلقت الجن والانس	ہم نے جن اور انسانوں کو اپنی ہی بندگی
الا لیعبدون	کے لئے پیدا کیا ہے۔

اورانسان کی اصل تابعداری یہی ہے کہ وہ خدا کی عطا کردہ قوتوں کو صراط مستقیم سے نہ بھٹکنے دے۔

حضرات انبیاء علیہم السلام نے یہی کیا ہے کہ اپنی قوت ملکوتیہ کے ذریعہ بگڑے ہوئے انسانوں کو اخلاقی پستی سے نکال کر اسی صراط مستقیم پر ڈالدیا جس سے ماحول اور معاشرے نے بھٹکا دیا تھا چنانچہ جناب رسول اللہ صلعم نے ارشاد فرمایا ہے۔

انی بعثت لاتمم مکارم	میں اچھے اخلاق کی تکمیل کے لئے
الاخلاق الحدیث	بھیجا گیا ہوں

جناب رسول اللہ صلعم کے بعد آپ کے صحابہؓ نے امت کو اخلاقیات کی اسی شاہراہ پر لگائے رکھا اور اس سے بھٹکے ہوؤں کو ادھر بلایا۔

یہ حضرات چونکہ تربیت یافتہ از علیہ الصلوٰۃ والسلام تھے اور ان کا ماحول خیر القرون تھا اس لئے اس وقت کے بھٹکے ہوؤں کو صرف الطریق الطریق کہہ دینا ہی کافی تھا اور بس لیکن جوں جوں زمانۂ رسالت سے بعد ہوتا گیا ویسے ہی ماحول پر طغیانی و عصیانی بادل چھاتے گئے اور طاغوتیت کی مسموم ہوائیں چلنے لگیں لہٰذا اس ماحول میں جو بھی طاغوتیت کے قریب ہوا برباد ہو گیا لیکن جس نے صلح ہاتھوں میں تربیت پائی اور جو علوم نبوت کی نگرانی میں رہا اس کے لئے بہرحال وہی فطری شاہراہ کھلی رہی۔

حضرت شیخ الہند کا ماحول

حضرت شیخ الہند نے جس ماحول میں آنکھ کھولی اور تربیت پائی وہ صلح ترین ماحول تھا اس وقت دیو بند میں چوٹی کے بزرگ تھے۔ مثلاً حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی

(جو اکثر دیوبند آتے رہتے تھے) حضرت حافظ ضامن صاحب (جو اکثر دیوبند آتے رہتے تھے۔ حضرت شاہ رفیع الدین صاحب، میاں جی منے شاہ صاحب، حضرت حاجی سید عابد حسین صاحب اور خود حضرت شیخ الہند کے والد ماجد جو بڑے عالم اور دیندار تھے۔ ان کی دینداری کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مدرسہ عربیہ دیوبند کی خدمت فی سبیل اللہ کی اور جب حضرت شیخ الہند ملازم ہوئے تو تنخواہ لینے سے انکار کر دیا مگر حضرت شاہ رفیع الدین صاحب کے حکم کے سامنے مجبور ہو گئے۔ حضرت شیخ الہند کی والدہ ماجدہ خود ایک نیک سیرت خاتون تھیں لہٰذا جو بچہ ایسی گود دوں میں پرورش پائے، اس کے اخلاق و عادات جتنے پاکیزہ اور ستھرے ہوں گے وہ ظاہر ہے۔ چنانچہ حضرت شیخ الہند بچپن میں بھی بچوں کی طرح کھیل کود اور کوچہ گردی سے محفوظ رہے۔

اس کے علاوہ حضرت شیخ الہند نے جیسے ہی ہوش سنبھالا تو نہایت صالح اساتذہ کے سامنے قرآن پاک پڑھنا شروع کیا دوسری طرف بزرگ چچا اور باپ نے نگرانی کی گویا کہ روحانی تعلیم (قرآن پاک) روحانی حضرات سے حاصل کی اور اس کے بعد عربی، فارسی اور دینیات کی تعلیم بھی ان ہی حضرات سے حاصل کی۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ دینی تعلیم (جس کو تذکیہ قلب میں بڑا دخل ہے) بھی مزکی اور مصفی حضرات سے حاصل کی جس کا نتیجہ صاف ظاہر ہے کہ روز اول ہی سے آپ کے فطری اخلاق و عادات کو صالح غذا ملتی رہی جس سے آپ کی قلبی قوت کو تقویت ہی حاصل ہوئی۔ آپ کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہوش سنبھالنے کے بعد سے کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرا جو علم نبوت کے اکتساب سے خالی ہو گویا آپ کا بچپن بھی اشتغال بالعلم ہی میں مصروف رہا

امام نووی بیان فرماتے ہیں۔

الاشتغال بالعلم من	علم دین میں لگا رہنا قرب خداوندی
افضل القربات واجل الطاعات	کا افضل ترین ذریعہ ہے اور سب سے
واهم انواع الخير وآكد	بڑی طاعت اور سب سے بڑی نیکی
العبادات واولى ما انفقت	اور سب سے موکد عبادت ہے اور
فيه نفاس الاوقات وايضا	اس میں اوقات کا خرچ کرنا سب سے
قال من اهم انواع العلوم	بڑھیا ہے اور علم میں بھی اہم ترین علم
تحقيق معرفة الحديث	تحقیق احادیث ہے۔

اور سلوک و تصوف یا بدیگر الفاظ شریعت حقہ کا بھی یہی منشا ہے کہ انسان کے اوقات فضولیات میں نہ گزریں بلکہ اس کی عمر عزیز بہترین مشاغل میں خرچ ہو اور حضرت شیخ الہند کو یہ بات روز اول ہی سے حاصل رہی جس کی وجہ سے سلوک و تصوف کی راہوں سے گزرنے اور روحانی کمالات حاصل کرنے میں ان کا بہت کم وقت صرف ہوا۔

بیعت اور خلافت

۱۲۹۴ھ میں جب آپ اپنے استاذ محترم حضرت مولانا محمد قاسم صاحب اور دوسرے اکابر ہند کی معیت میں حج کے لئے تشریف لے گئے تو وہاں حضرت قاسم العلوم والخیرات کے فرمانے سے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی سے بیعت ہو گئے اور چونکہ ایک عرصہ سے علم نبوت مشغلہ تھا اور کاملین (خصوصاً حضرت قاسم والخیرات) کی صحبت وخدمت کا شرف حاصل تھا اس لئے مزید تزکیہ کی ضرورت نہ سمجھی گئی چنانچہ حضرت حاجی صاحب

نے سلاسل اربعہ میں اجازت بیعت تحریر فرماکر عنایت فرمادی۔ حضرت حاجی صاحب کے بعد حضرت نانوتوی نے بھی اجازت بیعت اور خلافت سے نوازا۔

ہندوستان تشریف لانے کے بعد چونکہ ۱۲۹۷ھ میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کا وصال ہوچکا تھا اس لئے اصلاح و تربیت اور محبت کا تعلق حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی سے قائم کرلیا۔ آپ حضرت گنگوہی کی خدمت میں ہر ہفتہ اس طرح حاضر ہوتے کہ جمعہ کے دن صبح کو پیدل گنگوہ پہونچ جاتے اور وہاں سے جمعہ کی نماز کے بعد تشریف لاتے[1] حضرت گنگوہی کو بھی اس قدر تعلق تھا کہ محبت بھرے انداز میں فرمایا کرتے تھے کہ "محمود حسن علم کا کٹھلہ ہے"۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ بیگم صاحبہ بھوپال کی طرف سے کچھ ہدایا و تحائف لیکر ریاست کے ایک افسر حاضر آستانہ ہوئے۔ جب کھانے کا وقت ہوا دسترخوان بچھایا گیا۔ اس وقت حضرت شیخ الہند بھی موجود تھے۔ ہاتھ دھلواکر آپ علیحدہ کو اس خیال سے جا بیٹھے کہ مبادا نواب صاحب کو ہماری موجودگی سے کوئی کبیدگی ہو حضرت گنگوہی نے فرمایا کیوں؟ عرض کیا حضرت! ہم لوگ پھر کھالیں گے" فرمایا نہیں! اگر نواب صاحب کو آپ کے ساتھ کھانا ہو تو کھائیں ورنہ اٹھ جائیں۔ میرا مرنا جینا تو آپ کے ساتھ ہے[2]

اس کے علاوہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی اپنے ہندوستانی مریدین کو حضرت گنگوہی کے سپرد فرمادیتے تھے کیونکہ حضرت حاجی صاحب کو حضرت گنگوہی کے کمالات ظاہرہ و باطنہ کی وجہ سے بے حد عقیدت اور محبت تھی۔ ضیاء القلوب

---

[1] دیوبند سے گنگوہ ۲۰ میل ہے از تذکرۃ الرشید ص ۱۵۵ ج ۱ [2] تذکرۃ الرشید (ج ۲)

میں تحریر فرماتے ہیں۔

جو آدمی کہ اس فقیر سے محبت اور عقیدت رکھتا ہے مولوی رشید احمد صاحب سلمہ اور مولوی محمد قاسم صاحب سلمہ کو جو تمام کمالات علوم ظاہری اور باطنی کو جامع ہیں۔ بجائے میرے بلکہ مجھ سے بڑھ کر جانے اگرچہ معاملہ برعکس ہے وہ بجائے میرے اور میں بجائے ان کے ہوتا۔ انکی صحبت غنیمت جانی چاہیئے ان جیسے آدمی اس زمانہ میں نایاب ہیں۔[1]

حاجی صاحب نے ایک مکتوب میں اپنے اس ارشاد کی تشریح میں لکھا ہے۔

میں نے ضیاء القلوب میں جو کچھ آپ کی نسبت لکھا ہے وہ الہام سے لکھا ہے۔[2]

حضرت حاجی صاحب نے ایک دوسری جگہ ارشاد فرمایا ہے۔

اگر حق تعالیٰ مجھ سے دریافت کرے گا کہ امداد اللہ کیا لیکر آیا۔ تو مولوی رشید احمد اور مولوی محمد قاسم کو پیش کر دوں گا کہ یہ لیکر آیا ہوں۔[3]

ایک دوسری جگہ ارشاد فرمایا ہے۔

مولوی رشید احمد صاحب میں اور مجھ میں کچھ فرق نہیں لوگوں کو یہاں آنے کی ضرورت کیا ہے۔[4]

ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں۔

فقیر آپ کی محبت کو ذریعہ نجات سمجھتا ہے۔[5]

---

[1] دیباچہ ضیاء القلوب [2] تذکرۃ الرشید صفحہ ۳۲ ج ۲ [3] ایضاً [4] سوانح از مولانا محمد یعقوب صاحب [5] مکتوبات رشیدیہ صفحہ ۲۔

بہرحال حضرت شیخ الہند نے حضرت گنگوہی سے بھی اصلاح و تربیت کا تعلق قائم کیا تھا اور آپ کو دربار رشیدی سے بھی سلاسل اربعہ میں اجازت بیعت و خلافت حاصل تھی۔ اس طرح آپ کو حضرت حاجی صاحب حضرت قاسم العلوم الخیرات حضرت گنگوہی ہر سہ حضرات سے سلاسل اربعہ میں اجازت بیعت اور خلافت حاصل تھی۔ لیکن آپ بیعت لیتے ہوئے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب ہی کی طرف انتساب کرتے تھے۔ اگرچہ بقیہ ہر دو حضرات کی طرف بھی انتساب کا آپکو حق حاصل تھا۔

مشائخ دیوبند میں ایسی متعدد مثالیں موجود ہیں کہ بیعت کسی کے ہاتھ پر ہے اور اجازت بیعت کسی دوسرے کی طرف سے ہے اسی طرح ایسی بھی مثالیں ہیں کہ اپنے شیخ سے بھی اجازت حاصل ہے اور دوسرے شیخ سے بھی۔ مثلاً حضرت مولانا خلیل احمد صاحب حضرت گنگوہی سے بیعت ہیں آپ کو ان سے بھی اجازت حاصل ہے اور حضرت حاجی صاحب سے بھی۔ حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب کاندھلوی حضرت گنگوہی سے بیعت ہیں اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سے آپ کو اجازت بیعت حاصل ہے مگر ان تمام حضرات نے اپنا سلسلۂ بیعت ان ہی سے متصل کیا جن سے انکو اجازت بیعت حاصل تھی۔ مشائخ طریقت خصوصاً مشائخ دیوبند نے سلسلہ طریقت کی حفاظت اسی طرح کی ہے جس طرح محدثین نے سند حدیث کی۔ بلاشبہ طریقت میں مشائخ دیوبند کا سلسلہ بلا انقطاع کے متصل ہے۔ اہل بدعت کے یہاں اس کا اہتمام نہیں ہے ان کے یہاں سلاسل طریقت مرسل اور منقطع ہیں اس لئے کہ وہ بیعت کسی سے ہوتے ہیں اور انتساب کسی کی طرف کر دیتے ہیں۔

حضرت شیخ الہند حضرت حاجی صاحب سے بیعت تھے ان سے آپ کو خلافت

بھی حاصل تھی اس لئے آپ نے اپنے سلسلہ کو ان ہی سے متصل کیا۔

حضرت شیخ الہند اولاً تو بیعت کرتے ہی نہ تھے اور جب تک حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی حیات رہے کسی کو بیعت نہیں کیا اور بات بھی یہی ہے کہ بڑوں کی موجودگی میں چھوٹوں کو یہ کام کسی طرح بھی زیب نہیں دیتا۔ حضرت گنگوہی کے وصال کے بعد جب لوگوں نے بہت تنگ کیا تو بیعت کرنا شروع کر دیا تھا۔ پھر تو یہ حال ہوا کہ دنیا ٹوٹ پڑی اور ہندوستان، عرب، مصر، مالٹا وغیرہ مقامات پر بھی یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔

حضرت شیخ الہند طالب کو اکابر کی طرح سلاسل اربعہ میں بیعت فرماتے تھے حضرت شیخ الاسلام نے اپنے مکتوبات میں اس کی وجہ بیان فرمائی ہے۔

> حضرت اقدس قدس سرہ العزیز نے جب مجھکو بیعت فرمایا تو چاروں خاندانوں چشتیہ، نقشبندیہ، قادریہ، سہروردیہ میں بیعت فرمایا، پھر فرمایا کہ میں نے چاروں میں بیعت اس لئے کیا ہے کہ لوگ جس طریقہ میں بیعت ہوتے ہیں اسی کی تفضیل اور ترجیح بلکہ غلو میں پڑ جاتے ہیں اور دوسرے طریقہ کو مرجوح قرار دیتے ہیں ور گمراہی میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور یہ صحیح نہیں ہے۔[1]

حضرت شیخ الہند کا سلوک میں کوئی خاص طریقہ تعلیم نہ تھا۔ طالب کی استعداد اور صلاحیت کے مطابق جو مناسب سمجھتے تعلیم فرماتے تھے۔ اور بات بھی یہی ہے کہ آدمی کے حالات کے مطابق اس کو تعلیم دی جائے یہ کوئی ضروری نہیں کہ صرف ایک

[1] مکتوبات شیخ الاسلام ص۱۶۵ ج ۳ مکتوب حضرت گنگوہی۔

ہی طریقہ سے وصول ہو سکتا ہے۔ بلکہ شیخ کامل طالب کو اس کے مزاج و عادات کو شناخت کر کے تعلیم دیتا ہے چنانچہ محض تلاوت قرآن یا کثرت نوافل یا کثرت استغفار یا کثرت درود شریف یا کثرت مطالعہ کتب دینیہ سے وصول کرایا جا سکتا ہے اور اس کی مثالیں موجود ہیں۔ حضرت شیخ الہند کے یہاں اوراد و اعمال مسنونہ پر بہت زیادہ زور تھا۔ خود بھی سختی سے اتباع سنت اور اوراد مسنونہ کی پابندی کرتے تھے اور اسی کی دوسروں کو تعلیم فرماتے تھے۔ ایک مکتوب میں حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی نے بیان فرمایا ہے۔

سب اذکار و مراقبات تحصیل نسبت کے واسطے ہوتے ہیں جب نسبت یادداشت حاصل ہو چکی۔ اب مراقبات کی درخواست عجیب بات ہے، اور تمہارا سب ذکر لسانی۔ قرآن و صلوٰۃ۔ ذکر مسنون مراقبہ ہے۔ سب میں یادداشت ہے، کہ ثمرہ مراقبات یہی ہے اب کسی مراقبہ کی حاجت نہیں۔ اذکار مسنونہ احادیث پڑھو۔ قرآن و نوافل ادا کرو اور بس۔[1]

حضرت شیخ الہند تعویذ گنڈے اور عملیات سے بہت زیادہ بیزار تھے کیونکہ لوگوں نے جن چیزوں کو عملیات قرار دیا ہے وہ اعلیٰ درجہ کی بے عملی اور بدعملی ہے۔ اتباع سنت سے آپ کو عشق تھا اور اسی کی آپ تلقین فرماتے تھے۔ حضرت شیخ الاسلام نے حضرات چشتیہ کے طبقات کے متعلق تحریر فرمایا ہے۔

میں نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے سنا تھا کہ فرماتے تھے کہ ہمارے

---

[1] مکاتیب رشیدیہ ص۱۲۱۔

مشائخ چشتیہ کے تین دور ہیں۔ اول طبقہ پر زہد غالب ہے۔ دوسرے طبقہ پر عشق غالب ہے اور تیسرے طبقہ پر اتباع سنت غالب ہے۔[ف۱]

اتباع سنت کا مذاق مشائخ دیوبند میں حضرت مجدد الف ثانی کا پرتو ہے اور اب تک اسی طریقہ پر سب سے زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ حضرت گنگوہی کے تمام مکتوبات کو اٹھا کر دیکھئے بالکل یہ معلوم ہوگا کہ مکتوبات مجددیہ ہیں۔ آپ اس معاملہ میں اتنے متشدد یا مکمل تھے کہ خلاف سنت عمل میں اپنے پیر کی بھی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ (اگرچہ پیروں کے یہاں یہ حرام شرعی یا نص قطعی کی مخالفت سے زیادہ سمجھا جاتا ہے) ایک مرتبہ جب ان کی خدمت میں حضرت حاجی صاحب کی کتاب ہفت مسئلہ پیش کی گئی تو آپ نے اس کو جلوا دیا اور فرمایا

ہم تصوف میں حضرت حاجی صاحب کے مقلد ہیں نہ کہ تحقیقات فقہیہ میں اور اس کو جلوا دیا۔[ف۲]

اتباع سنت میں حضرت شیخ الہند کا بھی بالکل یہی رنگ تھا۔

خلفا اور مجازین

حضرت شیخ الہند غایت درجہ انکساری اور اپنی علمی و سیاسی مصروفیات کی وجہ سے اس طرف (سلوک و تصوف) زیادہ توجہ نہ دیتے تھے۔ اکثر و بیشتر دوسرے حضرات (حضرت مولانا تھانوی، حضرت مولانا خلیل احمد صاحب، حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب رائپوری) کیلئے فرما دیتے تھے۔ اس لئے آپ کے خلفا اور مجازین کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔ تاہم جتنے حضرات بھی ہیں سب بہت خوب ہیں مثلاً

ف۱ مکتوبات شیخ الاسلام ص۶۴ ج ۳ ف۲ ایضاً حاشیہ ص۶۵ ج ۲۔

۱۔ مولانا ضرغام الدین صاحب مظفر نگری۔
۲۔ صوفی محمد اکرم " پنجابی
۳۔ مولانا محمد سہول " بھاگلپوری
۴۔ مولانا وارث حسن "

لیکن یہ بھی اتفاق ہے کہ حضرت شیخ الہند کے جانشین حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی ہوئے۔ بات دراصل یہ ہے کہ کچھ چیپ سے کوئی کسی کا جانشین نہیں ہوتا بلکہ جانشینی اعمال اور اپنے مقتداء کے اخلاق وعادات، اوصاف وخصوصیات کو کلی طور پر اختیار کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ حضرت شیخ الاسلام حضرت شیخ الہند کے ہر کمال (عبادت، ریاضت، علم، سیاست، خدمت، اخلاق، عادات وغیرہ) میں سچے جانشین تھے۔ آپ نے ہر چند چاہا کہ کوئی آپ کو حضرت شیخ الہند کا جانشین نہ کہے لیکن ہندوستانی عوام وخواص کے دلوں کی آواز یہی تھی۔

عبادات وریاضات

یوں تو مسلمان کی زندگی کے وہ تمام لمحات جو طاعت خدا اور طاعت رسول میں گزرتے ہیں، سبھی عبادت ہیں لیکن عرف عام میں جن چیزوں کو عبادت کہا جاتا ہے وہ چند اعمال مخصوصہ ہیں جن کو ذکر و فکر، تلاوت قرآن اور صلوٰۃ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

حضرت شیخ الہند کی مقدس زندگی کے تمام لمحات پرخلوص طاعت اور عبادت سے منور ہیں، آپ کو دیکھنے کے بعد طاعت اور عبادت کی بہترین چلتی پھرتی صورت سامنے آ جاتی تھی اور دیکھنے والے کو یقین ہو جاتا تھا کہ اس انسان کی زندگی کا مقصود ہی طاعت اور عبادت ہے۔ اس جگہ ہم حضرت کی زندگی کے چند مختلف ادوار کو پیش کر رہے ہیں۔

طالب علمی کی زندگی

حضرت مولانا میاں سید اصغر حسین صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

حضرت مولانا ایام طالب علمی ہی سے قیام لیل کے پابند تھے اور حضرت استاذ (حضرت قاسم العلوم والخیرات) کی خدمت میں دہلی اور میرٹھ میں رہتے ہوئے جس طرح دن کو تعلیم و تعلم کا شغل رہتا تھا رات کو ادائے اوراد و اذکار معمول مشائخ اور تعلیم فرمودہ حضرت استاذ کا شب کو دس گیارہ بجے تک حضرت استاذ کی خدمت میں رہتے

اور اس کے بعد گاہ گاہ رات کو سبق اور مطالعہ دیکھتے۔ ذرا آرام کر کے نوافل اور ذکر اللہ میں مصروف ہو جاتے۔

حضرت شیخ الہند رات کے ان تمام مشاغل کو ہر ایک سے پوشیدہ رکھنا چاہتے اور کوشش کرتے کہ

ان کو خبر ہو یا مجھے کوئی نہ رازدار ہو

لیکن استاذ محترم کی وجہ سے اخفا کی زیادہ کوشش بھی نہ کرتے۔ تعطیل کے دنوں میں طلبا کی عام طور سے سیر و تفریح کی عادت ہوتی ہے لیکن حضرت شیخ الہند کا معاملہ اس کے برعکس تھا۔

مکتب عشق کے قانون نرالے دیکھے — اس کو چھٹی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا

فراغت کے بعد طالب علمی کی زندگی کے بعد متصلاً ہی معلمانہ زندگی کا آغاز ہو جاتا ہے۔ یہ زندگی بھی آپ کی مکمل ترین زندگی ہے۔ دن میں دس دس، گیارہ گیارہ گھنٹے درس کے بعد سلوک و تصوف کے تمام اشتغال نہایت پابندی سے ادا کرتے تھے۔ صلوٰۃ با جماعت کا تو اس قدر اہتمام تھا کہ تکبیر اولیٰ تک فوت نہ ہوتی۔ غرضکہ پورا دن اسی مشغولیت میں صرف ہوتا۔ مہمانوں کی کثرت ان کی دیکھ بھال اور خدمت عیال بچوں کی تربیت اور اہل بیت کے حقوق کی ادائیگی غرضکہ کوئی سی مشغولیت بھی آپ کو صلوٰۃ با جماعت، ادائے اوراد و وظائف اور قیام لیل سے مانع نہ ہوتی تھی۔

صلوٰۃ لیل سے تو گویا آپ کو عشق تھا۔ جب دیکھا کہ سب سو چکے ہیں چپکے سے اٹھے اور نماز کی نیت باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ طویل طویل رکوع اور قیام میں پوری

پوری رات گزار دیتے لیکن جہاں کہیں بھی ذرا سی آہٹ محسوس کرتے کہ کوئی جاگ رہا ہے۔ فوراً ہی لیٹ جاتے تاکہ دیکھنے والے کو یہ احساس ہو جائے کہ حضرت سو رہے ہیں۔

اساتذہ میں سے کسی سے میں نے سنا ہے کہ ایک مرتبہ کسی بے تکلف نے دریافت کر لیا۔ حضرت! آپ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ فرمایا بھائی! نفلی نماز کو توڑنے کے بعد دوسرے وقت اس کی قضا میرے لئے زیادہ سہل ہے اور بہتر ہے اس سے کہ لوگ میرے بارے میں حسن ظن رکھیں اور واقع میں میں ایسا نہ ہوں۔ الحاصل حضرت شیخ الہند باوجودیکہ حافظ نہ تھے لیکن قیام طویل فرماتے تھے۔ نماز سے فارغ ہو کر ذکر استغفار، تلاوت قرآن میں مشغول رہتے۔ اور صبح کی نماز سے فارغ ہو کر اشراق کے وقت تک دلائل الخیرات وغیرہ پڑھتے اور پھر معمول کے مطابق وہی درس و تدریس کا سلسلہ شروع فرما دیتے تھے۔

مالٹا کے اوقات

حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی نے سفرنامہ اسیر مالٹا میں تحریر فرمایا ہے۔

مولانا عشا کی نماز کے بعد بہت تھوڑی دیر جاگتے تھے کچھ اپنے اوراد پڑھتے تھے۔ اور پھر پیشاب وغیرہ سے فارغ ہو کر اکثر وضو فرماتے۔ کبھی کبھی باتیں بھی کرتے تھے۔ اور پھر سو جاتے تھے کیونکہ دس بجے کے بعد حکماً روشنیاں بجھا دی جاتی تھیں۔ جہاں دس بجے اسی وقت سپاہی آواز دیتا تھا۔ سب چراغ اور موم بتیاں بجھانی پڑتی تھیں اور پھر تمام شب جلانے کی اجازت نہ تھی۔ جہاں جہاں کمروں میں برقی روشنیاں تھیں وہاں خود ہی بجھ جاتی تھیں۔ البتہ پہرہ وہ برقی روشنیاں جو کیمپ اور راستوں کی

روشنی کے لئے تھیں وہ تمام رات جلا کرتی تھیں ان کا تار برقی کمروں کی روشنی کے تار سے علیحدہ تھا۔ الغرض دس بجے سب لوگ سو جاتے تھے۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ تقریباً ایک بجے یا ڈیڑھ بجے شب کو اٹھتے اور نہایت دبے دبے پیروں سے نکلتے دروازے سے باہر تشریف لاتے۔ پیشاب سے فارغ ہو کر وضو فرماتے۔ گرمیوں میں تو گرم پانی کی ضرورت ہوتی ہی نہ تھی۔ نل کا پانی مناسب ہوتا تھا۔ سردی کے زمانے میں ہم نے یہ خاص اہتمام کیا تھا کہ چولہے پر کھانے کے بعد ایک بہت بڑے ٹین کے لوٹے میں جو کہ چائے کے لئے گورنمنٹ کی طرف سے ملتا اور اس میں ٹینٹو پیچ پار لگی ہوئی تھی۔ اور اس میں ہمارے معمولی دس بارہ لوٹے پانی آجاتا تھا۔ پانی خوب گرم کر لیا جاتا تھا اور پھر اسی پاس والے کمرہ میں جہاں پر نل لگا ہوا تھا۔ اس لکڑی کے تخت پر جس پر سب کپڑے دھوتے تھے ایک کمبل میں لپیٹ کر عشاء کے بعد رکھ دیتے تھے۔ یہ پانی صبح تک خوب گرم رہتا تھا۔ حالانکہ سردی بہت ہی زیادہ پڑتی تھی۔ اندھیرے ہی میں جا کر اس میں نماز تہجد ادا فرماتے تھے۔ جب اس سے فارغ ہو جاتے تو پھر چارپائی پر آکر بیٹھ جاتے تھے اور صبح تک مراقبہ اور ذکر خفی میں مشغول رہتے تھے اور ہزار دانوں کی تسبیح ہمیشہ ساتھ رکھی رہتی تھی۔ اسم ذات کی کوئی مقدار معین کر رکھی تھی اس کو ہمیشہ بالالتزام پورا فرماتے۔ مراقبہ کا اسقدر انہماک ہو گیا تھا کہ اکثر حصہ دن کا اس میں گزرتا تھا۔ استغراق بعض اوقات میں غالب ہو جاتا تھا۔ ہم بعض اوقات میں دو دو تین تین مرتبہ باتیں دہراتے مگر سمجھتے نہ تھے۔ صبح کی نماز سے پیشتر اکثر پیشاب کرتے اور وضو کی تجدید فرما کر نماز باجماعت ادا فرما کر وہیں مصلے (سجادہ) پر آفتاب کے بلند ہونے تک مراقب رہتے تھے۔ اس کے بعد اشراق کی نماز ادا فرما کر اپنے کمرہ میں تشریف لاتے۔ اس وقت مولانا کے

لئے ابلے ہوئے انڈے اور چائے تیار رہتی تھی۔ وہ پیش کر دی جاتی تھی۔ اس کو نوش فرماکر دلائل الخیرات اور قرآن شریف کی تلاوت فرماتے تھے۔ اس سے فارغ ہو کر کچھ ترجمہ قرآن شریف تحریر فرماتے یا اس پر نظر ثانی کرتے یا اگر خط لکھنے کا دن ہوتا تو خط تحریر فرماتے یا وحید کو سبق پڑھاتے اتنے میں کھانے کا وقت آجاتا کھانا تناول فرماکر چائے نوش فرماتے تھے۔ اس کے بعد اگر کسی سے ملنے کے لئے ورواله یا سنیٹ کلیمنٹ کیپ یا بلغار کیمپ میں جانا ہوتا تو وہاں کا قصد فرماتے اور کپڑے پہن کر تیار ہو جاتے تھے اور اگر جانے کا قصد نہ ہوتا تو آرام فرماتے اور اگر کوئی ملنے کے لئے دوسرے کیمپ میں سے آتا تو اس سے باتیں کرتے۔ اگر تیز گرمی کا زمانہ ہوتا تھا تب تو وہیں چارپائی پر اور اگر کچھ بھی سردی ہوتی تو صحن میں دھوپ میں قیلولہ فرماتے تھے وہاں پر ہم سب دو تین گدے ڈال دیتے اور اس پر کمبل اور تکیہ بچھا دیا جاتا تھا اور اگر کسی نے غفلت کی تو خود تکیہ لے جاتے اور ان گدوں اور کمبل کو بچھا کر آرام فرماتے۔ دو تین گدے ہم نے زائد اسی واسطے لے رکھے تھے جو کہ ہمیشہ علیحدہ رکھے رہتے تھے اور جب تک وہ حاصل نہ ہوئے تھے تو بعض چارپائیوں کے گدے اٹھا لئے جاتے تھے۔ تقریباً دو یا ڈیڑھ گھنٹہ تک اسی طرح آرام فرماتے تھے۔ پھر قضائے حاجت کے لئے تشریف لے جاتے اور پھر وضو فرمانے کے بعد تلاوت قرآن شریف دلائل الخیرات، حزب الاعظم وغیرہ میں مشغول ہوتے مگر قرآن شریف بہت زیادہ پڑھتے تھے۔ غالباً روزانہ دس بارہ پارے پڑھتے تھے۔ ظہر کی اذان تک اسی حالت میں رہتے تھے۔ پھر مسجد میں تشریف لاتے اور نماز سے فارغ ہو کر اگر وحید کا سبق ہوتا تو کبھی اس وقت میں اور کبھی صبح کو اپنے اوراد سے فارغ ہو کر کھانے کے وقت

تک پڑھاتے تھے۔ بلکہ اکثر صبح ہی کو پڑھاتے تھے۔ عصر کی نماز کے بعد اکثر مولانا رحمۃ اللہ علیہ ذکر خفی لسانی میں مشغول ہوتے تھے وہ ایک ہزار دانہ والی تسبیح چادر یا رومال کے نیچے چھپا کر بیٹھ جاتے اور ذکر کرتے تھے۔ مغرب کے بعد بھی ذکر خفی میں مشغول ہو جاتے تھے۔[1]

مولانا کی جفاکشی

مولانا مرحوم کو ہندوستان کی سردی بھی سخت اذیت دیتی تھی اور سردی کے ایام میں دن کو ہمیشہ دھوپ میں سوتے تھے بلکہ بسا اوقات گرمیوں کے زمانے میں بھی۔ سردیوں میں آگ اور کوئلے سے تاپنے کی اکثر عادت تھی روئی کے کپڑے بہت استعمال کرتے تھے۔ گھٹنوں میں اکثر درد رہا کرتا تھا۔ سردی کے ایام میں ہاتھ اور پیروں پر ورم ہو جاتا تھا جو سینکنے سے جاتا تھا۔ مگر مالٹا کی اس سخت سردی میں حسب عادت شب کو ڈیڑھ بجے یا دو بجے کا اٹھنا کبھی انھوں نے نہ چھوڑا۔ اسی وقت پیشاب کرتے اور وضو فرماتے اور تہجد کی نمازیں ادا کرتے اور اس کے بعد صبح تک مراقبہ اور ذکر خفی میں وقت گزارتے حضرت مولانا کی سفر و حضر میں ہمیشہ یہی عادت رہی۔[2]

رمضان المبارک

رمضان المبارک عبادت اور ریاضت کا مہینہ ہے اس مہینہ میں حضور صلعم اور امت کے تمام اولیاء اللہ نے علاوہ روزے کے ذکر، فکر، تلاوت قرآن اور نوافل سے بہت زیادہ اشتغال رکھا ہے۔ اس مہینہ میں یہ حضرات دنیا کے تمام امور سے یکسو ہو کر صرف عبادت الٰہی ہی میں مشغول رہتے تھے۔

---

[1] سفرنامہ شیخ الہند ص۱۰ اسیر مالٹا۔

جب یہ مہینہ آتا تو حضرت شیخ الہند کا جذبہ شوق عبادت جولانیوں پر ہوتا
اور پوری پوری رات عبادت الٰہی میں گزار دیتے تھے۔ کئی کئی حفاظ سے قرآن پاک
سنا کرتے تھے۔ تراویح سے فارغ ہو کر بہت دیر تک حاضرین کو دینی باتیں بتلایا
کرتے تھے پھر اگر موقع ملتا تو چند منٹ کے لئے لیٹ جاتے اور اس کے بعد پھر نوافل
شروع ہوتے۔ ایک حافظ دو چار پارے سنا کر آرام کرتا تو دوسرا حافظ سناتا۔ قاری
بدلتے رہتے تھے مگر مولانا اپنی جگہ بدستور قائم رہتے تھے۔

بعض رمضان میں فرائض مسجد میں پڑھتے اور مکان پر بجماعت خدام و
حاضرین تراویح پڑھتے اور اس طرح دس دس پارے تک تراویح میں پڑھے
جاتے تھے۔ تراویح ختم ہو جاتی تو حافظ نوافل شروع کر دیتا تمام رات یہی لطف
رہتا تھا۔ مولانا اس قدر طویل قیام فرماتے تھے کہ پیروں پر ورم آجاتا تھا۔ آپ
حتیٰ تورمت قدماہ (یہاں تک کہ آپ کے پائے مبارک ورم کر جاتے)
کی سنت کی اتباع سے بہت خوش ہوتے۔

ایک مرتبہ آپ قلیل طعام، قلت منام اور طویل قیام کی وجہ سے بہت
ضعیف ہو گئے۔ پیروں پر ورم زیادہ ہو گیا تھا۔ تو اندر سے سنانے والے حافظ
(جناب حافظ کفایت اللہ صاحب) کو کہلا کر بھیجا کہ آج تھوڑا قرآن شریف پڑھا
جائے۔ چنانچہ حافظ صاحب نے تھوڑا سا پڑھ کر کہدیا کہ آج میری طبیعت خراب ہے
حضرت نے ان کو آرام کی اجازت دیدی۔ مگر انھوں نے تھوڑی دیر کے بعد دیکھا
کہ کوئی آہستہ آہستہ پیر دبا رہا ہے جب دیکھا تو وہ حضرت شیخ الہند تھے[1]۔

---

[1] حیات شیخ الہند۔

صلوٰۃ تہجد کا مسئلہ

رمضان المبارک میں حضرت شیخ الہند کے معمول کے متعلق حضرت مولانا میاں اصغر حسین صاحب کی عبارت سطور بالا میں پیش کی جا چکی ہے۔ اس سے جو نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے وہ سامنے ہے۔ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی نے اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرمایا ہے۔

> ہم نے حضرت قطب عالم حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہٗ العزیز کا عمل بھی مکہ معظمہ میں اسی پر پایا اور حضرت شیخ الہند کا معمول بھی یہی تھا۔[1]

حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی کا معمول بھی رمضان المبارک میں یہی تھا کہ وہ بجماعت کثیرہ تہجد کی نماز ادا فرماتے تھے اور اس کو انھوں بدلائل اپنے اس مکتوب میں مستحب ثابت کیا ہے۔

حضرت شیخ الہند کے معمول کے متعلق ایک مطبوعہ فتوے میں مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے تحریر فرمایا ہے۔

> حضرت شیخ الہند کے بارے میں اتنی بات یقین کے درجہ میں معلوم ہے کہ آپ نے شروع میں تہجد کی جماعت لاعلیٰ سبیل التداعی ایک دو افراد کے ساتھ کی ہے لیکن بعد میں جب لوگ زیادہ آنے لگے تو اسی کراہت کیوجہ سے آپ نے تمام رات تراویح کا معمول بنا لیا تھا۔ عموماً آٹھ دس پارے تراویح میں جماعت سے پڑھے جاتے تھے۔ اور یہ تراویح ہی سحری کے وقت ختم کی جاتی تھی الخ۔

---

[1] شیخ الاسلام نمبر ۔ ص ۔

سیدی وسندی حضرت شیخ الہندؒ کا معمول پورے رمضان کی شب بیداری اور نفلوں میں سماعت قرآن کا تھا جب لوگوں نے اس کی جماعت میں شرکت کی خواہش ظاہر کی تو اس کی اجازت نہیں دی۔ گھر کا دروازہ بند کرکے اندر حافظ کفایت اللہ صاحب کی اقتدا میں قرآن سنتے تھے، پھر جب لوگوں کا اصرار بڑھا تو معمول یہ بنالیا تھا کہ فرض نماز مسجد میں بجماعت پڑھ کر مکان پر تشریف لاتے تھے۔ اور کچھ دیر آرام فرمانے کے بعد تراویح میں پوری رات قرآن شریف سنتے تھے۔ مکان پر جماعت ہوتی تھی جس میں چالیس پچاس آدمی تک شریک ہوتے تھے یہ احقر خود بھی حضرت کی اسارت مالٹا سے دو سال پہلے اس جماعت میں شریک رہا ہے۔ جو تراویح کی جماعت تھی نفل تہجد کی جماعت کو حضرت نے کبھی گوارہ نہیں کیا۔[1]

حضرت مولانا سید فخرالدین احمد صاحب شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند نے ارشاد فرمایا۔

حضرت شیخ الہند رمضان المبارک میں فرض نماز تو مسجد میں ادا کرتے تھے اور تراویح کی نماز باجماعت گھر پر ادا فرماتے تھے اس کے علاوہ مجھے معلوم نہیں کہ وہ تراویح ہی اتنی طویل ہوتی تھی کہ تہجد کے بھی قائمقام بن جاتی تھی یا پھر تہجد کی نماز علیحدہ ادا کی جاتی تھی یہ معلوم نہیں کہ اس میں کس قدر آدمی شریک ہوتے تھے کیونکہ مکان کا دروازہ بند کر لیا جاتا تھا۔

جہاں تک حضرات حنفیہ کی تصریحات کا تعلق ہے۔ یہ سب حضرات اس پر متفق ہیں کہ رمضان اور خارج رمضان مطلقاً نوافل کی جماعت بالتداعی مکروہ ہے اور

---

[1] مطبوعہ فتویٰ از کراچی۔

تداعی کے التزام) یعنی یہ بتلاتے ہیں کہ جماعت میں دو تین آدمیوں سے زیادہ شریک ہوں۔ اسی کو حضرت گنگوہی نے اختیار کیا ہے چنانچہ ان کے دو فتوے فتاوی رشیدیہ اور ایک فتوی تذکرۃ الرشید میں بالتفصیل موجود ہے۔

جہاں تک مطلقاً نوافل کی جماعت کے ثبوت کا تعلق ہے تو حضرات حنفیہ اس کے منکر نہیں ہیں چنانچہ بخاری شریف ... باب صلوٰۃ النوافل جماعت میں عتبان بن مالک انصاری رضی کی حدیث شریف میں مذکور ہے۔

میں اپنی قوم بنی سالم کو نماز پڑھاتا تھا اور میرے اور ان کے درمیان ایک وادی تھی جب بارش ہوتی تو اس وادی کو پار کرنا اور مسجد پہونچنا میرے لئے دشوار تھا۔ چنانچہ میں حضور صلعم کے پاس حاضر ہوا اور میں نے عرض کیا کہ میری بینائی کمزور ہے اور جب بارش ہوتی ہے تو وہ وادی جو میرے اور میری قوم کے درمیان ہے جاری ہو جاتی ہے تو میرے لئے اس کو عبور کرنا دشوار ہوتا ہے لہذا میری خواہش ہے کہ آپ میرے گھر تشریف لائیں اور نماز پڑھیں میں اس جگہ کو مصلےٰ بنالوں گا۔ آپ نے ارشاد فرمایا اچھا کل آؤں گا۔ چنانچہ آپ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی دن چڑھے تشریف لائے۔ اور آپ نے میرے گھر میں نماز پڑھی۔

فقام رسول اللہ صلعم	آپ کھڑے ہوئے اور ہمنے آپکے پیچھے
صففنا وراءہ فصلی رکعتین	صف بنائی پس آپ نے دو رکعت
ثم سلم و سلمنا حین سلم	پڑھیں پھر سلام پھیرا اور ہمنے بھی اس

وقت سلام پھیرا جسوقت آپ نے سلام پھیرا

اس پوری حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نوافل کی اس جماعت میں بنی سالم کے بکثرت آدمی موجود تھے کیونکہ یہ بعید از قیاس ہے کہ حضور صلعم کسی قبیلہ میں جائیں اور اس کا کوئی آدمی بھی ملاقات کو نہ آئے علاوہ ازیں جمع متکلم کا صیغہ خود اس پر دلالت کر رہا ہے ہاں صرف ایک صحابی رض موجود تھے جن پر حاضرین نے نفاق کا جرم عائد کر دیا تھا جس کی تردید آنحضرت صلعم نے بعد میں فرما دی تھی۔ علامہ بدرالدین عینی نے دو تین حدیثیں اور ذکر کی ہیں جن کا تذکرہ تعلیقاً امام بخاری نے بھی کیا ہے مثلاً حضرت عائشہ کی حدیث ہے۔

ان رسول اللہ صلعم	ایک رات رسول اللہ صلعم نے مسجد
صلے ذات لیلۃ فی المسجد	میں نماز پڑھی تو بہت سے آدمیوں
فصلے بصلوتہ ناس	نے آپ کے ساتھ نماز پڑھی۔

اس حدیث میں بھی "ناس" تین یا اس سے زیادہ پر دلالت کر رہا ہے۔ اور ذات لیلۃ سے معلوم ہو رہا ہے کہ یہ نماز عشا کی نماز کے علاوہ تھی، یہ تہجد ہی کی ہو سکتی ہے۔ تیسری حدیث حضرت انس بن مالک رض کی ہے جس میں ذکر ہے۔

فقام رسول اللہ صلعم	حضور صلعم نماز کیلئے کھڑے ہوئے تو
وصففت انا والیتیم ورا٫ہ	میں نے اور یتیم نے آپ کے پیچھے صف
والعجوز ورائنا[1]	بنائی اور بڑی بی نے ہمارے پیچھے

اس حدیث کی شرح میں ملا علی قاری رح نے تحریر فرمایا ہے۔

واما الجماعۃ فی التھجد	جماعت تہجد مسنون نہیں ہے اور

---

[1] عینی ص ۲۶ ج ۳۔

فلیست بمسنونۃ ایضاً و	یہ جو رسول اللہ صلعم سے ثابت ہے
ماوقع منہ علیہ السلام	یہ نادر ہے اور بیان جواز کیلئے ہے
فھو کان نادراً للبیان الجواز[1]	یعنی جماعت تہجد پر آپ نے مداومت

نہیں فرمائی۔

ان مندرجات سے چند نتائج سامنے آتے ہیں۔

۱۔ حضرت شیخ الہند رح نے رمضان المبارک میں تہجد کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کی ہے اگرچہ ابتداً ان کی جماعت علی سبیل التداعی نہیں تھی یعنی اس میں دو تین آدمی شریک ہوتے تھے۔

۲۔ جب آدمیوں کی کثرت ہوئی تو حضرت شیخ الہند رح نے تراویح کو طویل کردیا گویا تہجد اور تراویح ایک ہو گئے۔

۳۔ حضرت گنگوہی اور تمام فقہا تداعی کے ساتھ جماعت نوافل کو مکروہ قرار دیتے ہیں اور تداعی یہ ہے کہ تین آدمیوں سے زائد امام کے پیچھے نماز پڑھیں اگرچہ وہ اتفاقاً جمع ہو گئے ہوں تاہم تین سے زیادہ کی موجودگی التزاماً تداعی میں داخل ہے اور اسی پر فتویٰ ہے۔

۴۔ جناب رسول اللہ صلعم سے ثابت ہے کہ حضرات صحابہ رض نے علاوہ تراویح و کسوف کے بھی تہجد اور دوسرے نوافل جماعت کے ساتھ حضور صلعم کی اقتدا میں پڑھے ہیں۔ اگرچہ نادراً ایسا ہوا ہے اور نوادرات پر ان ہی قیودات کے ساتھ اتباع سنت کی غرض سے نادراً عمل کی اجازت ہو سکتی ہے مداومت کی اجازت نہ ہوگی۔

---

[1] قمر الاقمار ص ۳۶۔

۵۔ نوافل یا تہجد دائماً باجماعت مسنون نہیں ہیں۔

۶۔ یہ بھی غلط اور قلت تدبر کی دلیل ہے جیسا کہ مفتی محمد شفیع صاحب نے بیان فرمایا ہے:۔

غیر تراویح میں جماعت پر اجماع تو در کنار اس کا نفس ثبوت ہی منقول نہیں اس لئے کہ رسول اللہ صلعم اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ادوار مبارکہ میں کہیں غیر تراویح میں بالتداعی جماعت کا ثبوت نہیں ملتا ہے

کیا مندرجہ بالا تین حدیثوں کی موجودگی میں بھی نفس ثبوت سے انکار کیا جا سکیگا۔

سر کو ٹکرا کے نہ مر جائیں اسیران قفس
شور آتا نہ تجھے برگ خزاں لازم ہے

کیا میں یہ عرض کر سکتا ہوں کہ تداعی کا جو مفہوم (تین سے زیادہ کی جماعت میں شرکت) فقہائے متاخرین نے اصطلاحاً مقرر کیا ہے (اور جس کی قید حضرت مفتی صاحب نے اپنی عبارت میں بھی لگادی ہے) کیا یہی مفہوم ادوار صحابہ رضہ، ادوار تابعین میں مراد لیا جاتا تھا۔ اگر نہیں تو قرن اول کی بات میں اس کا پیوند کیوں لگا دیا گیا۔ میں حضرت مفتی محمد شفیع صاحب کو ان کے استاذ محترم حضرت علامہ انور شاہ کشمیری کی ایک عبارت کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں۔

وکرہ لہ التداعی وھو علی اللغۃ عندی[1]	نوافل کے لئے تداعی مکروہ ہے اور وہ میرے نزدیک تداعی لغوی ہے۔

اس کے بعد حضرت شاہ صاحب نے بیان فرمایا ہے۔

---

[1] فیض الباری ص ج ۲۔

فالنداء من خصائص المکتوبة وقد رده الحلوانی بما فوق الثلاث[1]

پس ندا فرائض کی خصوصیات میں سے ہے اور حلوانی نے اس کی تفسیر تین سے زیادہ کی ہے۔

اس کے بعد حضرت شاہ نے فرمایا ہے کہ علامہ حلوانی نے تداعی کی یہ تفسیر انتظاماً فرمائی ہے اور فتوے کے لئے یہی زیادہ مناسب ہے۔ علامہ ابن عابدین نے بھی یہی بیان فرمایا ہے کہ تداعی کے یہ معنی (یعنی تین سے زیادہ کی شرکت) لغوی نہیں بلکہ التزامی ہیں لہٰذا تداعی کا یہ مفہوم قرن اول میں تلاش کرنا جہالت ہے۔ حضرت شاہ صاحب نے بخاری شریف کی جس حدیث (حدیث عتبان بن مالک) کی شرح میں یہ ارشاد فرمایا ہے وہاں تداعی لغوی موجود نہیں ہے ہاں ثلاث یا فوق الثلاث ..... (تداعی التزامی) موجود ہے۔ بلاشک و شبہ تداعی لغوی کے ساتھ نوافل کی جماعت کا ثبوت ادوار ثلاثہ میں نہیں ملتا لیکن تداعی اصطلاحی و التزامی (فوق الثلاث) اس کا ادوار ثلاثہ سے کوئی تعلق نہیں ہے یہ صرف فقہائے متاخرین کی اصطلاح ہے جو انھوں نے انتظاماً فتوے کے لئے اختیار کی ہے۔ بایں ہمہ ہم یہی عرض کرتے ہیں کہ تفردات مشائخ تو کیا تفردات صحابہ رضی بھی تقلید کے قابل نہیں ہوتے۔ امت کا انتظام اور اسکے لئے خیر متفقہ مسلک حق کی اتباع میں ہی ہے نہ کہ تفردات میں حضرت شیخ الاسلام رح نے اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرمایا ہے۔

> اساتذہ کرام کے ہم خوشہ چین ہیں۔ ان کے احسان اور علوم سے استفادہ کرنے والے شکرگزار ضرور ہیں مگر تقلید صرف امام ابو حنیفہ رح کی کرتے ہیں اور اسکو

---

[1] فیض الباری ص ۲۳۲ ج ۲۔

علمی روشنی میں ضروری اور باعث نظام امت سمجھتے ہیں۔ ہم دوسرے ائمہ مذاہب کو بھی حق پر سمجھتے ہیں ہم مصوب کی رائے پر جو اقرب الی الصواب ہو فروع میں تمام مجتہدین کو صائب اور محققین کی رائے پر دائرین الحق سمجھتے ہیں۔ بہر حال ہمارے اکابر فقط امام صاحب کے فقہ کے مقلد ہیں دوسرں کے اقوال کو مرجوح سمجھتے ہیں باطل نہیں کہتے۔ اور نہ اس پر عمل در آمد کرتے ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی جو کہ سلسلہ کے بہت بڑے امام ہیں اور حضرت شاہ اسماعیل صاحب کے استاذ الاستاذ اور جد بزرگوار ہیں۔ امام ابو حنیفہ کے مقابلہ میں مطاع قرار نہیں دیتے۔ حجۃ اللہ البالغہ کی جلد ثانی میں شاہ صاحب نے بہت سے مسائل میں خلاف فرمایا ہے ان پر نہ فتویٰ دیتے ہیں اور نہ عمل کرتے ہیں اور الحمد للہ ہمارے پاس ان مسائل فرعیہ کے جوابات بھی مکمل طور پر موجود ہیں اور محقق العصر علامہ ابن ہمام وغیرہ دوسرے اکابر کے تفردات بھی معمول بہا قرار نہیں دیتے اور یہی مسلک ہم نے اسلاف کرام سے ارجح مافیہ پایا ہے [1]

ان ہی الفاظ میں حضرت شیخ الاسلام رح کا یہ عملی بھی تفرد ہے جو متفقہ مسلک حق اور فتوے کے سامنے جو بھی درجہ رکھتا ہے وہ ظاہر ہے اب ہم مزید کچھ عرض کرنا نہیں چاہتے بلکہ حضرت شیخ الاسلام رح کا یہ مکتوب گرامی حرفاً حرفاً اسی طرح پیش کرتے ہیں جس طرح موصوف نے ہمارے لئے اس کو مشعل راہ قرار دیا ہے بلا شک اکابر سے علمی اختلاف کا حق حاصل ہے لیکن ان پر طنز کرنا۔ انکے کسی عمل کو شعار روافض کہدینا یہ زیادتی ہے۔

چوں خدا خواہد کہ پردہ کس درد ۔۔۔ میل اندر طعنہ پاکاں زند

---

[1] شیخ الاسلام نمبر ۵۴۔

اخلاق اور عادات

سفینہ چاہیئے اس بحر بیکراں کیلئے

حضرت شیخ الہندؒ کون تھے کیا تھے؟ عوام و خواص کیوں ان کو شیخ الہندؒ کہتے تھے؟ اسکا جواب ہماری یہ حقیر تالیف ہے جس سے ان کے اخلاق و عادات اور اسوۂ حسنہ پر تفصیلی روشنی پڑتی ہے۔ علماء تو اس زمانہ میں بھی بہت تھے اور غالباً علم میں ان کے برابر بھی ہوں گے۔ پھر آخر کیا وجہ ہے کہ زبان خلق پر ان کے لئے ہی "شیخ الہندؒ" جاری ہوگیا۔ اور ایسا جاری ہوا کہ اصل "نام محمود حسن" بھی اس میں گم ہوگیا۔ اس پر اگر غور کیا جائے تو یہ عقدہ حل ہوجائے گا اور یہ حقیقت آشکارا ہوجائے گی کہ ۔ ۔ ۔
حضرت شیخ الہندؒ میں علمی کمالات کے علاوہ ایسے بہت سے روحانی، اخلاقی، انسانیت نواز کمالات تھے کہ جن کے مجسمہ "محمود حسن" کو شیخوخیت ہند کی صفت سے متصف تسلیم کیا گیا۔ پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ ایک، دو یا دس یا پانچ خوبیوں کی وجہ سے کسی کو شیخ الہند نہیں کہا جا سکتا بلکہ اصحاب بصیرت و فراست کے نزدیک تو ایسی شخصیت کے لئے ہمہ صفت متصف ہونا ضروری ہے۔

اسی کے ساتھ یہ چیز بھی قابل لحاظ ہے کہ وہ زمانہ موجودہ زمانہ کی طرح نہیں تھا کہ جس میں جمہوریت اور الیکشنوں کی بھرمار کی وجہ سے خطابات کی ارزانی ہوگئی ہے۔

جہاں دو چار مجہول الحال لوگوں نے نعرے لگائے اور خطاب نے جنم لے لیا بلکہ اس وقت قومی خطابات کے پس منظر میں بہت سی قربانیاں اور بہت سے گہرے تفکرات جھلکتے ہوئے نظر آئیں گے۔ وہاں خطابات کے پیچھے اخلاص تھا اور اب نفاق اور چاپلوسی

عجیب حال ہے نیرنگیٔ زمانے کا

اس لئے حضرت شیخ الہندؒ کے اخلاق و عادات اور انسانیت نواز کمالات کے متعلق کچھ لکھنا مستقل تصنیف کو جنم دینا ہے بحمد اللہ ہماری یہ حقیر کوشش آپ کے سامنے موجود ہے۔ لیکن چونکہ سوانح نگاروں کے یہاں یہ بھی ایک عنوان ہے اس لئے اس عنوان کے تحت کچھ نہ لکھنا ان کے نزدیک کمی کی بات ہے بدیں وجہ چند سطریں اس عنوان کے تحت بھی سپرد قلم ہیں۔

تواضع و انکساری

تواضع و انکساری ایک قلبی کیفیت کا نام ہے جس کے اثرات انسان کے جوارح سے ظاہر ہوتے ہیں۔ اگر کسی انسان کے قلب میں تو یہ کیفیت ..... نہ ہو لیکن وہ بتکلف متواضع بنتا ہو تو ایسے شخص کو مکار، دغاباز، چاپلوس اور سب کچھ کہا جائے گا لیکن تواضع نہیں کہا جائیگا متواضع شخص کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے کو جیسا ظاہر کرتا ہو ہنیں نہیں بلکہ اس کے جوارح سے جیسا ظاہر ہوتا ہو ویسا ہی وہ باطن بھی ہو۔ حضرت شیخ الہندؒ کے یہاں یہی چیز تھی وہ اندر اور باہر۔ محفلوں میں اور درسگاہوں میں، جیل خانوں میں اور میدان سیادت و قیادت میں، سونے اور جاگنے میں، کھانے اور پینے میں غرضکہ زندگی کے تمام نشیب و فراز میں متواضع تھے۔ درسگاہ کو جب تشریف لاتے یا کہیں بھی جاتے وہی بھدی جوتی جو اندرون خانہ پہنے ہوتے وہی بیرون خانہ پہنے چلے آتے۔ گھر میں اگر کبھی کھانے کا اتفاق

ہو جاتا وہیں چولھے کے سامنے زمین پر آکر دو بیٹھ کر کھانا تناول فرما لیتے تھے۔ سیدی و مرشدی، مولائی، وسیلہ یومی و غدی حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی اسیر مالٹا میں رقم طراز ہیں

مولانا مرحوم کا طبعی مذاق تھا کہ وہ غربا اور معمولی آدمیوں میں رہنا پسند فرماتے تھے اور اپنی عادت، لباس، چال، ڈھال، معاملات وغیرہ اسی قسم کا رکھنا چاہتے تھے اہل دنیا اور امراء اور تکلف والوں سے گھبراتے تھے طالبعلموں سے بے حد انس تھا۔ ریل میں بھی تیسرے درجہ میں سفر کرنا پسند فرماتے تھے مگر باایں ہمہ طینت میں صفائی بھی بہت زیادہ تھی۔ سفر میں عموماً کافور ساتھ رکھتے تھے کیونکہ بہت سے میلے کچیلے آدمیوں کی بدبو سے سخت تکلیف ہوتی تھی۔ عطر اور وہ بھی گلاب کا نہایت ہی مرغوب تھا۔ سادگی اور سادہ لوگوں سے میل ملاپ اور ان سے مجالست نہایت زیادہ محبوب تھی۔ اپنے آپ کو بنانا، وضعداری تکلف سے طبعی نفرت تھی۔ بارہا حضرت مولانا نانوتوی کا مقولہ نقل فرمایا کرتے تھے کہ عوام الناس کا پاخانہ قضائے حاجت کی جگہ بھی برکت والی ہے یعنی وہ پاخانے جو خواص اور امراء کے لئے بنائے جاتے ہیں اگرچہ وہ صاف ستھرے اور بدبو سے منزہ بہت زیادہ ہوتے ہیں مگر ان میں نحوست اور خرابی ہوتی ہے۔ بخلاف عوام کے پاخانوں کے حقیقت یہ ہے کہ نفس کو اپنی تعلی مرغوب ہے وہ اپنی رفعت اور بڑائی کا از حد خواہاں ہے اور یہی تمام برائیوں اور دنیا و آخرت کی رسوائیوں کی جڑ ہے۔ اس لئے اہل اللہ اور

لہ سیرت کی کتابوں میں اگر تلاش کیا جائے گا۔ تو حضور صلعم کے حالات میں اس قسم کی احادیث مل جائیں گی۔ ملاحظہ فرمائیے زاد المعاد

روحانی کامل حضرات جن امور میں تھوڑی سی بھی نفس کی تعلی اور اسکا تمیز
احساس کرتے ہیں اس کو برائی کی نظر سے دیکھتے ہیں اور جس میں کسر نفسی اور
ذلت ظاہری نظر آتی ہے اس کو محبوب رکھتے ہیں۔ ظاہری بدبو اور کثافت
مادی، معنوی بدبو اور کثافت روحانی کے مقابلہ میں کوئی چیز نہیں اور نہ
کوئی ہستی رکھتی ہے۔ امرا کا پاخانہ نفس میں عجب اور رعونت پیدا کرتا ہے
اور عوام الناس کا پاخانہ اس کو پیدا نہیں کرتا بلکہ برخلاف اس کے تواضع
اور نفس کی حالت دکھلاتا ہے اور انسانوں کو قدرے اپنی حالت اور
نجاست کو بھی یاد دلاتا ہے جب کہ پاخانہ کی یہ حالت ہے تو دوسرے اوضاع
اطوار، مکانات وغیرہ کو اسی پر قیاس فرماتے تھے فقہاء نے حوض سے وضو
کرنے کو افضل لکھا ہے شراح فرماتے ہیں کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ معتزلہ کا خلاف
ہو اور ان کی دل شکنی کی جائے مگر کہیں منقول نہیں کہ معتزلہ نے حوض سے وضو
کرنے پر کسی قسم کا انکار کیا ہو میری سمجھ میں تو یہ آتا ہے کہ نفس کی اصلاح اس
میں بہت زیادہ ہوتی ہے اور اس پر نہایت شاق بھی گزرتا ہے کیوں کہ
ایک ہی جگہ سے ایک شخص ... پاؤں دھوتا ہے دوسرا آتا ہے اور اس پانی کو
منہ میں اور ناک میں ڈالتا اور اس سے چہرہ کو دھوتا ہے اس لئے نفس مارنے
والے اور بڑے بڑے دنیادار اس سے وضو کرنے میں اپنی ہتک و بے عزتی
سمجھیں گے۔ اور غالباً حوض میں وضو کرنا اسی بنا پر نہایت افضل ہو واقعیت
تو یہ ہے کہ دونوں استاذ شاگرد (یعنی حضرت مولانا نانوتوی قدس سرہ
العزیز اور حضرت مولانا شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ) اس بات کی تلاش میں

سمجھتے تھے کہ کس بات میں نفس کشی ہوتی ہے تواضع، انکساری آتی ہے اسکے لئے ازحد کوشاں رہتے تھے اور جس چیز میں رعونت، جاہ طلبی، نفس پرستی شہرت تعلی، خودداری ہوتی تھی اس سے کوسوں بھاگنے کی فکریں کرتے تھے پھر یہ نہ تھا کہ عام قاعدہ کے موافق زبانی اور ظاہری جمع خرچ ہو۔ یوں تو ہم بہتوں کی حالت ہے کہ اپنے آپ کو زبان سے کمترین خلائق سگ دنیا ذرہ بے مقدار، نابکار، ننگ خلائق وغیرہ کہتے رہتے ہیں اور لکھتے بھی ہیں مگر یہ سب کارروائی منافقانہ اور ریاکاری کی بنا پر ہوتی ہے قلب میں اس کا ذرہ بھی اثر نہیں ہوتا بلکہ اس کے برعکس یہی خیال دل میں جاگزیں ہوتا ہے کہ من دیگرے نیست اور اسی وجہ سے دوسروں کی عیب جوئی ان کی نکتہ چینی غیبت وغیرہ ہوتی رہتی ہے کسی اپنے معاصر کی بلکہ بسا اوقات اپنے سے بڑوں کی کوئی بھلائی سن لیتے ہیں تو بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ اور طرح طرح سے اس میں عیب نکالے جاتے ہیں کوشش کی جاتی ہے کہ یہ شخص لوگوں کی نظروں سے ساقط ہو جائے اگر کوئی ہم کو جاہل، نالائق احمق، گدھا، کتا، سور وغیرہ کہہ دیتا ہے تو آگ بگولہ ہو جاتے ہیں اگر ہم کمترین خلائق کہتے ہیں سچے ہیں تو گدھا کتا وغیرہ کہنے سے کیوں برا مانتے ہیں آخر خلائق میں سے تو وہ بھی ہیں۔ الغرض مولانا نے اپنے نفس کو ریاضت و مجاہدہ وغیرہ سے اس طرح مہذب بنالیا تھا کہ صادقین کے زمرہ شریفہ میں داخل ہو کر منصب عظیم حاصل کر لیا تھا ان کی یہ فروتنی کسر نفسی حالی تھی قالی نہ تھی ان کا قلب اس بات کو دیکھتا تھا جس کو ان کی زبان اور آنکھ ظاہر

کر رہی تھی وہ اپنے آپ کو واقع میں ایک معمولی مخلوق اور ایک ادنیٰ درجہ کا انسان دیکھتے تھے۔ مجھ کو اس وقت مولانا عبدالصمد صاحب مرحوم مدرس دارالعلوم دیوبند کا مقولہ یاد آتا ہے وہ مولانا مرحوم کی شان میں فرمایا کرتے تھے۔ غالباً اس شخص کے دل پر کبھی خطرہ بھی نہیں گزرتا کہ میں کوئی چیز یا عالم ہوں۔ جن لوگوں نے مولانا کے احوال اور ان کے کوائف پر تھوڑی سی نظر ڈالی ہوگی وہ اس کو صحیح اور واقعی بات سمجھیں گے وہ ہر ایک کو اپنے سے بڑا اور افضل دیکھتے اور ایسا ہی اس سے معاملہ کرتے تھے۔ یہ عادت ان کی طبیعت بن گئی تھی جس میں ذرا بھی تکلف نہ کرنا پڑتا تھا۔[۱]

ایک دفعہ حضرت شیخ الہندؒ نے طلباء سے فرمایا کل تالاب سے مسجد کے لئے کسیر اکھاڑ کر لانا ہے چنانچہ اگلے دن صبح کو چار طلباء کو ہمراہ لیکر چل دیئے۔ تالاب پر پہونچے اور پانچ گٹھریاں باندھیں چار طلباء کے لئے اور ایک اپنے لئے۔ طلباء کے ساتھ سر پر کسیر کی گٹھری رکھ کر لائے اور مسجد میں لاکر بچھادی۔[۲]

طلبا سے محبت

ابھی عرض کیا جاچکا ہے کہ حضرتؒ کو طلبا سے خاص تعلق تھا جس طالب علم کے بارے میں معلوم ہو جاتا کہ "بیمار ہے" آپ اس کی عیادت کے لئے یا تو خود تشریف لے جاتے یا کسی کو بھیج کر دریافت کراتے۔ ایسے ہی ان کی تمام ضروریات کا خیال رکھتے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک طالبعلم نے عرض کیا حضرت! ایک چارپائی کی ضرورت ہے۔ فرمایا۔ اچھا شام کو لے جانا۔ اتفاق کی بات اس طالب علم کو آنے میں دیر ہوئی یا بھول گیا۔ تو آپ گھر سے چارپائی اٹھاکر

---

[۱] اسیر مالٹا ص ۱۰۵ تا ۱۰۷ [۲] بروایت قاری محمد طیب صاحب

خود ہی چلے۔ مسجد چھتہ کے پاس اس طالب علم سے ملاقات ہوگئی۔ فرمایا۔ بھائی بہت دیر تک انتظار کیا۔ میں سمجھا شاید تم بھول گئے ہو۔ یہ کہہ کر چارپائی حوالہ کر دی[1]

ایک دن طلباء نے کہا حضرت تیرنا سکھلا دیجئے۔ چنانچہ جمعہ کے دن سویرے طلبا کو ہمراہ لیکر دیوبند سے باہر تالاب پر گئے۔ اور ہر ایک کو تیرنا سکھایا۔ ایک پنجابی طالب علم نے کہا حضرت! لائیے میں آپ کی کمر مل دوں۔ یہ کہہ کر اس نے کمر ملنا شروع کر دی۔

حضرت شیخ الہندؒ کا جسم بہت نرم تھا۔ طالب علم نے سمجھا میل بہت ہے اس لئے فوراً ہی ریت اٹھا کر ملنا شروع کیا۔ جس کی وجہ سے کھال چھل گئی مگر حضرت نے اُف نہ کی۔ جب واپس ہوئے تو راستہ میں ایک بیل کو دیکھا جس کی کمر سے خون جاری تھا۔ پنجابی طالب علم نے کہا کسی ظالم نے اس کو کتنی بری طرح مارا ہے۔ حضرت نے فرمایا جی ہاں کسی پنجابی نے اس کی کمر ملی ہوگی[2]

ایک عجیب واقعہ حضرت شیخ الہندؒ کی عادت شریفہ تھی کہ ہر سال قربانی کے لئے بچھڑا خریدا کرتے تھے۔ سال بھر تک اس کی خوب خاطر کرتے۔ اور اپنی اولاد کی طرح رکھتے تھے۔ ایک دفعہ جو بچھڑا خریدا وہ آپ سے بہت زیادہ مانوس ہوگیا۔ حضرت جب دارالحدیث درس دینے کے لئے تشریف لے جاتے تو وہ بچھڑا بھی ہمراہ جاتا۔ اور دارالحدیث کے باہر بیٹھ جاتا۔ جب آپ سبق سے واپس ہوتے تو بچھڑا بھی آپ کے پیچھے پیچھے واپس ہوتا۔ لیکن جب قربانی کا دن آیا تو حضرت شیخ الہندؒ نے تعمیل حکم خداوندی میں خود اپنے دست مبارک سے اس کو ذبح کیا۔ راوی کا بیان ہے

---

[1] بروایت مولانا محمد جلیل صاحب خادم شیخ۔ [2] بروایت قاری محمد طیب صاحب

کہ اس وقت حضرت کی یہ حالت تھی کہ ہاتھ سے چھری چلا رہے تھے اور آنکھوں سے اشک ریزاں تھے۔[1]

میاں اصغر حسین کی تالیف سے

حضرت شیخ الہندؒ سادہ اور بیتکلف طالب علمانہ صفت کے لوگوں سے نشاط پاتے تھے اور رئیسانہ ساز و سامان اور بے موقعہ تکلف سے نہایت منقبض ہوتے چنانچہ کسی تقریب سے ریاست رامپور جانے کا اتفاق ہوا اور کسی معزز شخص کے ہمراہ نواب صاحب کے سجے ہوئے کمرے میں پہونچے۔ انتہائی زیب و زینت تھی۔ جا بجا نقشے اور تصویریں تھیں۔ مکلف قالین اور بستر لگے تھے۔ خود فرماتے تھے کہ اسقدر انقباض ہوا۔ قریب تھا کہ دم گھٹ کر نکل جائے۔ فوراً باہر آگئے۔

ایک مناظرہ کے جلسہ میں ریاست رامپور میں حضرت مولانا احمد حسن صاحب امروہی اور بڑے بڑے علما بلائے گئے۔ حضرت کی خدمت میں بھی تار آیا۔ کچھ عذر فرما دیا لوگوں نے عرض کیا حضرت! دوسرا تار آوے گا۔ فرمایا پھر آوے گا تو لکھوا دیں گے کہ آنے کے لئے تیار نہیں وہ خود سمجھ لیں گے کہ ایسے مولوی کو کیا بلائیں جو مناظرہ کے لئے کتابیں دیکھنے کا محتاج ہو اور اگر یہ سمجھ لیا کہ حاضری کے قابل کپڑے نہیں تو اور بھی خوب ہوگا۔

مولانا اشرف علی صاحب کے اصرار سے ایک مرتبہ جامع العلوم کانپور کے جلسہ دستار بندی میں وعظ شروع فرمایا۔ حضرت مولانا ایک بڑا عالی مضمون بیان فرما رہے تھے جس میں معقول کا ایک خاص رنگ تھا۔ مولانا لطف اللہ صاحب علیگڑھی اثنائے وعظ میں آکر شریک جلسہ ہوئے۔ حضرتؒ کی ان پر نظر پڑی تو فوراً ہی درمیان سے وعظ قطع

---

[1] بروایت مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی انصاری۔

فرماکر بیٹھ گئے۔ کسی نے عرض کیا حضرت یہی تو وقت تھا۔ ارشاد فرمایا اسی وجہ سے تو بیٹھ گیا ہوں۔

مہمانوں کی خدمت خود فرماتے۔ مہمانوں کے سامنے زنان خانہ سے کھانا خود لاکر رکھتے۔ ان کے لئے لحاف بچھونے خود اندر سے اٹھا اٹھا کر لاتے۔ باوجودیکہ اسارت مالٹا سے واپسی کے بعد آپ بہت زیادہ کمزور اور نحیف ہوگئے تھے۔ مگر مہمانوں کی خدمت کے لئے نئی طاقت آپ کے جسم میں آجاتی تھی۔

ایک دفعہ مولوی ممتاز علی صاحب لاہوری کے ہمراہ ایک ترک آئے پہلے تو اس خیال سے کوئی التفات نہ کیا ممکن ہے کہ کوئی نیچری ہو لیکن جیسے ہی معلوم ہوگیا۔ فوراً ہی معذرت چاہی اور اندر سے موڑھا لاکر باصرار اس پر بٹھلایا۔

نظر و فکر کے لئے آپ کو کافروں اور بددینوں سے سخت نفرت تھی اور اہل ایمان و دینداروں سے نہایت انس اور مناسبت تھی۔ ایک مرتبہ صاحبزادہ محترم حضرت مولانا مسعود احمد صاحب گنگوہی کو ایک مکلف بہلی میں رخصت کیا بہلبان ہندو تھا۔ اس کے کھانے کا فکر ہوا۔ لوگوں نے عرض کیا نقد دیدیا جائے فرمانے لگے خیر۔ بھائی اگر ٹوٹی سے ٹوٹی گاڑی ہو اور بہلبان مسلمان ہو تو وہ مجھے بہت پسند ہے۔[1]

لڑکیوں کے عقد حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے اولاد ذکور میں سے تو کوئی نہیں تھا البتہ چار لڑکیاں تھیں۔ ان چاروں کی شادیاں اپنے استاذ محترم حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے طرز اور سنت کے بالکل مطابق کیں۔ کبھی جامع مسجد میں اعلان کرکے

---

[1] حیات شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ از میاں اصغر حسین صاحب بلفظہٖ۔

وہیں لڑکے کو بٹھالیا اور نکاح کر دیا۔ اور کبھی مدرسہ میں طلبا اور علما کے مجمع میں۔ لڑکی کو معمولی کپڑے پہنا کر اور ڈولی میں بٹھلا کر رخصت کر دیا۔ رخصت کے وقت لڑکیوں کو کچھ ضروری چیزیں بھی جہیز میں عطا کیں لیکن دنیاوی نام ونمود سے کوسوں دور رہے۔

حضرت اقدس رح نے تمام عمر کوئی تعمیر نہیں کرائی۔ والد ماجد کے تعمیر فرمودہ مکانات تھے بس انھیں پر اکتفا کیا۔ ایک مرتبہ باورچی خانہ کی ضرورت محسوس کی۔ حضرت کی خواہش تو یہ تھی کہ پھونس کا بنوا دیں۔ مگر لوگوں کے اس مشورے سے کہ آگ لگنے کا اندیشہ رہتا ہے۔ اس لئے معمولی طور پر پختہ اینٹوں سے تعمیر کرا لیا تھا۔

خود ابتدائی عمر میں عرصہ تک اپنے مکان میں رہے۔ اس کے بعد محلہ کی قریبی مسجد کے حجرے میں مطالعہ اور کتب بینی کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس کے بعد مسجد چھتہ کے اس حجرے میں رہے (جس میں حضرت نانوتوی رح رہا کرتے تھے اور پھر بعد میں طلبا کا قیام ہو گیا (راقم سطور بھی عرصہ تک اس کمرے میں رہا ہے)

کھانے میں عادت شریفہ اپنے خورد ونوش میں حضرت رح نے کبھی تکلف سے کام نہیں لیا۔ وقت پر جیسا کھانا مل گیا اسی کو نہایت شوق ورغبت سے تناول فرما لیا۔ مکان پر یا ضیافت میں اگر عمدہ سے عمدہ کھانا ہوتا تو اس کو بشکر تناول فرماتے۔ دعوت کرنے والوں کی دعوتیں حتی الامکان رد نہ فرماتے۔ ایک مرتبہ دہلی میں دعوتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ آپ نے ہر ایک کے یہاں جا کر کھانا تناول فرمایا، ساتھ میں مولانا مرتضےٰ حسن صاحب بھی تھے۔ انھوں نے پہلے ہی دستر خوان پر خوب سیر ہو کر کھایا۔ دوسرے اور تیسرے دستر خوان پر جب پہونچے تو عرض کیا حضرت اب تو کھایا نہیں جاتا۔ تب آپ نے ارشاد فرمایا "کیا خدا کے رازق

ہونے کا یقین نہیں تھا جو اتنا زیادہ کھالیا؟[1]

کھانے کا بھی عجیب ڈھنگ تھا۔ دوسروں کو یہ معلوم ہوتا کہ خوراک زیادہ ہے مگر سب سے کم کھاتے۔ کبھی شوربے سے لقمہ لگالیا۔ کبھی چٹنی چاٹ لی۔ کبھی کوئی قتلہ اٹھا لیا۔ کبھی دوسروں کے سامنے چیزیں اٹھا اٹھاکر رکھنا شروع کر دیں غرضکہ آخر تک سب کے ساتھ رہتے اور حساب میں صرف چند لقمے ہی کھا پاتے تھے۔ حضرت فرمایا کرتے تھے۔ اگر کسی آدمی کی عادت کم سونے اور کم کھانے کی ہوجائے تو اس سے صحت پر اثر نہیں پڑتا۔[2]

قرآن پاک اور حدیث شریف میں جن کھانوں کی فضیلت مذکور ہے انکو بہت کثرت سے استعمال فرماتے تھے۔ مثلاً سرکہ کے متعلق حدیث شریف میں موجود ہے۔

نعم الادام الخل — سرکہ خوب سالن ہے۔

اس لئے دسترخوان پر اگر سرکہ ہوتا تو اس کی طرف زیادہ توجہ فرماتے تھے بلکہ بعض دفعہ ایک دو گھونٹ پی بھی لیتے تھے۔ ایک دفعہ آپ کے جسم پر پھنسیاں اور دنبل نکل آئے۔ اطباء نے سرکہ سے منع کر دیا مگر آپ اور کچھ نہیں تو کچھ ضرور لیتے تھے۔ گوشت کے متعلق حضور صلعم کا ارشاد گرامی ہے۔

اطیب الطعام اللحم — گوشت ستھرا اور پاکیزہ کھانا ہے۔

اسلئے اس کو بھی بہت رغبت سے کھاتے تھے خصوصاً قربانی کے گوشت کو دعوت رب العالمین سمجھ کر دن میں دو دو، تین تین مرتبہ تناول فرماتے اور گوشت کے باریک پارچے نمک لگاکر خشک کر لیتے اور کافی دنوں تک اس کو مختلف طریقوں سے

---

[1] روایت مولانا معراج الحق صاحب مدرس دارالعلوم دیوبند [2] بروایت مولانا محمد جلیل صاحب۔

تناول فرمایا کرتے تھے۔

شہد بھی نہایت رغبت سے تناول فرمایا کرتے۔ حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی مدینہ منورہ سے زمزم کا کنستر بھیجا کرتے تو اس وقت آپ کی فرحت کا عجیب عالم ہوتا خود بھی پیتے اور لوگوں میں بھی تقسیم فرماتے آخر کیوں نہ کرتے حضور صلعم کا ارشاد گرامی ہے۔

من اھدی الیہ شیأ — جس کی طرف ہدیہ کوئی چیز آئے اس
فلجلسأہ شرکاءہ — کے ہمنشین ایمیں شریک ہوتے ہیں۔

حدیث میں زیتون کے تیل کے متعلق ارشاد ہے۔

کلوا الزیت وادھنوا بہ — روغن زیتون کھاؤ اور اس سے
فانہ من شجرۃ مبارکۃ — مالش کرو اس لئے کہ یہ مبارک
درخت سے حاصل ہوا ہے۔

چنانچہ مالٹا میں روغن زیتون کی کثرت تھی وہاں اسی کا استعمال فرماتے حضرت فرمایا کرتے تھے کہ اگرچہ لوگ ہندوستان سے گھی بھی بھیجتے تھے مگر مجھے تو گھی کے مقابلہ میں یہی پسند تھا۔ فرماتے ہیں ایک پیالی میں بھرکر اپنے پاس رکھ لیتا تھا کبھی انگلی سے کان میں لگا لیتا اور کبھی ناک میں اور کبھی سر پر مل لیتا تھا۔

پان کی عادت

آپ کو پان کھانے کی بھی عادت تھی۔ ایک ڈبیہ میں پان اور بٹوے میں چھالی تمباکو ہوتا تھا سفر حضر میں ساتھ رہتا۔ اثنائے درس میں بھی چند مرتبہ کھاتے۔ فرماتے ہیں ایک مرتبہ مالٹا میں پان چھوڑنے کا ارادہ کرلیا تھا۔ مگر ہندوستان سے پان چلے گئے تھے۔ اسی کو خشک کرکے بہت دنوں تک کھاتا رہا غرضکہ پان چھوڑنے کی تکلیف نہ ہوئی۔[1]

[1] سیدنا و مرشدی و مولائی حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رح اگرچہ (باقی اگلے صفحہ پر)

روپئے سے بے رغبتی

گھر کے حسابات سے آپ کو کوئی واسطہ نہیں تھا کہ کیا خرچ ہو رہا ہے۔ اور کہاں سے خرچ ہو رہا ہے اگر ہدایا میں کہیں سے کچھ روپیہ آیا تو اس کو کبھی گن کر نہیں دیکھا بلکہ کبھی اپنے خادم حضرت مولانا نبی بخش صاحب کو دیدیتے اور کبھی تکیہ کے نیچے رکھدیتے تھے۔ اگر کبھی کسی نے روپیہ کا ذکر بھی کیا تو پیشانی پر شکن آجاتی اور ناگواری کے آثار پیدا ہونے لگتے تھے۔[1]

گذشتہ سے پیوستہ

پان کے عادی اس معنی کر تو نہیں تھے کہ نہ کھانے کی وجہ سے کچھ تکلیف ہو۔ پھر تمباکو کا استعمال نہیں فرماتے تھے بلکہ لکھنؤ کی بنی ہوئی الائچی پان میں استعمال فرماتے تھے۔ اس سے ظاہر ہے کہ عادی تو نہ تھے مگر ان حضرات کا اتباع بھی عجیب معاملہ ہے نہم لبنة علے لبنة یعنی اینٹ کو اینٹ پر رکھنا۔ محض اتباع شیخ کی وجہ سے پان کھاتے تھے۔

[1] یہی حال میں نے مرشد عالم حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رح کا دیکھا ہے کبھی آپ نے اپنے معتمد خصوصی جناب قاری اصغر علی صاحب سے حساب نہیں لیا۔ روپے سے کوئی رغبت نہ تھی نہ یہ خیال تھا کہ کہاں سے آئے گا اور کیا خرچ ہو گا۔ سچ ہے جانشین رسول صلعم کہلانے کے یہی حضرات مستحق ہیں نہ کہ آج کل کے زر پرست اور پونجی پتی علما۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قیام دارالعلوم دیوبند

سیاست حاضرہ اور جہاد حریت

وفات شیخ الہند رح

مدرسہ عربیہ — یا — دار العلوم دیوبند کا قیام

ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے اثر و نفوذ نے ہندوستان کی علمی دنیا کو نیست و نابود کر دیا تھا جس کی وجہ ڈاکٹر سید محمود کے الفاظ میں یہ تھی کہ "تجارت اور دیگر ذرائع سے ہندوستان سے زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کریں اس سے وہ اہل ہند کو تعلیم نہ دینا چاہتے تھے"

ایسٹ انڈیا کمپنی اپنے اس عقیدہ میں اتنی زیادہ سخت تھی کہ جب مسٹر ولبر فورس نے ۱۷۹۲ء میں پارلیمنٹ کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ ہندوستان میں عیسائیت کی اشاعت اور تعلیم کے ذرائع مہیا کئے جائیں تاکہ ہندوستان کے لوگ تعلیم پاکر عیسائی ہو جائیں اور سلطنت زیادہ محفوظ ہو جائے تو مالکان ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس تجویز کی زبردست مخالفت کی اور کہا کہ

> ایک مذہب کے قائم ہو جانے سے انسانوں کے مقاصد متحد ہو جاتے ہیں، اور اگر یہ ہو گیا تو ہندوستان میں انگریزوں کی برتری کا خاتمہ ہو جائیگا لوگوں کو اپنے مذہب میں لانے کا اصول اس اٹھارویں صدی میں خلاف مصلحت ہے۔ اگر چند لاکھ عیسائی بھی وہاں ہو گئے تو اس سے سخت مصیبت آجائے گی۔ امریکہ میں درسگاہیں اور کالج قائم ہونے کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ وہ ملک ہمارے ہاتھ سے نکل گیا اسی طرح نوجوان پادری جب اندرون ہند

میں پھیلیں گے تو کمپنی کے فوائد کا خاتمہ ہو جائے گا۔

اس مخالفت کا نتیجہ یہ ہوا کہ تجویز گر گئی لیکن زمانے کے ساتھ ساتھ ضروریات میں اضافہ ہوتا گیا اور انتظام کے سلسلے میں ہندوستانیوں کی ضرورت محسوس ہوتی گئی۔ چنانچہ کلکتہ میں ۱۷۸۱ء میں مسلمانوں کی عربی فارسی تعلیم کے لئے وارن ہیسٹنگز نے ایک کالج کھولا اور دوسرا سنسکرت کالج بنارس میں ۱۷۹۱ء میں کھولا ۱۸۱۴ء میں ڈائرکٹران کمپنی نے گورنر جنرل کے نام ایک سرکلر جاری کیا کہ سنسکرت کی سرپرستی کی جائے اور ہندوؤں کے علوم کی ہمت افزائی کی جائے۔ چنانچہ ۱۸۱۶ء میں کلکتہ میں پہلا انگریزی کالج قائم ہوا اور ۱۸۱۸ء میں جے نرائن کالج مدراس میں اور ۱۸۲۱ء میں ہندو کالج پونا میں اور ۱۸۲۳ء میں آگرہ کالج آگرہ میں قائم کیا گیا۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے وہ معافیات ۱۸۲۸ء میں ضبط کر لی گئیں جو مسلمان نوابوں نے مسلمانوں کی تعلیم کے لئے دی تھیں۔ وقف ہگلی کا بیجا استعمال کیا گیا۔ یہ وقف ۱۸۰۶ء میں کیا گیا تھا لیکن گورنمنٹ نے واقف کی مرضی کے خلاف انگریزی کالج بنا دیا اور مسلمانوں کو نہ صرف اس کے انتظام سے بلکہ اس کی تعلیم سے بھی محروم کر دیا بقول ہنٹر اس کے تین سو طلبا میں صرف تین مسلمان تھے۔ ۷ مارچ ۱۸۳۵ء میں لارڈ ولیم بنٹنگ نے ایک حکم جاری کیا کہ تعلیم عامہ اور وظائف کا کل روپیہ صرف انگریزی تعلیم پر صرف کیا جائے جس کے یہ معنی تھے کہ کلکتہ کی امداد کے طور پر مسلمانوں کو جو امداد ملتی تھی وہ بھی بند ہو گئی۔ ان ہی دنوں میں لارڈ میکالے نے اپنے خطبہ صدارت میں کہا۔

ہمیں ایسی جماعت بنانی چاہیئے جو ہم میں اور ہماری کروڑوں رعایا کے درمیان مترجم ہو اور یہ ایسی جماعت ہونا چاہیئے جو خون اور رنگ کے اعتبار سے

تو ہندوستانی ہو مگر رائے اور مذاق کے اعتبار سے انگریز ہو۔

لارڈ میکالے نے اپنے والد کو ایک خط میں لکھا تھا۔

اس تعلیم کا اثر ہندوؤں پر بہت زیادہ ہے کوئی ہندو جو انگریزی داں ہے کبھی اپنے مذہب پر صداقت کے ساتھ قائم نہیں رہتا۔ بعض لوگ مصلحت کے طور پر ہندو رہتے ہیں مگر بہت سے یا تو موحد ہو جاتے ہیں یا مذہب عیسوی اختیار کر لیتے ہیں۔ میرا پختہ عقیدہ ہے کہ اگر تعلیم کے متعلق ہماری تجویز پر عمل کیا گیا تو تیس سال بعد بنگال میں ایک بت پرست بھی باقی نہ رہے گا۔

اس سلسلہ میں سررشتہ مدراس کی اس تجویز (۱۸۴۶ء) کا ذکر بھی نامناسب نہ ہوگا جس میں کہا گیا تھا کہ گورنمنٹ اسکولوں میں انجیل کو بطور اختیاری مضمون پڑھایا جائے اس تجویز کی تائید میں مارکوئیس گورنر مدراس نے متعدد دلائل پیش کرتے ہوئے کہا تھا۔

رفتہ رفتہ کل لڑکے انجیل کے اختیاری مضمون کو پڑھنے لگیں گے جس سے ان میں اخلاقی ترقی ہوگی سرکاری ملازمت کے لئے ضروری ہے کہ بہ نسبت ہندو یا مسلمانوں کے مذہبی اخلاق کو زیادہ مضبوط بنیادوں پر قائم کیا جائے۔

(روشن مستقبل)

لیکن کورٹ آف ڈائرکٹران نے ۲۳ مارچ ۱۸۴۶ء کو یہ تجویز نامنظور کر دی تاہم تعلیمی مدد کا روپیہ عیسائیت کی تبلیغ پر صرف ہوتا۔ سر فریڈرک لکھتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ہندو کالج میں انجیل کی تعلیم اس قدر زیادہ ہے کہ انگلستان

کے کسی پبلک اسکول میں نہیں ہے (روشن مستقبل)

قیام مدارس دینی کے اسباب مذکورہ افسوسناک حالات سے ہندوستان گزر رہا تھا۔ سرکاری حکمت عملیوں کے علاوہ عیسائیت کی اشاعت کیلئے تصانیف کا سلسلہ بھی جاری تھا لیکن عیسائیت کے لئے ہندوؤں میں جتنا وسیع میدان تھا اتنا ہی مسلمانوں میں تنگ نظر آتا تھا۔ اس مشکل کو دور کرنے کے لئے جہاں عیسائیوں نے اسلام کے خلاف ذلیل ترین کتابیں لکھیں وہاں مناظروں کی بھی داغ بیل ڈالی۔ غرضکہ ہر ممکن طریقے سے مسلمانوں کو عیسائی بنانے کی تدابیر اختیار کی گئیں[1]۔

ادھر تو حکومت کی یہ پالیسی تھی کہ ہندوستان سے اسلام کی جڑوں کو کھود کر باہر پھینک دیا جائے جیسا کہ ....

دوسری طرف مسلمان اقتصادی بدحالی کا شکار تھے ان کے اوقاف اور مدارس تباہ ہو چکے تھے حد یہ ہے کہ دلی کی آخری درسگاہ بھی ختم ہو گئی تھی اس کے مدرسین بددل ہو کر ہجرت کر کے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ جا رہے تھے لہٰذا ضرورت تھی کہ بلے دینی کے اس سیل رواں کو روکنے کے لئے جگہ جگہ مدارس قائم کئے جائیں۔

تحریک قاسمی چنانچہ وقت کی اس اہم پکار کو اسلام کے مایۂ فرزند (حضرت نانوتوی اور انکے ساتھیوں نے سنا اور لبیک، کہا۔ اسوقت قیام مدارس پہاڑ سے جوئے شیر لانا تھا۔ مسلمانوں میں اتنا دم کہاں تھا کہ وہ اپنے بچوں کی تعلیم کا انتظام کریں۔ ان کے املاک اور جائدادیں تباہ ہو چکی تھیں۔ بڑے بڑے رؤسا

---

[1] مدینہ جوبلی نمبر ۱۹۳۹ء۔

نان شبینہ کو محتاج تھے۔ ایسی حالت میں کس طرح قیام مدارس ہوتا۔ اور کہاں سے طلبا فراہم ہوتے جبکہ دینی تعلیم دلانا اور اسلامی مدارس کھولنا حکومت کے پلان کے بھی خلاف تھے۔ لیکن انھوں ..... نے ہمت نہ ہاری اور عملی طور پر حکومت کے پلان کو چیلنج کر دیا۔ اس وقت کے حالات کے مطابق حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی نے فرمایا ہے

جب تک مولوی قاسم موجود تھے مجھکو یقین تھا کہ پہلے یہ ہمارا سر کٹوائیں گے پھر اپنا۔[1]

ایسے حالات میں حضرت نانوتوی نے اعلان کیا "اے مسلمانو! ہمیں صرف تمہاری اولادیں درکار ہیں ہم ان کی ضروریات زندگی۔ تعلیم اور کتابوں ور اساتذہ کا انتظام کریں گے۔ ہم تم سے اور کچھ نہیں چاہتے" بہرحال اس وقت کے حالات آج کل کے حالات سے کمتر نہ تھے۔

حضرت مولاناؒ کی آواز کو لوگوں نے سنا اور جگہ جگہ مدارس قائم کئے۔ سب سے پہلے ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۶ء میں دیوبند میں مسجد چھتہ میں چند علما نے ملکر ایک مدرسہ قائم کیا۔ جن کے اسمار گرامی یہ ہیں (۱) حضرت حاجی سید عابد حسین صاحب۔ (۲) حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب (۳) حضرت مولانا مہتاب علی صاحب (۴) منشی فضل حق صاحب۔ اس کے چھ مہینہ بعد رجب ۱۲۸۳ھ میں مظاہر علوم سہارنپور میں اور ۱۲۹۶ھ مطابق ۱۸۷۹ء میں مدرسہ شاہی مرادآباد میں اور ۱۳۰۳ھ میں جامع مسجد امروہہ میں اسی نہج پر مدارس قائم ہوئے جس نہج پر مدرسہ عربیہ دیوبند

---

[1] مکتوبات شیخ الاسلام ص ۳۷ ج ۱۔

کا قیام عمل میں آیا تھا۔

قیام مدارس کے سلسلہ میں حضرت قاسم العلوم والخیرات کی شخصیت اس وقت ایک جماعتی شخصیت تھی جیسا کہ آج کل یہی کام دینی تعلیمی بورڈ اور دینی تعلیمی کونسل کے ذریعہ ہو رہا ہے بالکل یہی کام حضرت قاسم العلوم کر رہے تھے۔ ان ایام میں مولانا کبھی ایک جگہ مقیم نہیں رہے بلکہ کبھی سہارنپور اور کبھی میرٹھ اور کبھی دہلی مقیم رہ کر اپنے مشن کو چلاتے رہے اور ان کی تحریک پر اسی نہج پر مدارس قائم ہوتے رہے۔ میری رائے میں حضرت مولانا رح کو کسی ایک مدرسہ کا بانی قرار دینا ایک تاریخی غلطی ہے اور ایک تاریخی شخصیت کے ساتھ بے انصافی ہے بلکہ حضرت رح کی شخصیت بالکل ایک تحریک کی سی ہے کہ جس کی ایک آواز پر مختلف علاقوں میں مختلف افراد نے مدارس قائم کئے اور ان کو ان ہی لائینوں پر چلایا جو حضرت قاسم العلوم کی تجویز کردہ تھیں۔ چنانچہ تھوڑے عرصہ کے بعد لوگوں نے دیکھا کہ ان مدارس سے علماء پیدا ہوئے کہ جنھوں نے عیسائیوں سے مناظرے کئے اور ان کی کتابوں کو رد کیا۔ اور جگہ جگہ دینی تعلیم کی چھاؤنیاں بنائیں جس کا سلسلہ آج تک ہندوستان ہی نہیں بلکہ بیرون ہند اطراف عالم میں پھیلا ہوا ہے اور برابر ترقی پذیر ہے۔ حضرت قاسم العلوم والخیرات کے منصوبہ سے پہلے دنیا میں کوئی ایک فرد بھی ایسا نہیں تھا کہ جس کے ذہن میں یہ خیال ہو کہ عوام بلا حکومت کی امداد کے اتنا بڑا تعلیمی انقلاب لا سکتے ہیں۔ آج جبکہ ملک آزاد ہے مگر حکومت مفت تعلیم کو اس معیار پر نہیں لا سکی ہے کہ جس معیار پر حضرت قاسم العلوم کے منصوبے کے مطابق آ چکی ہے۔ بلا شبہ ہندوستان کے تمام مدارس اسلامیہ حضرت مولانا رح کی تحریک کے مرہون منت ہیں وہ اگرچہ کسی خاص مدرسہ کے بانی نہ بھی

لیکن کوئی مدرسہ ان کی تحریک سے خارج بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس جگہ ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر مدرسہ عربیہ دیوبند کا بانی کون ہے اس کا جواب ہم سطور ذیل میں دیتے ہیں

دارالعلوم دیوبند کا بانی

اگر مدرسہ عربیہ دیوبند المعروف بہ دارالعلوم دیوبند کی ابتدا ر ۱۲۸۳ھ مسجد چھتہ سے مانی جائے تو بلا شک و شبہ اس کے بانی حضرت حاجی سید محمد عابد حسین صاحب دیوبندی ہیں حضرت مولانا محمد قاسم رح صاحب نہیں ہیں کیونکہ

۱۔ جس وقت مدرسہ مذکور کے لئے چندہ کیا گیا تو اس وقت حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ دیوبند میں موجود نہ تھے اور نہ ان کو اس کی خبر تھی بلکہ وہ بروایت حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ صدر مدرس مدرسہ عربیہ دیوبند میرٹھ میں تصحیح کا کام کر رہے تھے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

پھر مولوی صاحب نے مطبع احمدی میں تصحیح کتب کی مزدوری کرلی۔

یہ واقعہ ۱۲۶۷ھ کا ہے بعد ۱۲۶۷ھ لغایۃ ۱۲۸۹ھ آپ سہارنپور، میرٹھ، دھلی میں کتابت یا تصحیح کتب کا کام کرتے رہے۔ حضرت میاں اصغر حسین صاحب حضرت شیخ الہند رح کی تعلیم کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

> ۱۲۸۶ھ میں کتب صحاح ستہ اور بعض دیگر کتب اپنے فخر زمانہ استاذ حجۃ اللہ البالغہ مولانا محمد قاسم صاحب سے شروع کیں۔ مولانا ممدوح میرٹھ میں منشی ممتاز علی صاحب کے مطبع میں تصحیح کا کام کرتے تھے پھر یہ مطبع دہلی منتقل ہو گیا تو مولانا ممدوح بھی دہلی مقیم ہو گئے اور کبھی کبھی دیوبند اور اپنے وطن نانوتہ بھی تشریف لے جا کر مقیم رہے۔ حضرت مولانا نے ان سب مقامات میں اکثر

اپنے باکمال استاذ کے ساتھ رہ کر دل وجان سے قابل رشک خدمت کرکے سعادت حاصل کی الخ [1]

اس تحریر سے یہ معلوم ہوا کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ ۱۲۸۶ھ تک دہلی اور میرٹھ وغیرہ رہے۔ تذکرہ مشائخ دیوبند کے مندرجات سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مولانا محمود حسن صاحب اور حضرت مولانا احمد حسن صاحب امروہی وغیرہ حضرات نے حدیث شریف حضرت مولانا سے دہلی اور میرٹھ رہ کر پڑھی۔ غرضیکہ ۱۲۸۹ھ یا ۱۲۹۰ھ سے قبل حضرت نانوتوی رح کا مدرسہ عربیہ دیوبند سے باضابطہ تعلق ثابت نہ ہوسکا۔ آپ کی آمد ورفت اپنے بہنوئی کے یہاں ضرور رہتی تھی اور وہ بھی اس طرح جیسے عام طور پر رشتہ داریوں میں ملنے ملانے جاتے ہیں۔

۲۔ سب سے پہلے حضرت حاجی سید محمد عابد حسین صاحب نے چندہ کیلئے رومال پھیلایا اور پانچ روپلے اپنی جیب خاص سے نکال کر رومال میں ڈالے اس طرح سید صاحب نے شام تک مبلغ تین سو روپلے جمع کرلئے۔ اس کے بعد سید صاحب کو مدرس کی ضرورت پیش آئی۔ تو آپ نے حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کو مدرسی کے لئے میرٹھ کو خط لکھا

کل عصر اور مغرب کے درمیان تین سو روپلے جمع ہوگئے اور اب آپ تشریف لے آئیے۔ [2]

حضرت نانوتوی نے جواب تحریر فرمایا۔

میں بہت خوش ہوا خدا بہتر کرے مولوی ملا محمود صاحب کو پندرہ روپیے

---

[1] حیات شیخ الہندؒ ص۱۱ [2] سوانح قاسمی ص۲۵۰۔

ماہوار پر مقرر کر کے بھیجتا ہوں وہ پڑھائیں گے اور میں مدرسہ مذکور کے حق میں ساعی رہوں گا۔[1]

اس سے معلوم ہوا کہ اصل بانی حضرت حاجی صاحب ہیں۔ حضرت نانوتوی رح کو انھوں نے مدرسی کی غرض سے بلایا تھا اور اسی سے انھوں نے انکار کر دیا تھا تعجب ہے حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے کیسے تحریر فرما دیا ہے کہ "حضرت نانوتوی رح نے مدرسہ مسجد چھتہ میں پڑھایا ہے"[2] لیکن اس کے متعلق ہم اوپر تحریر کر آئے ہیں۔ اگر مولانا پڑھانے کے لئے بھی تشریف لے آتے تب بھی ہم انکو بانیوں کے زمرے میں شمار کر لیتے لیکن ایسا نہیں ہوا۔

مدرسہ عربیہ دیوبند کی ابتدائی کارروائی اور اس کے لئے کوشش کرنیوالوں میں صرف مندرجہ بالا چار حضرات ہی کا نام سامنے آتا ہے لیکن اس مدرسہ سے قلبی تعلق۔ اس کے لئے دعائیں۔ اور کوششیں کرنے میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی۔ حضرت شاہ عبدالغنی صاحب مہاجر مدنی۔ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی اور حضرت قاسم العلوم۔ سب ہی حضرات داخل ہیں جن کو تاریخی اعتبار سے بانی نہیں کہا جا سکتا۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کا اسم گرامی بجز مندرجہ بالا مکتوب کے دارالعلوم دیوبند کے کسی شعبہ میں ۱۲۹۰ھ تک نہیں ملتا ہاں ۱۲۹۲ھ میں جب دارالعلوم دیوبند کا موجودہ خاکہ تیار ہوا تو اس میں حضرت مولانا کی شخصیت پیش پیش نظر آتی ہے۔ لیکن افسوس کہ دارالعلوم کی ابتدا ۱۲۸۳ھ بتائی جاتی ہے۔

---

[1] سوانح قاسمی ص۲۵۔ [2] تذکرہ مشائخ دیوبند ص۲۔ مسلک علمائے دیوبند۔

۳۔ مدرسہ کے مہتمم صاحبان

۱۔ حاجی سید عابد حسین صاحب از ۱۲۸۳ھ تا ۱۲۸۴ھ۔ دوسری مرتبہ از ۱۲۸۶ھ تا ۱۲۸۸ھ۔ تیسری مرتبہ از ۱۳۰۶ھ تا ۱۳۱۰ھ۔

(۲) حضرت شاہ رفیع الدین صاحب از ۱۲۸۴ھ تا ۱۲۸۵ھ۔ دوسری مرتبہ از ۱۲۸۸ھ تا ۱۳۰۶ھ درمیان کی مدت میں ہر دو حضرات یکے بعد دیگرے حج کے لئے تشریف لے گئے تھے۔

ہماری مندرجہ بالا تاریخی معلومات اور دارالعلوم دیوبند کی روئداد سے یہی ظاہر ہوتا ہے۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کبھی دارالعلوم کے مہتمم بھی نہیں رہے ۱۲۹۰ھ میں یہاں پہلا دورہ حدیث شریف ہوا اس وقت کے مدرسین کی فہرست میں بھی مولانا علیہ الرحمتہ کا اسم گرامی نہیں ملتا ہاں اس میں شک نہیں کہ ۱۲۸۶ھ میں حضرت شیخ الہندؒ نے ان سے کتب صحاح ستہ دہلی وغیرہ رہ کر پڑھی ہیں۔

۴۔ یہ تاریخی تبدیلی کب سے؟

ہمارے پاس ایک بہت ہی قدیم رسالہ ہے اس کی ظاہری حالت سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کی عمر نصف صدی سے زائد ہو چکی ہے۔ ذیل میں اس کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔

> دو تین سال سے روئداد سالانہ مدرسہ عربیہ دیوبند میں جہاں جہاں مدرسہ کا ذکر آیا ہے مولانا محمد قاسم صاحبؒ کو بانی مدرسہ لکھا ہوا دیکھا جاتا ہے اور نیز جب کہ ۲، جنوری ۱۹۰۵ء کو جناب لفٹنٹ گورنر صاحب بہادر ممالک متحدہ دام اقبالہٗ بغرض معائنہ مدرسہ عربیہ دیوبند تشریف

لائے تو اس بڑے جلسہ میں بھی جس میں علاوہ معززین اصحاب دیوبند و بیرونجات
خود ہز آنر منفس نفیس رونق بخش جلسہ تھے علاوہ اور خلاف باتوں کے خصوصیت
کے ساتھ یہ اظہار کیا گیا کہ مدرسہ عربیہ دیوبند کے بانی حضرت مولانا محمد قاسم
صاحبؒ ہیں چنانچہ روئداد سال ۱۳۲۲ھ و ۱۳۲۳ھ وجلسہ منعقدہ ۶ جنوری
۱۹۰۵ء سے چند اقتباس درج کئے جاتے ہیں۔ الخ

اس کے بعد رسالہ کے مرتب نے اپنے دعوے کے ثبوت میں مذکورہ بالا حوالہ جات
کی متعدد عبارتیں پیش کی ہیں وہ عبارتیں چونکہ طویل ہیں اس وجہ سے ان کو درج
نہیں کیا جا رہا ہے۔ بہرحال مندرجہ بالا عبارت سے یہ چیز بخوبی ظاہر ہے کہ یہ تبدیلی
بیسوی صدی عیسوی کے ساتھ ساتھ آئی ہے۔ اس سے قبل کیا تھا اور کاغذات
مدرسہ میں بانی کس کو لکھا جاتا تھا اس کے بارے میں رسالہ کے مرتب نے حضرت مولانا
ذوالفقار علی صاحب پدر بزرگوار حضرت شیخ الہندؒ کا ایک اشتہار (جس کی تاریخ
طباعت ۶ جمادی الاول ۱۳۰۶ھ ہے) اپنے اس رسالہ میں نقل کیا ہے جس میں حضرت
سید حاجی عابد حسین صاحب ہی کو مدرسہ عربیہ دیوبند کا بانی قرار دیا ہے اس اشتہار
پر حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی جیسے اکابر ہند کے دستخط موجود ہیں۔

۵۔ حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب نے اپنی کتاب الهدیة السنیة فی
احوال مدرسة الدیوبندیة میں بھی حاجی عابد حسین صاحب ہی کو مدرسہ کا
بانی قرار دیا ہے۔ حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب کی وفات ۱۳۲۲ھ میں ہوئی ہے۔

۶۔ اس میں شک نہیں کہ دار العلوم دیوبند کا موجودہ ڈھانچہ حضرت مولانا محمد قاسم
صاحبؒ کا ترتیب دیا ہوا تھا جس میں رنگ آمیزی حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت

شیخ الاسلام ؒ نے کی اور اس کو پایۂ تکمیل تک پہونچایا۔ یقیناً مدرسہ کا یہ خاکہ حضرت حاجی صاحب کے ذہن میں نہ تھا وہ محدود دائرے میں مدرسہ کو چلانا چاہتے تھے اور یہی وجہ اختلاف ان دونوں حضرات میں تھی۔ بعد میں حضرت حاجی صاحب راضی ہوگئے تھے چنانچہ موجودہ عمارت کے سنگ بنیاد رکھنے والوں میں وہ بھی ہیں علاوہ ازیں وہ موجودہ عمارت کے لئے ایک قطعہ آراضی ان ہی کے ایماء سے ان ہی کے اہتمام میں وقف کی گئی جس کا کھیوٹ یہ ہے۔

کھیوٹ بابت سنہ ۱۲۱۱ فصلی

نام پٹی	نام نمبردار	نمبر کھیوٹ	تعداد آراضی	جمع	نام حصہ دار
احمد بنی	آل حسن	۶۱۶	۵ بسوہ	خارج پڑتہ	وقف مدرسہ عربی باہتمام حاجی عابد حسین پسر عاشق علی مرحوم قوم سید ساکن دیہ

الحاصل اگر دارالعلوم کی بنیاد ۱۲۹۲ھ قرار دی جائے تو بلا شک و شبہ اس کے بانی حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ ہیں اور اگر اس کی بنیاد ۱۲۸۳ھ واقع مسجد چھتہ قرار دی جائے تو پھر ہماری گزارشات ہی کو تسلیم کرنا پڑے گا۔

دارالعلوم ــــ منزل بہ منزل

اول تو قیام دارالعلوم دیوبند ہی حکومت کے پلان اور منصوبہ کے خلاف تھا چہ جائیکہ اس کے ارتقائی ادوار وہ تو اس کے چونکا دینے والے ہوئے۔ ان ارتقائی منازل کا نہایت مختصر طور پر سطور ذیل میں ذکر کیا جارہا ہے جن کی وجہ سے حکومت اس کو مشتبہ نظروں سے دیکھنے لگی حالانکہ اس غریب درسگاہ کے قیام کا منشا حکومت سے براہ راست ٹکر لینا ہرگز نہیں تھا۔ چنانچہ دارالعلوم کی روئداد میں صراحۃً ذکر ہے۔

> ان سیاسی امور میں جن کا تعلق براہ راست مذہب اسلام سے ہے اور جن کے متعلق شرعاً و مذہباً تبلیغ ضروری ہے شریک ہونا اور اس کے علاوہ حسب مسلک قدیم مدرسہ دیگر سیاسی امور سے مجتنب رہنا۔[1]

اگرچہ روز اول سے دارالعلوم کا یہی مسلک رہا ہے لیکن حکومت کہ جس کو چھانٹنے کی عادت ہوتی ہے وہ ذرا سے شک سے بھی درپے آزار ہو جاتی ہے اور جب اتنی عظیم الشان سرگرمیاں ہوں تو عناد اور دشمنی کا پیدا ہونا یقینی ہے۔ چنانچہ یوپی کے گورنر لارڈ میگڈانلڈ (جنھوں نے ہندوستان میں اردو ہندی کا قضیہ شروع کیا تھا) نے شملہ جاتے ہوئے جب دیوبند اسٹیشن سے گزرے تو پوچھا کہ یہ کون اسٹیشن ہے۔ اسٹاف کے ایک مسلمان افسر نے جواب دیا "دیوبند" تو لارڈ کا رنگ غصہ سے متغیر

---

[1] روئداد ۱۳۵۸ھ۔

ہو گیا اور کہا ساری شرارتوں کا مرکز یہی ہے۔ میں پہلی فرصت میں اس کا معائنہ کرونگا حضرت گنگوہی حیات تھے۔ دیوبند کے حضرات گھبرائے ہوئے حضرت گنگوہی رحؒ کے پاس گئے تو حضرت نے فرمایا "نہ لاٹ آئے نہ لٹوری" چنانچہ اسی زمانہ میں دیوبند میں بہت زور سے ہیضہ پھیلا اور لارڈ صاحب دیوبند نہ آسکے۔[1]

اجلاس دستاربندی

وہ سرگرمیاں جن سے انگریز خوف زدہ ہوا اور دارالعلوم دیوبند کے آڑے آیا اجلاسہائے دستاربندی کی شروع ہوتی ہیں اور جمعیۃ الانصار اور تحریک ریشمی خطوط کے ناموں سے انقلاب آفریں ثابت ہوتی ہیں۔ دارالعلوم میں ۵ جلسہ دستاربندی ہوئے جن کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ ۱۲۹۰ھ۔ اس جلسہ میں حضرت مولانا محمود حسن صاحب شیخ الہند (۲) مولانا فتح محمد صاحب تھانوی (۳) مولانا عبداللہ صاحب جلال آبادی (۴) مولانا عبدالحق صاحب پورقاضی (۵) مولانا فخرالحسن صاحب گنگوہی۔ پانچ طلبا کی دستاربندی ہوئی

۲۔ ۱۲۹۲ھ۔ اس مرتبہ بھی پانچ علما کی دستاربندی ہوئی۔

۳۔ ۱۲۹۵ھ۔ اس مرتبہ سات علما کی دستاربندی ہوئی۔

۴۔ ۱۳۰۱ھ۔ اس میں گیارہ علما کی دستاربندی ہوئی۔ اس وقت حضرت گنگوہی حیات تھے اور آپ ہی کے دست مبارک سے علما کے سروں پر دستار فضیلت باندھی گئی وہ گیارہ علما یہ ہیں۔

۱۔ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی

۲۔ " " علاؤالدین " "

---

[1] از مولانا نعمت اللہ صاحب تھانوی۔

۳۔ حضرت مولانا محمد اسحاق صاحب نہٹوری

۴۔ " " محمد یحییٰ " کاندھلوی

۵۔ " " عبدالمومن " دیوبندی

۶۔ " " ناظر حسن " "

۷۔ " " محمد صادق " "

۸ " " محمد یحییٰ " "

۹ " " قاضی نصرت علی " "

۱۰۔ " " محمد مرتضےٰ " دہلوی

۱۱ " " عبدالرحمٰن " مراد آبادی

آخری جلسہ دستار بندی

یہ جلسہ ۱۳۲۸ھ میں ہوا اور اس میں دو سو علما کے دستار فضیلت باندھی گئی اگرچہ کل مستحقین دستار فضیلت کی تعداد چھ سو تھی لیکن دو سو سے کچھ زیادہ تشریف لائے تھے۔ یہ جلسہ ہندوستان میں اپنی نوعیت کا پہلا جلسہ تھا۔ اتنا بڑا جلسہ کہ جس میں تیس ہزار اشخاص نے شرکت فرمائی سب سے پہلا جلسہ تھا۔ اس جگہ اس جلسہ کی کیفیت رسالہ القاسم شوال ۱۳۲۸ھ سے مختصراً نقل کی جارہی ہے۔

دیوبند جیسی چھوٹی جگہ میں محض ایک اشتہار کے ذریعہ سرکاری رپورٹ کے مطابق تیس ہزار افراد کا جمع ہو جانا جہاں محیر العقول ہے وہاں یہ بھی ظاہر کر رہا ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو اس مدرسہ سے غیر معمولی ہمدردی اور محبت ہے۔ اس جلسہ میں صوفیاء، علماء، زہاد، اولیاء اللہ کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز تھی۔

سرکار عالیہ بھوپال اگرچہ اس جلسہ میں شریک نہ ہو سکی تھیں مگر انھوں نے اپنے چیف سکریٹری جناب سید نصیر الدین صاحب کو اپنا عذر نامہ دیکر بھیجا تھا جو اجلاس عام میں پڑھ کر سنایا گیا۔

ٹرانسوال واقعہ جنوبی افریقہ کے مسلمانوں نے اس اجلاس سے جسقدر ہمدردی کا اظہار کیا وہ نہ صرف اہل مدرسہ کے لئے باعث مسرت ہے بلکہ مسلمانان ہند کے لئے باعث فخر ہے ۱۶۰/ اپریل ۱۹۱۱ء مطابق ۱۳۲۹ھ کو جوہانسبرگ سے ۶۰ پونڈ اور پریٹوریا سے ۱۸ پونڈ وصول ہوئے۔

جلسہ میں کھانے پینے اور صفائی کے انتظام کو کرامت ہی کہا جا سکتا تھا۔ اتنا بڑا اجتماع دو ڈھائی گھنٹہ میں کھا پی کر فارغ ہو جاتا تھا۔ کہیں نام کو گندگی نہیں پائی جاتی تھی۔ کسی کو درد سر تک کی بھی شکایت نہیں ہوئی اور نہ کوئی ناخوش گوار واقعہ ہی پیدا ہوا۔

پانی کا اتنا معقول انتظام کیا تھا کہ دو ڈھائی میل کے فاصلے سے ایک نہر کاٹ کر تالاب میں ڈالی گئی تھی۔ بتایا گیا ہے کہ یہ نہر حضرت شیخ الہندؒ کی نگرانی میں حضرت شیخ الاسلام وغیرہم حضرات نے کھود کر نکالی تھی۔ دن بھر حضرت شیخ الہندؒ گشت کیا کرتے تھے۔ اور طلبا کے ساتھ خود بھی شریک ہو جاتے تھے۔ اس اجلاس میں حضرت شیخ الاسلامؒ نے عربی زبان میں تقریر فرمائی تھی۔ ان کے علاوہ حضرت تھانویؒ حضرت مولانا احمد حسن صاحب امروہی کے مواعظ حسنہ ہوئے تھے۔ اسی اجلاس سے رسالہ القاسم کا اجراء عمل میں آیا تھا۔ اور جمعیۃ الانصار کی داغ بیل بھی حضرت مولانا عبید اللہ صاحب سندھی کی نظامت میں ڈالی گئی تھی یہی اجلاس تھا کہ جس سے حکومت

سے یہاں کی کڑی نگرانی شروع کر دی تھی [1]

دارالعلوم اور افریقہ جن علما کو اس جلسہ میں دستار فضیلت عطا ہوئی تھی ان میں مولانا محمد احمد صاحب سورتی اور مولوی حافظ احمد خاں ہزاروی بھی تھے جنکا ایک عرصہ سے جنوبی افریقہ (ٹرانسوال) میں قیام تھا ان دونوں حضرات کے عمامے اور سندیں وہاں کی انجمن اسلامیہ کے پاس بھیجدیئے گئے ۱۰ر جولائی ۱۹۱۰ء کو وہاں کی انجمن نے ایک عظیم اجتماع میں ان دونوں حضرات کو یہ دونوں عطیے عطا کئے جس کی وجہ سے جنوبی افریقہ میں دارالعلوم دیوبند کی بہت زیادہ شہرت ہوئی۔

رسالہ القاسم یہ رسالہ حضرت قاسم العلوم والخیرات کی یادگار کے طور پر ۱۳۲۸ھ میں جاری کیا گیا۔ اور نمونہ کا پرچہ رجب ۱۳۲۸ھ میں شائع ہوا اور جلسہ دستار بندی میں تقسیم کیا گیا اور اس کے بعد باقاعدہ شعبان ۱۳۲۸ھ سے جاری ہوا۔ اس کے پہلے شمارے میں حضرت شیخ الہندؒ اور دیگر اکابر کے بلند پایہ مضامین تھے۔ رسالہ اس قدر مقبول ہوا کہ اس کے بہت سے پرچے علیگڑھ یونیورسٹی اور افریقہ بھی جاتے تھے۔

اس زمانہ میں ہندوستان میں اخبار اور رسائل اس کثرت سے نہ تھے جس کثرت سے آج ہیں لہٰذا اس رسالہ کا ہندوستان بھر نے خیر مقدم کیا ... بڑے بڑے علمائے کرام اور رؤسائے عظام نے اس رسالہ کی خدمات کو سراہا۔ اسی رسالے کے ذریعہ حضرت شیخ الہندؒ کو جمعیۃ الانصار کے اغراض و مقاصد مسلمانوں کے سامنے پیش

---

[1] القاسم ۱۳۲۸ھ مختصراً

کرنے کا موقعہ ملا اور جس تحریک کو وہ بروئے کار لانا چاہتے تھے اس میں ان کو بہت بڑی کامیابی حاصل ہوئی۔

ہوا یہ تھا کہ حضرت شیخ الہندؒ انگریزی حکومت کی مسلم دشمنی سے تنگ آکر ۱۳۲۷ھ مطابق ۱۹۰۹ء میں جمعیۃ الانصار تحریک کا ایک خاکہ بنایا تھا اور اس خاکہ کو ہندوستان بھر میں پھیلانے کے لئے اس رسالہ کا اجراء کیا تھا اور اس کی ایڈیٹری کے لئے میاں سید اصغر حسین صاحب کو منتخب کیا تھا۔

ان دنوں حضرت مولانا میاں اصغر حسین صاحب جونپور پڑھاتے تھے۔ ان کو ایک خط کے ذریعہ دارالعلوم دیوبند بلایا گیا وہ خط سطور ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

برادر مکرم بارک اللہ فیکم وسلم !

بندہ محمود تسلیمات مسنونہ کے بعد ملتمس ہے۔ گرامی نامہ پہونچا۔ بندہ کو مادہ سوداوی نے ستا رکھا ہے۔ ایسی حالت میں اپنی رائے پر رہا سہا اعتماد بھی نہیں ہو سکتا۔ آپ سے مخلص مکرم سے اپنا خیال عرض کرنے ہیں۔ تکلف بھی بے جا ہے۔ خط جو آپ کے پاس گیا تھا۔ اس میں یہ ضعیف بھی واقعی شریک تھا۔ آپ کا خیال واقعی درست ہے اول اپنا پریشان خیال آپ پر ظاہر کرتا ہوں پھر استفسار کا جواب عرض کرتا ہوں۔

آپ کو معلوم ہے کہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں عالم شہود سے دور اور عالم برزخ سے قریب ہو رہا ہوں۔ اتنا فکر ضرور ہے کہ استاذ رحمتہ اللہ علیہ سے بفضل اللہ اگر مشافہہ کی نوبت آگئی اور پوچھا کہو! مدرسہ کس پر چھوڑا اور کس حالت میں ہے تو اس کا جواب ایسا دے سکوں جو پسند خاطر ہو۔ اس کی کوئی تدبیر نہیں مگر یہ کہ اپنے مخلصین صلحاء لائق کے نام گنوا دوں۔ سو آپ کی طرف بھی چند وجوہ میرا خیال ضرور

جاتا ہے اور چاہتا ہوں کہ آپ جیسے چند اصغر مگر حقیقت میں مفید اور اکبر کسی بہانہ سے احاطہ مدرسہ میں آنکھوں سے دیکھ لوں۔ آپ نے جو دو صورتیں تحریر فرمائی ہیں باللہ العظیم ہرگز اس کو پسند نہیں کرتا ہوں کہ آپ شغلہ تدریس سے یکسو ہوں بلکہ چاہتا ہوں کہ تدریس حالت موجودہ سے زیادہ نصیب ہو۔ میں تو آپ کے جلد بلانے کے لئے تدبیر موجودہ کو دراصل پسند کرتا ہوں یہ ہرگز مطلب نہیں کہ سید صاحب شغلہ علمی سے یکسو ہو کر رسالہ بازی میں عمر صرف کریں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ سردست رسالہ کی گاڑی سنبھالنے کو کافی لائق معتمد علیہ شخص ہو۔ کچھ عرصہ کے بعد رسالہ کے لئے انشاء اللہ بہت پیدا ہو جائیں گے۔ اس وقت رسالہ کی ابتدا اگر ہماری طرز و وضع اور خیال کے خلاف پڑ گئی تو اندیشہ کی بات ہے۔ اس وجہ سے بیشک یہ مستحسن نظر آیا کہ مکرم سید کو رسالدار بالفعل بنا دیا جائے اس لئے اپنا خیال عرض کرتا ہوں کہ ہرگز نہیں یہ آپ کو پسند اور بے تکلف گوارہ ہو تو سبحان اللہ ورنہ جو آپ کو منظور ہو ہم کو منظور ہوگا اور آپ سے بخدا کوئی خلجان یا ملال کا واہمہ بھی انشاء اللہ نہ ہوگا۔ دوسرے یہ ہے کہ آپ بالکل اپنے مدرسہ کے احاطہ کے اندر اللہ کا نام لیکر آ جائیں اور آہستہ آہستہ کام کئے جائیں انشاء اللہ آپ کے شغل تدریس کی ہر ممکن کوشش کی جائے گی۔ قصہ نہ آدیگا اور یہ سب چلی کا خیال اگر اعتماد کے قابل نہ ہو تو دو ماہ سے لیکر چھ ماہ تک کی رخصت لیکر تشریف لاکر رسالہ کو ہمارے کہنے کے مطابق جاری فرمائیں۔ اس کے بعد جو صورت آپ پسند فرمائیں اس کے کرنے میں ہم آپ کی موافقت بلکہ متابعت خوشی کے ساتھ کرنے کو موجود ہیں۔ ان چند روزوں کو جو آپ کو رسالہ کے متعلق تحریرات کی نوبت آئے گی اس کا حساب کیا جائے گا کہ اتنی مدت کی تالیفات جو ہورہے زائد ہوں گی یا کم۔ سو یہ میرا ضابطہ ہی تھا

خیال کے قابل نہیں۔ میں خوب جانتا ہوں کہ یہاں آپ کسی عنوان سے آئیں مگر غالباً وہ آزادی اور استقلال جو جونپور میں ہے آپ کو بوجوہ مختلف میسر نہ ہوگا مگر کیا کروں اپنے خیال خام کی وجہ سے جیسا خود مقید ہوں اپنے لائق مخلصین کو بھی مقید کرنے کا شوق ہوتا ہے۔ آپ بالکل مدرسہ اور خدام مدرسہ کے خیر اندیش اور بہی خواہ ہیں اور ہم خدام مدرسہ بالکل آپ کے خیر طلب اور دعا گو ہیں۔ خط آپ ہی ختم ہو گیا کاغذ ہی نہیں رہا۔ والسلام مع الاکرام۔[۱]

رسالہ الرشید یہ رسالہ بیادگار قطب عالم حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ رجب ۱۳۳۱ھ سے زیر ادارت حضرت مولانا میاں اصغر حسین صاحب دیوبندی و زیر سرپرستی حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ اور حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب جاری کیا گیا اس رسالہ کے اغراض و مقاصد بھی وہی ہیں جو القاسم کے ہیں۔ میں نے دونوں رسالوں کے مضامین کو پڑھا۔ دونوں کے مضامین نگار علم و عمل کی بلند پایہ شخصیتیں ہیں۔ ان کے بعض مضامین بعد میں کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔ مثلاً اشاعت اسلام از مولانا حبیب الرحمٰن صاحب۔

جمعیۃ الانصار اصل میں اس انجمن کو ۱۲۹۷ھ میں حضرت شیخ الہندؒ نے قائم فرمایا تھا۔ اس وقت اس کا نام ثمرۃ التربیت تھا۔ بعد میں جلسہ دستار بندی کے موقع پر ۱۳۲۹ھ مطابق ۱۹۱۱ء میں اسی انجمن کا احیاء حضرت شیخ الہندؒ کی صدارت اور حضرت مولانا عبید اللہ سندھی کی نظامت میں ہوا۔ اس کے

---

[۱] حیات امداد ص ۱۹۲۔

متعلق تفصیل سے آئندہ باب میں لکھا جائے گا۔ اس جگہ مختصر سا تعارف علامہ سندھی کے الفاظ میں کرانا مناسب ہے۔

طلبا مدرسہ عالیہ دیوبند کی جمیعۃ الانصار کی اغراض۔

ا۔ قرآن پاک و حدیث شریف کے اسرار و دقائق سے عام مسلمانوں کے کان مانوس ہوں۔ ب۔ عقائد اور اعمال کی اصلاح کے متعلق علمی مضامین پڑھے جائیں۔ ج: مسلمانوں کے مذہبی علوم و معارف کی حفاظت و اشاعت کے وسائل پر عموماً اور مدارس کی اصلاح و عمارت پر خصوصاً بحث و مشورہ ہو وغیرہ وغیرہ ان سب امور میں کامیاب ہونا اس پر موقوف ہے کہ مختلف اوقات اور متفرق مقامات میں جمیعۃ الانصار کی جانب سے ایسے شاندار جلسے ہوا کریں جن میں اسلام کی برگزیدہ جماعت مسلمانوں کی دینی و دنیوی فلاح کے متعلق کچھ مفید ہدایتیں لوگوں کے گوش گزار کر سکے۔ نیز ان جلسوں میں خدا اور رسول کی سچی تعلیمات اور بزرگان سلف کے حوصلہ افزا کارنامے سنا کر افراد قوم کے مردہ دلوں میں روح تازہ پھونکنے کی کوشش کی جائے[1]

اس عبارت میں معنوی اعتبار سے جو کچھ بیان کیا ہے اس کی شرح بہت طویل ہے۔ حضرت شیخ الہندؒ اس قسم کی انجمن سازیوں اور جلسوں سے جو کام لینا چاہتے تھے وہ بھی عنقریب آپ کے سامنے آجائے گا۔

جمیعۃ الانصار نے حضرت علامہ سندھی کی زیر نظامت بہت ترقی کی اس جماعت نے ایک اخبار الانصار دیوبند سے نکالا اور اپنی ایک شاخ مراد آباد میں قائم کی وہاں

---

[1] القاسم ربیع الاول ۱۳۲۹ھ۔

سے اخبار اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع کیا اور ایک بہت بڑا اجتماع کیا جس کی وجہ سے حکومت اس جماعت اور اس کے اراکین کے بہت زیادہ خلاف ہو گئی تھی

اسی طرح مختلف اوقات میں اسمار اور اغراض و مقاصد میں ۔ ۔ ۔ ۔ تبدیلی کے ساتھ دارالعلوم دیوبند نے علمی اور دینی خدمت کے لئے طلبا کی جماعتیں بنائیں مثلاً جمعیۃ الطلبا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جب تک حضرت شیخ الاسلام رح حیات رہے اسوقت تک جمعیۃ الطلبا نے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بہت اچھا کام کیا اور ممدوح کے انتقال کے بعد اساتذہ کی سرپرستی میں ۔ اس کے حوصلوں کو تقویت ہوئی ۔۔۔۔ غالباً اب بھی موجود ہے ۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ اس وقت کے اساتذہ فادمانہ جذبہ کے تحت اس کی حوصلہ افزائی کرتے تھے ۔ اور آج کل کے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ انکی نگرانی کرتے ہیں

گذشتہ چند سالوں سے دارالعلوم دیوبند نے جلسہ دستار بندی کے عنوان سے علمی اور دینی خدمات کے لئے ایک تنظیم فضلائے دارالعلوم دیوبند کے نام سے ملک بھر میں قائم کی ہے ۔ اغراض و مقاصد اس کے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دینی ہیں ۔ لیکن اس تنظیم سے ملک و قوم کو ابتک کوئی خاص فائدہ نہیں پہونچا ہے ۔ پوری تنظیم پر ایک جمود طاری ہے وجہ اس کی غالباً یہ ہے کہ یہ تنظیم ایسے ہاتھوں میں ہے جو تنظیمات کو چلانے کی بالکل صلاحیت نہیں رکھتے ۔ اگر یہ تنظیم مستعد ہاتھوں میں ہوئی ہوتی تو بہت دینی فائدہ ہوتا ۔

شعبہ تبلیغ و اشاعت

مذکورہ بالا تمام وجوہات کی بنا پر دارالعلوم دیوبند کی عالم اسلام خصوصاً ہندوستان کے اضلاع اور صوبجات میں بہت زیادہ شہرت ہو گئی تھی جس کی وجہ سے عوام و خواص اپنی علمی اور

دینی ضروریات کے لئے مدرسہ عالیہ دیوبند کی طرف رجوع کرتے تھے۔ اسی ضرورت کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہاں ایک مستقل شعبہ دارالافتا قائم کیا گیا جس کے لئے سب سے پہلے حضرت مولانا مفتی عزیزالرحمٰن صاحب دیوبندی کا تقرر عمل میں آیا۔ آپ سے پہلے یہ ہوتا تھا کہ آنے والے سوالات کو کسی ایک مدرس کے سپرد کر دیا جاتا تھا۔ بعد میں مدرسین کی مصروفیات کی وجہ سے اس شعبہ کو بالکل علیحدہ کر دیا گیا۔

ملک میں انگریزوں کے اشاروں سے ایک فرقہ بریلویہ پیدا ہوا جس نے جگہ جگہ غلط قسم کے خیالات کی نشرواشاعت شروع کر دی۔ اس کے ساتھ ایک اور فرقہ اہل قرآن پیدا ہوا جس سے ۱۳۳۶ھ میں قصبہ ہلدور ضلع بجنور میں ایک عظیم الشان مناظرہ ہوا۔ اسی طرح ایک مناظرہ نگینہ ضلع بجنور میں ہوا جس میں دیوبند کی طرف سے حضرت مولانا احمد حسن صاحب مناظر تھے۔ اسی طرح فرقہ قادیان اور آریہ سماجیوں سے مختلف مقامات پر مناظرے ہوئے۔ غرضیکہ اس وقت پورا ہندوستان مناظرہ کی فضا سے معمور تھا۔ اسی وجہ سے علماء دیوبند کی تقریر و تحریر میں مناظروں کا رنگ اب تک غالب ہے حالانکہ اب وقت اور حالات بدل چکے ہیں اس رنگ کو درسگاہوں اور جلسہ گاہوں سے بالکل نکال دینا چاہیئے۔

ان حالات اور ماحول کے تقاضوں کی بنا پر ضرورت تھی کہ تبلیغ و اشاعت کا ایک شعبہ علیحدہ قائم کر دیا جائے جس میں چند پختہ کار علماء کو محض وعظ و تقریر اور مناظرہ کے لئے ملازم رکھا جائے کیونکہ اس وقت جو مدرسین درسیات میں مصروف تھے ان کے لئے یہی محبوب مشغلہ تھا اور ان کے لئے یہی سب سے بڑی خدمت تھی کہ خوب مطالعہ کر کے درسگاہوں کو زینت دیں نہ کہ جلسہ گاہوں کو چنانچہ اہتمام نے اپنے مدرسین کی

مصروفیات کی بنا پر اس شعبہ کو جمادی الاول ۱۳۲۹ھ میں قائم کیا۔ اور اسکے لئے مولانا ہادی حسن صاحب، مولانا حافظ عبد السمیع صاحب کو مبلغ مقرر فرمایا۔

ضلع بجنور اور دیوبند

دار العلوم دیو بند کے اغراض و مقاصد اور اسکی تحریکات کو عروج پر پہونچانے میں ضلع بجنور کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ جمعیۃ الانصار کے اغراض و مقاصد کو یہاں کے علماء نے سینہ سے لگایا اور دل وجان سے ان کی ترویج واشاعت کی جس وقت دار العلوم دیو بند نے ۱۳۲۹ھ میں اپنے مطبخ کی توسیع کا اعلان کیا تو سب سے پہلے اس ضلع کے مشہور حضرات مولوی عبد الحئی صاحب، مولوی عبد الواسع صاحب، مولوی حکیم مشیت اللہ صاحب نے دل کھول کر مدرسہ کی اعانت کی۔ جب ۱۳۲۹ھ میں دار الحدیث کے لئے اعلان کیا گیا تو سب سے پہلے حضرت شیخ الہند ؒ نے مبلغ سو روپے پیش فرمائے اور ان کے بعد حاجی حبیب حسن صاحب بجنوری، حکیم مولوی مشیت اللہ صاحب بجنوری نے اپنی خاص سے عطیات پیش کئے۔[1]

۱۳۳۵ھ میں جب ہندوستان کی فضا پوری طرح مسموم تھی بجنور میں دار العلوم دیو بند کے چند فضلاء نے جمعیۃ الانصار کے اغراض و مقاصد کے پیش نظر ایک عظیم الشان جلسہ کیا جس کی کارروائی کو الرشید بابت صفر ۱۳۳۵ھ نے

"اسوۂ حسنہ طلباء بجنور"

کے جلی عنوان سے شائع کیا اور ایک طویل عبارت میں ان کی خدمات کو بنظر استحسان دیکھا۔

---

[1] ملاحظہ فرمایئے القاسم ۱۳۲۹ھ۔

علیگڑھ اور دیوبند

علی گڑھ اور دیوبند اب یہ دونوں قصبہ یا شہر نہیں رہے بلکہ ایک ہی گھر سے نکلی ہوئی دو مختلف تحریکوں کا مرکز بننے کا انکو شرف حاصل ہے۔ کیوں؟ اس سوال کا جواب ہم اپنے الفاظ میں دینے کے بجائے جناب ضیاء الحسن صاحب فاروقی سابق ایڈیٹر اخبار مدینہ کے الفاظ میں دیتے ہیں۔

یوں تو مدرسہ دیوبند کے بانی اور مفکر مولانا محمد قاسم صاحب اور علیگڑھ کالج کے بانی اور مفکر سرسید دونوں کے دونوں ولی اللہی تحریک سے متاثر تھے۔ اور دونوں ایک ایسے استاد کے شاگرد تھے جو سلسلہ ولی اللہی کی ایک ممتاز شخصیت تھی لیکن جس طرح ان دونوں بزرگوں کے نقطۂ نظر میں شروع ہی سے ایک بنیادی اختلاف تھا اسی طرح ان کی قائم کردہ یہ درسگاہیں مختلف راہوں پر چلیں چنانچہ آخر میں ۱۹۳۷ء کے بعد جہاں مدرسہ دیوبند مطالبہ پاکستان کے مخالفوں کا مرکز بنا وہاں علیگڑھ نے اس تحریک میں پورے جوش و خروش سے حصہ لیا۔

مولانا عبیداللہ سندھی فرمایا کرتے تھے کہ مدرسہ دیوبند کے بانی مولانا محمد قاسم صاحب اور علیگڑھ کالج کے موسس سرسید احمد خاں دونوں فکر ولی اللہی سے متاثر اور منتسب تھے دونوں کا سلسلۂ تلمذ مولانا مملوک علی صاحب سے تھا جو ایک واسطہ سے شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے شاگرد تھے۔ اب بقول مولانا سندھی فکر ولی اللہی مشتمل متضاد اجزاء پر ایک جزو تھا۔ عقلیت اور دوسرا جز سیاست ملک کا تتبع ۱۸۵۷ء کی ناکامی اور مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کے خاتمے پر جب مسلمانوں میں نئی زندگی کے آثار پیدا ہوئے اور انھیں عملی شکل دینے کی کوششیں ہوئیں تو سرسید

فکر ولی اللہی کے اس جزو کو جس میں عقلیت مرجح اور مقدم تھی علی گڑھ لے گئے اور وہ جزو جس میں سلف صالح کے تتبع پر زور تھا. مولانا محمد قاسم صاحب نے مدرسہ دیوبند کو اس کا محافظ بنا دیا۔[1]

باوجود اس شدید اختلاف کے حضرت شیخ الہند نے ضرورت اور حالات کو سمجھا، چنانچہ ۱۹۲۰ء میں وہ علیگڑھ تشریف لے گئے اور دونوں مکتب فکر کو یکجا کرنا چاہا مگر مرحوم کی عمر نے وفا نہ کی. ان کے بعد حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی تشریف لے گئے یہ وہ زمانہ تھا کہ جب مولانا شبیث صاحب مرحوم ادارہ دینیات علیگڑھ کے ناظم یا پروفیسر تھے. موصوف نے اپنی افتتاحی تقریر میں فرمایا تھا "مولانا آپ ان بچوں کے قریب تو آئیں یہ تو آپ کا دامن پکڑ کر چھوڑیں گے نہیں. اسی کے ساتھ علیگڑھ نے بھی دیوبند کی طرف ایک قدم اور بڑھایا اپنے کورٹ میں دارالعلوم کے فضلا میں سے حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب، مفتی عتیق الرحمٰن صاحب قاری محمد طیب صاحب، مہتمم دارالعلوم دیوبند وغیرہم کو جگہ دی۔

موجودہ ہندوستان میں اگرچہ ان دونوں اداروں کا یہ تعلق غیر مفید نہیں ہے لیکن ان دونوں اداروں میں جس ربط اور یکجہتی کی ضرورت ہے اس کو امیر تبلیغ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب نے خوب اچھی طرح سمجھا اور اپنی کوششوں کو بروئے کار لانا شروع کیا، چنانچہ آج علیگڑھ کا بہت بڑا طبقہ عقلیت اور اتباع اسلاف کی ایک مکمل ترین صورت بن چکا ہے. بلا شک و شبہ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب

---

[1] مدرسہ دیوبند اور مطالبہ پاکستان۔

امیر تبلیغ کی یہ ایسی تاریخی اور انقلابی کوشش ہے کہ جس کو پچھلے سو سال کی مدت میں کوئی بھی عملی جامہ نہ پہنا سکا۔ ہاں اس میں شک نہیں اس قسم کے عوامل بہت دنوں سے پائے جا رہے تھے لیکن حالات کے موانع نے انکے اثرات کو ظاہر نہ ہونے دیا تھا۔

دیوبند سے دہلی تک

یہ اگرچہ صحیح ہے کہ سرسید اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب دونوں ایک ہی کے گھرانے کے پروردہ ہیں اور بقول علامہ سندھی دونوں نے ایک گھر کی دو چیزوں یعنی عقلیت اور اتباع اسلاف کو اختیار کیا لیکن عقلیت بلا اتباع اسلاف کے جو راہ اختیار کر لیتی ہے وہ خطرناک اور مہلک ترین ہوتی ہے جس کو اصطلاحاً گمراہی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ سرسید نے اسی عقلیت کا دامن تھام کر نیچریت کا راستہ اختیار کیا تھا جسکا لازمی نتیجہ اتباع اغیار ہونا تھا اور وہ ہوا۔ یہ ضرور ہے کہ سرسید نے ہندوستان کی اکثریت کے مزاج کا گہرا مطالعہ کر کے مسلمانوں کے لئے نئے ہندوستان میں ایک اچھا اقتصادی مقام محفوظ رکھا ورنہ اگر سرسید ہندو ذہنیت کو نظر انداز کر دیتے تو آج ہندوستان میں مسلمان نہایت پس ماندہ ہوتے۔ بہرحال علیگڑھ نے انگریز پرستی کو میتہ سے جدا کرنا مناسب نہ سمجھا۔ جس کی وجہ سے وہاں حضرت شیخ الہند رح کا تشریف لے جانا زیادہ مفید ثابت نہ ہوا۔ حضرت شیخ الاسلام رح نقش حیات میں راقم ہیں۔

> مگر زعمائے مسلم یونیورسٹی پہلے سے آزاد اور قومی لوگوں کی بات مان لیتے تو یہ افتراق (تقسیم ہند) نہ ہوتا بہرحال گورنمنٹ پرستوں نے انگریزوں کی چیرہ دستیاں اور غداریاں دیکھتے ہوئے غلامی اور انگریز پرستی ہی

کو سراہا۔ جو شبلی روحیں کب اس کو برداشت کر سکتی تھیں [1]

چنانچہ حضرت شیخ الہندؒ نے اپنا مقصد یہاں پورا ہوتا ہوا نہ دیکھکر اپنے رفیق مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب کے ساتھ ۳۰ اکتوبر ۱۹۲۰ء میں جامع ملیہ کا سنگ بنیاد رکھا۔ جامعہ ملیہ کیوں قائم ہوا اس کے اغراض و مقاصد کیا ہیں اس کو مسیح الملک نے اپنے ایک خطبہ میں اس طرح بیان فرمایا ہے۔

دارالعلوم دیوبند یا مدرسہ فرنگی محل لکھنؤ ہی کے طلبا کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ علمائے کرام سے مستغنی نہیں ہیں بلکہ جامعہ کے طلبا بھی ان بزرگوں کی مدد سے مستغنی نہیں جنھوں نے اپنی عمریں تفسیر و حدیث عقائد و فقہ کے درس و تدریس میں صرف کر دی ہیں لیکن وہ عام انگریزی مدارس کے طلبا کی طرح مطالب قرآن کریم سے واقفیت میں علما کے دست نگر نہیں چھوڑے جاتے بلکہ ان کے لئے عربی زبان کی تعلیم بھی زیادہ لازمی کر دی گئی ہے اور عربی نثر کے کورس کی کتاب خود کتاب اللہ مقرر کی گئی ہے تاکہ ہمارا کوئی بچہ بھی کلام اللہ سے ناآشنا نہ رہے۔ علامہ سندھی نے جامعہ ملیہ کے متعلق تحریر فرمایا ہے۔

بیت الحکمت کا نصاب تعلیم تو ہم پہلے لکھ چکے ہیں یعنی ولی اللہ فلاسفی سے قرآن عظیم کا سمجھنا اور انسانیت کے اصول پر کاشتکاروں کی علمی اور عملی خدمت کرنا اس تعلیم دینے میں بالفعل ہمارے ساتھ جامعہ کا ایک پروفیسر ہوگا اور دوسرا معاون ہمارا ہم مسلک ایک مولوی ہوگا اگر اللہ کو منظور ہے تو جامعہ کا بیت الحکمت جسے ہم شروع کر رہے ہیں حکمت امام ولی اللہ کا مرکزی کالج بن کر رہے گا۔ [2]

---

[1] ہمدرد ۲۶ جنوری ۱۹۲۶ء [2] خطبات سندھی صفحہ ۲۱۷۔

ظاہر ہے اس جذبہ نے جامعہ ملیہ کو دیوبند سے کس قدر قریب کر دیا ہے حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں ادارے ایک ہی باپ کی اولاد ہیں اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے اس خیال کی زندہ تصویریں ہیں۔

اس تقریر (جلسہ دستار بندی ۱۲۹۰ھ) میں مولانا محمد قاسم صاحبؒ فرمایا کہ طلبہ مدرسہ (دارالعلوم دیوبند کے تعلیمی نصاب سے فارغ ہونے کے بعد) مدارس سرکاری میں علوم جدیدہ کو حاصل کریں تو ان کے کمال میں یہ بات زیادہ موید ثابت ہوگی۔[1]

اب چند برسوں سے مزید یہ ہوا کہ جامعہ ملیہ میں دیوبند کے فارغ التحصیل طلبا کو مخصوص رعایت کے ساتھ لیا جانے لگا ادھر دیوبند کے طلبا میں بھی علوم جدیدہ کے حاصل کرنے کا رجحان پیدا ہونے لگا ہے لیکن ضرورت اور ماحول کے مطابق نصاب میں ارتقائی رجحانات اب تک پیدا نہیں ہو سکے اور یہ سب کچھ وہاں کی نظام تعلیم کی جمودیت، قنوطیت . . . . . . کی وجہ سے ہے۔

ترکوں کیلئے چندہ

صلیب و ہلال کی جنگوں کا سلسلہ عہد صحابہؓ سے شروع ہوتا ہے لیکن وہ دور تھا ختم ہو گیا آخر میں سلطان صلاح الدین ایوبی نے یورپ کے منصوبوں کو خاک میں ملا دیا۔ سلطان کے بعد سلطنت عثمانیہ کچھ دنوں تک تو عروج پر رہی لیکن یورپ کی دسیسہ کاریوں اور چالبازیوں نے اس کو بہت کمزور کر دیا تھا۔

۱۹۰۹ء میں یورپ نے سلطنت عثمانیہ کے غصب کرنے کے تمام منصوبے مکمل

---

[1] سوانح قاسمی از گیلانی۔

کر لئے تھے جن کے ماتحت ۱۹۱۲ء میں ترکی کیساتھ باقاعدہ جنگ کا اعلان کر دیا گیا یہ وہ زمانہ تھا کہ سلطنت عثمانیہ نہایت کمزور ہو چکی تھی۔ خالدہ ادیب خانم تحریر فرماتی ہیں:

بد نظمی کے اعتبار سے جنگ بلقان سے بڑھ کر کوئی جنگ نہیں ہوئی۔ حفظان صحت کا کوئی انتظام نہیں تھا اور خطوط مدافعت کے پیچھے انتظامات کی ابتری نہایت افسوسناک تھی۔ بھیڑیں گاڑیوں میں بھوکی مر رہی تھیں اور آٹا گوداموں میں سڑ رہا تھا لیکن نصف میل سے کم فاصلہ پر لوگ فاقوں سے بھوکے مر رہے تھے۔[1]

یہ زمانہ ترکوں کے لئے نہایت صبر آزما زمانہ تھا باوجودیکہ ان کو شکست پر شکست اٹھانی پڑ رہی تھی۔ لیکن واہ رے ترک تو نے ہمت نہ ہاری۔ بالآخر اتحادیوں کو اپنے منصوبے میں ناکامیابی ہوئی۔

اس وقت کا ذکر ہے کہ ہندوستانی مسلمان جس کے دل میں عالم اسلام کے مسلمانوں کے لئے درد اور غم ہے۔

یہ بات دوسری ہے کہ دنیا کے مسلمان اس کے شریک غم نہ ہوں۔ آج جب کہ فرقہ وارانہ فسادات کے تسلسل نے یہاں کے مسلمانوں کی ریڑھ کی ہڈی پر حملہ بول دیا ہے کوئی اسلامی ملک اس کی ہمدردی کے لئے آواز بلند نہیں کر رہا ہے۔ لیکن یہ حال یہاں کے مسلمانوں کا نہ رہا ہے اور نہ ہے۔ چنانچہ نہر سوئز پر جس وقت فرانس اور برطانیہ نے حملہ کیا تو سب سے زیادہ یہاں کے مسلمان بےچین تھے۔ مسجدوں میں صدر ناصر کی کامیابی کے لئے دعا مانگا کرتے تھے۔ جگہ جگہ انھوں نے جلوس نکالے۔ فرانس اور

---

[1] نقش حیات صـ ۱۲۳ ج ۲۔

برطانیہ کے سفارت خانوں پر مظاہرے کئے۔ اس وقت حضرت شیخ الاسلام حیات تھے۔ آپ کو ریڈیو سننے کی اگرچہ عادت نہیں تھی۔ مگر ان دنوں پابندی سے ریڈیو سنا کرتے تھے۔ جب مصر کے کسی جہاز کے گرنے کی خبر سنتے تو افسردہ ہو جاتے اور جب برطانیہ اور فرانس کے جہاز کے گرنے کی خبر سنتے تو خوش ہوتے۔ الحمد للہ کہتے اور فرماتے "اچھا ہوا خبیثوں کا اتنا تو نقصان ہوا۔

بالکل یہی حال جنگ بلقان کے وقت حضرت شیخ الہندؒ کا تھا۔ ترکوں کی شکست کی خبر سنتے تو آپ کی ریش مبارک پر آنسو گرتے تھے۔ راتوں کو دعائیں مانگا کرتے۔ اگر کوئی دیکھے تو بالکل یہ حالت تھی کہ اگر حضرتؒ کے بس میں ہوتا تو انگریزوں کو کچا چبا ڈالتے۔ بہر حال پھر بھی جس قدر بس میں تھا کیا۔ مدرسہ کی چھٹی کر دی۔ طلباء اور مدرسین کو گاؤں گاؤں بھیجا چندہ کیا خود اپنی تنخواہ اور تمام ملازمین اور مدرسین کی تنخواہیں چندہ میں دیں۔ طلباء نے آپ کے اشارے پر اپنے انعامات اور مطبخ کی خوراک بھی چندہ میں دے ڈالی۔ اس طرح تقریباً ایک ڈیڑھ لاکھ روپیہ ترکی بھیجا جس کے صلہ میں ترکی حکومت نے آپ کا شکریہ ادا کیا اور وہ رومال جس میں جناب رسول اللہ ﷺ کا پیراہن مبارک رکھا رہتا تھا دارالعلوم کو بطور تبرک اور عطیہ بھیجا۔ جو آج بھی دارالعلوم کے خزانے میں تبرکاً موجود ہے۔

ترکوں کی امداد کیلئے فتویٰ

ان ہی دنوں میں حضرت شیخ الہندؒ نے ترکوں کی امداد کے متعلق ایک فتویٰ دیا جس کو اس جگہ نقل کیا رہا ہے۔

الاستفتاء۔ کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

ایک مسجد ہے جس میں روپیہ وقف ہے اور اس وقف کی صورت یہ ہے کہ واقف نے ایک کمپنی میں کچھ حصہ لیکر وقف کر دیئے جس کی ماہوار آمدنی جمع ہوتی رہی۔ رفتہ رفتہ وہ اصل سے بڑھ گئی یا اس کے مساوی یا کم ہو ایسی حالت میں کہ خاص اس مسجد کو اور وہاں کی اور مساجد کو فی الحال ضرورت نہ ہو بلکہ آئندہ بھی کوئی ضرورت عرصۂ دراز تک معلوم نہیں ہوتی۔ اگر ان زائد حصص کو جو اصلی حصص سے زیادہ ہو گئے ہیں۔ فروخت کر کے اس اہم کام یعنی معرکۂ بلقان کے ترکی مجروحین و یتیموں و بیوگان اور ترکی لشکر کی امداد میں صرف کیا جائے تو شرع محمدی میں جائز ہے یا نہیں۔ نیز مسجد کے نام کوئی خاص جائداد وقف نہیں بلکہ کمپنی کے یہ حصص جو مشترک ہوتے ہیں فی الحال جو روپیہ آمدنی ہے اس مد میں جائز ہے یا جو اصل وقف کی آمدنی سے خریدے گئے ہیں انکو فروخت کر کے اس مد میں دینا جائز ہے یا دونوں صورتیں جائز یا ناجائز ہیں فقط۔

بینوا و توجروا

الجواب صورت مسئلہ میں زائد آمدنی وقف مذکور کی امداد مجروحین و یتامی جنگ مذکور میں صرف کرنا شرعاً درست اور جائز ہے اور ان حصص کو جو بعد میں آمدنی موقوفہ سے خریدے گئے ہیں فروخت کرنا اور چندہ ہلال احمر میں صرف کرنا بھی درست ہے۔ روایات حدیث و فقہ اس بارے میں منقول ہیں۔ بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ آمدنی اوقاف مساجد سے جو کچھ نوائب مسلمین و محاربات میں صرف کیا جائے وہ بطریق قرض ہونا چاہیئے اور بعض عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ بدون قید قرض کے درست ہے پس جبکہ آمدنی اس قدر روپیہ وقف مذکور سے جمع ہے کہ اس مسجد کو نہ فی الحال اس کی حاجت ہے اور نہ آئندہ کو ضرورت معلوم ہوتی ہے اور امداد مجروحین کی ضرورت

اس وقت جس قدر اہم اور لابد ہے وہ مخفی نہیں ایسی حالت میں بدون اس کے کہ رقم خرچ کردہ شدہ کو قرض سمجھا جائے۔ آمدنی مذکور کو امداد مجروحین جنگ ترک میں خرچ کرنا جائز بلکہ ضروری ہے۔

فتح القدیر میں ہے۔

ولو اجتمع مال الوقف ثم نابت نائبة من الکفرة فاحتیج الی مال لدفع شرھم قال الشیخ الامام (محمد بن فضل) ما کان من غلیة وقف المسجد الجامع یجوز للحاکم ان یصرفه الی ذلک علٰی وجه القرض اذا لم تکن حاجة للمسجد الیه وعن ابی وائل قال جلست مع شیبة علی الکرسی فی الکعبة فقال لقد جلس ھذا المجلس عمر فقال لقد ھممت ان لا ادع فیھا صفراء وبیضاء الا قسمته قلت ان صاحبیك لم یفعلا فقال ھما المرء ان اقتدی بھما (بخاری شریف صـ ۲۱۶ ج ۱)

وقال ابن الصلاح الامر فیھا (ای فی کسوة الکعبة) الی الامام یصرفه فی مصارف بیت المال بیعاً وعطاء واحتج بما ذکرہ الازرقی ان عمر کان ینزع کسوة الکعبة کل سنة فیقسمھا علی الحاج (عمدة القاری ج ۴ صـ ۶۰۴)

حموی حاشیہ اشباہ میں ہے۔

لا یصرف القاضی الفاضل من وقف المسجد الی قوله قیل یعارضه ما فی فتاوی قاضی خان فی ان الناظر له صرف فاضل الوقف الی جھات البر بحسب مایراہ الخ۔ القاعدة الخامسة عن الفن الاول المجلد الاول صـ ۱۲۰ مصری۔

ان عبارات سے واضح ہے کہ ضرورت موجودہ یعنی امداد مجروحین و یتامیٰ جنگ ترک میں وہ آمدنی زائد اوقاف مسجد کے جس کی ضرورت مسجد کو نہ فی الحال ہے نہ آئندہ مظنون ہے صرف کرنا جائز ہے۔ اور جن فقہا نے یہ قید لگائی ہے کہ نوائب میں قرضاً دیا جائے اس کا منشا یہ ہے کہ اگر کسی وقت اس مسجد کو کچھ ضرورت پیش آئے تو وہ روپیہ واپس لیکر اس میں صرف کیا جائے لیکن جبکہ آمدنی ان اوقاف کی ہمیشہ اسقدر ہوتی رہتی ہے کہ اگر بالفرض آئندہ کو کوئی حاجت مسجد کو پیش آوے تو آمدنی آئندہ کو اس کے لئے کافی ہے تو پھر اس رقم خرچ کردہ شدہ کو قرض کہنے کی ضرورت نہیں ہے جیساکہ بخاری وعمدۃ القاری وعبارات حموی کا منشا ہے۔ اللہ تعالیٰ اعلم

(کتبہ عزیز الرحمٰن عفی عنہ مفتی مدرسہ عربیہ دیو بند

الجواب صحیح	الجواب صحیح
بندہ محمود عفی عنہ	محمد انور عفا اللہ عنہ
شیخ الہند قدس اللہ سرہٗ)	مدرس دارالعلوم دیو بند

شیخ الاسلام فلپائن دیو بند میں

فلپائن کے مسلمان باشندوں نے دارالخلافت قسطنطنیہ ایک درخواست بھیجی تھی کہ ہماری مذہبی رہنمائی کے لئے کسی عالم کو مقرر کر دیا جائے چنانچہ دربار خلافت نے جناب شیخ محمد وجیہ کو شیخ الاسلام کا خطاب عطا فرماکر فلپائن کے لئے مقرر کر دیا۔ شیخ الاسلام موصوف ملک شام کے مشہور شہر نابلس کے باشندے تھے انھوں نے جب فلپائن جانے کا قصد کیا تو حج بیت اللہ کرتے ہوئے ہندوستان آئے اور ۱۲ دسمبر ۱۹۱۳ء کو دیو بند پہونچے۔ دارالعلوم دیکھکر

موصوف نے فرمایا۔

ادری نوداود جدت — میں نے یہاں نور دیکھا اور اپنا
ضالتی المنشورہ[۱] — گمشدہ سرمایہ یہاں پایا

استقبالیہ جلسہ میں حضرت مولانا اعزاز علی صاحب نے عربی میں نظم پڑھی اور مولانا کشمیری نے تقریر فرمائی۔ اس روئداد جلسہ میں بہت سے اساتذہ کے متعلق لکھا ہے لیکن حیرت ہے حضرت شیخ الہند کا کہیں دور دور تک ذکر بھی نہیں ہے شیخ الاسلام کی ملاقات تو ان سے بھی ہوئی ہوگی مگر رپورٹ نگار نے اس سے سکوت فرمایا ہے حیرت ہے۔

---

[۱] مدینہ بجنور فروری ۱۹۱۴ء۔

تحریک شیخ الہندؒ — یا جمعیۃ الانصار

ہم گذشتہ سطور میں عرض کر چکے ہیں کہ جمعیۃ الانصار کا قیام ۱۹۰۹ء میں عمل میں آیا اس وقت جنگ شروع ہو چکی تھی۔ حضرت شیخ الہندؒ نے مولانا سندھی کو دوبارہ دیوبند بلوایا اور اس انجمن کی بنیاد ڈالی۔ اس انجمن کا مقصد ملک اور بیرون ملک فضلائے دیوبند کی تنظیم کرنا تھی۔ اس تنظیم کا تعلق ایک بہت بڑی اسکیم سے تھا جس کا حلقہ اثر ہندوستان کے علاوہ افغانستان، ایران، ترکی، بخارا و عرب وغیرہ تمام اسلامی ممالک سے تھا۔ مولانا سندھی اور حضرت شیخ الہندؒ کی کوششوں سے یہ تنظیم بہت مقبول ہوئی۔ ۱۵، ۱۶، ۱۷ اپریل ۱۹۱۱ء کو اس کے زیر انتظام مراد آباد میں ایک عظیم الشان اجتماع ہوا۔ حضرت مولانا عبید اللہ صاحب سندھی نے اجلاس مراد آباد میں جمعیۃ الانصار کے اغراض و مقاصد کا اعلان فرمایا جن کو مولانا کے الفاظ ہی میں اس جگہ نقل کیا جا رہا ہے۔

جمعیۃ الانصار کے اغراض و مقاصد

جمعیۃ الانصار مدرسہ عربیہ دیوبند کے فارغ التحصیل طلبا کی اس مددگار جماعت کا نام ہے جو مخصوص شرائط کی پابند ہو کر مدرسہ کی ہمدردی میں ہر طرح پر حصہ لے یا بالفاظ دیگر سرپرستان مدرسہ دیوبند کے دست و بازو بن کر کام کرے۔

اس جمعیۃ کی غرض مدرسہ کے مقاصد کی تائید و حمایت اور اس کے پاک اثر کی ترویج و اشاعت ہے ملکی معاملات سے اس کو کوئی تعلق نہیں۔

اس جمعیۃ کے ارکان مدرسہ عالیہ دیوبند کے سابق تعلیم یافتہ حضرات ہیں جن میں سے ہر ایک کا فرض ہے کہ مدرسہ کی تعلیمی، انتظامی اور مالی ترقی میں انتہائی کوشش کرے۔

ان فرائض کے ادا کرنے کے لئے جمعیۃ نے پانچ شعبے قرار دیئے ہیں۔ ا۔ تکمیل التعلیم۔ ب:۔ نظام التعلیم۔ ج:۔ الارشاد۔ د:۔ التالیف واشاعت۔ ہ۔ جلسہ علمیہ۔

تشریح

الف: درجہ تکمیل میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب قدس سرہ کی تالیفات اور حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے خاندان کی کتابیں مثل حجۃ اللہ البالغہ خیر کثیر، عبقات، تکمیل الاذہان، اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کے بعض مکتوبات۔

ب:۔ علم تفسیر۔ کلام و ادب۔ وغیرہ فنون کی اعلیٰ کتابیں بھی داخل درس ہوں گی۔

ج:۔ تقریر و تحریر کی خاص مشق کرائی جائے گی۔

د:۔ طریقہ تدریس و انتظام سکھلایا جائے گا۔

۲۔ مدرسہ عربیہ دیوبند کی سرپرستی جو مدرسہ قبول کرے اور اس کے نظامات تعلیمیہ اپنے یہاں نافذ کرے کہ ایسے مذکر (واعظ) اور خطیب تیار کرے جو مختلف زبانوں میں اسلامی خدمت بوجہ احسن ادا کریں اور تحریری و تقریری مناظرہ

کرنے والے ایسے فاضل تیار کئے جائیں جو مشرکین، دہریئین، ملحدین، اہل کتاب اور مبتدعین پر اتمام حجت کر سکیں۔

ب:۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے خاندان یعنی حضرت شاہ عبدالعزیز شاہ عبدالقادر، شاہ رفیع الدین، شاہ محمد اسماعیل صاحب، اور شاہ محمد اسحاق صاحبؒ۔ ج:۔ اور مولانا محمد قاسم صاحب اور مولانا رشید احمد صاحب کی تالیفا وتصنیفات کی حفاظت یعنی کتب خانہ مدرسہ عالیہ میں جمع کرنا اور اشاعت بذریعہ طبع و نسخ ہوگی۔ اور اسی منہاج پر جدید رسائل۔ کتابیں مختلف زبانوں میں تصنیف و شائع کرائی جاویں گی۔

۵۔ جمعیۃ الانصار کا وہ جلسہ علمیہ جس میں ا۔ قرآن وحدیث شریف کے اسرار و لطائف بیان کئے ہوں۔ ب:۔ اصلاح عقائد واخلاق واعمال کے متعلق علمی مضامین پڑھے جائیں۔ ج:۔ مسلمانوں کے مذہبی علوم کی حفاظت واشاعت کے وسائل پر عموماً اور مدارس کی اصلاح و عمارت پر خصوصاً بحث ومشورہ ہو۔ ان تجاویز پر عمل کرنے کا تہیہ کیا جائے۔ موتمر الانصار کے نام سے موسوم ہوگی اسکی ایک شاخ قاسم المعارف ہوگی۔[1]

یہ رائے ابتدا ہی میں قرار پاگئی تھی کہ موتمر الانصار ہر سال کسی ایسے ضلع میں منعقد ہوا کرے گی جہاں پر اس کے انعقاد کی خواہش اور ضرورت محسوس کی جائے یا جہاں کے مسلمان اس کے مقاصد کو اہم اور ضروری سمجھ کر اس کو از خود اپنے یہاں مدعو کریں۔[2]

---

[1] یہ شاخ مرادآباد میں قائم کی گئی تھی [2] القاسم ربیع الثانی ۱۳۲۹ھ۔

یہ جلسے ایسے وقت میں منعقد کیا گیا کہ اس وقت پلیگ کا زور تھا کلکٹر صاحب نے منع کر دیا تھا مگر منتظمین حضرات نے کہا کہ ہمارا عقیدہ ہے کہ علماء کرام کی آمد سے یہ وبا ختم ہو جائے گی۔ چنانچہ کلکٹر صاحب نے اجازت دیدی اور جلسہ ہوا مگر جلسہ کے ساتھ ساتھ طاعون بھی ختم ہو گیا۔

اس جلسہ کی صدارت حضرت مولانا احمد حسن صاحب امروہوی نے فرمائی۔ اور جناب شوکت حسین صاحب کے خطبہ استقبالیہ کے بعد حضرت موصوف نے تقریر فرمائی۔ سہ پہر کے دوسرے جلسہ میں جمعیۃ کے اغراض و مقاصد بیان ہوئے اور جناب مولوی ہادی حسن صاحب مبلغ دارالعلوم کا وعظ ہوا۔ تیسرا جلسہ ۷ بجے سے گیارہ بجے تک ہوا جس میں مولانا انور شاہ کشمیری کی تقریر ہوئی۔ چوتھا اجلاس ۱۴ اپریل کو ہوا جس میں حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی کی تقریر ہوئی۔ آخری اجلاس ۱۷ اپریل کو ہوا جس میں تجاویز پڑھ کر سنائی گئیں۔

منظور شدہ تجاویز

(۱) انگریزی مدارس گورنمنٹ اسکول و کالجوں میں مسلمان طلبہ کی مذہبی تعلیم جس قدر کہ ان کو ضروری ہو خواہ ہفتہ میں ایک مرتبہ ہو اور ان کے دارالاقامت، بورڈنگ ہاؤس میں مسلمان طلبہ کی مذہبی تربیت یعنی وضع، طریقہ اسلام کی پابندی اور اسلامی شعار و اخلاق کے لئے جمعیۃ الانصار دیوبند ہر ایک اسکول و کالج میں حسب ضرورت معلم مقرر کرے جن کی تنخواہ ۲۵، ۳۰ روپے سے کم نہ ہو۔ کثرت رائے سے یہ تجویز پاس کی گئی۔

(۲) ہر ایک انگریزی مدارس (اسکول و کالج) میں کم از کم ۲۷ فیصدی وہ طلبا جن کی دوسری زبان عربی ہو ان کے لئے جمعیۃ انعامی وظائف جاری کرے اور

انکی تعلیم کے لئے لائق استاذ بہم پہونچائے۔ یہ تجویز بھی پاس ہوئی۔

۲۔ ایسے غریب گریجویٹ یا انڈر گریجویٹ طلبہ جن کی دوسری زبان عربی ہو اس کے لئے مدرسہ عالیہ عربیہ دیوبند میں تعلیم دینیات کا خاص انتظام ہو اور جمعیۃ ۲۰ سے ۴۰ روپے ماہوار تک وظائف ان کے واسطے جاری کرے۔ یہ تجویز بھی منظور ہوئی۔

۴۔ جمعیۃ مدرسہ عالیہ دیوبند میں ایک ایسی جماعت کھولے جو قرآن شریف پر مخالفین اسلام کے ان اعتراضات کا جواب دے سکے جو عربی وارد و زبان میں ہوں۔ ان زبانوں کے سوا دوسری زبانوں کے اعتراضات متعلقہ قرآن مجید کے جوابات جمعیۃ دینے کی ذمہ دار نہیں ہے۔ یہ تجویز بھی منظور ہوئی۔

۵۔ مساجد کے انتظام وامامت کے لئے اگر کسی جگہ کے لوگ جمعیۃ سے خواہش کریں تو وہ انکے لئے لائق عالم امامت و وعظ کے لئے بہم پہونچائے۔ (پاس)

۶۔ قرآن شریف اور دینی کتب کی طبع و تجارت کے لئے مسلمانوں کو آمادہ کرنا اور ان کے لئے انکو دوسری قوموں کا محتاج نہ ہونے دینا۔ (پاس)

۷۔ ایسے چھوٹے چھوٹے رسائل بکثرت مفت شائع کرنا جن میں عقائد اسلام کی تعلیم فرقہ آریہ کے جوابات اور وفاداری گورنمنٹ کی ہدایات ہوں[1] (پاس)

انگریز کی بوکھلاہٹ

مندرجہ بالا تجاویز اور انجمن کے اغراض و مقاصد کس قدر بے ضرر ہیں۔ اس کے اظہار کی ضرورت نہیں پھر جبکہ جلسہ عام میں ایک تجویز حکومت کی وفاداری کے متعلق بھی پاس کردی

---

[1] القاسم ربیع الثانی ۱۳۲۹ھ۔

گئی ہے تو پھر کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔ لیکن میں نے عرض کیا کہ حکومت کو بھانپنے کی عادت ہوتی ہے اور جبکہ اس کو الٹی پٹی پڑھانے والے بھی موجود ہوں تو شکوک وشبہات یقین سے بدل جاتے ہیں۔ چنانچہ جلسہ ختم ہونیکے فوراً بعد صدر جلسہ حضرت مولانا احمد حسن صاحب سے پوچھ تاچھ کی گئی۔ اور حضرت شیخ الہندؒ کی آمدنی پر ٹیکس لگایا گیا۔

حضرت شیخ الہندؒ نے اس تحریک کو شروع کر کے کیا پروگرام بنایا تھا اسکے ڈانڈے تحریک ریشمی خطوط نظر بندی مالٹا سے جا ملتے ہیں۔ جمعیۃ الانصار کی یہ تنظیم اگرچہ بالکل مذہبی تحریک ہے لیکن حضرت شیخ الہندؒ ملک میں ایک صالح اور قابل معاشرہ تیار کر رہے تھے اور اس کو منظم کر رہے تھے اس لئے کہ اگر آئندہ چلکر ہندوستان کے باہر سے جو انقلاب لایا جائے تو اندرون ملک ایک منظم گروہ ہونا چاہیئے جو انقلاب کو کامیاب بنائے اور ایک اشارے پر رات کی رات میں امریکہ کی طرح حکومت کا ڈھانچہ بدل دے۔ اس کے لئے ضرورت تھی کہ ملک کے اندر بکثرت لائق اور صالح اپنے افراد موجود ہوں لیکن افسوس کہ اپنی حکومت کے قیام کا یہ منصوبہ کامیاب نہ ہو سکا۔ کیونکہ تحریک کے ساتھ حکومت کی بدظنی اور اپنوں کی خوشامدانہ پالیسی اور ریشہ دوانیوں میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔

دیوبند میں ردعمل

حضرت مولانا عبید اللہ صاحب سندھی تحریر فرماتے ہیں۔

۱۳۲۷ھ میں حضرت شیخ الہندؒ نے دیوبند میں طلب فرمایا اور مفصل حالات سنکر دیوبند آکر کام کرنے کے لئے حکم دیا اور فرمایا کہ اس کے ساتھ سندھ کا

تعلق بھی قائم رہے گا۔ چار سال تک جمعیۃ کی تحریک اور تاسیس کا کام کرتا رہا[1]

ہوا یہ کہ (بقول صاحب نقش حیات اور علامہ سندھی) ارباب اہتمام دار العلوم دیوبند مولانا سندھی کی ان سرگرمیوں کو اپنے اور دار العلوم دیوبند کے لئے خطرہ کی گھنٹی سمجھتے تھے۔ اور اس خطرہ کو مول لینے کے لئے ارباب اہتمام کسی طرح تیار نہ تھے۔ اس لئے انھوں نے علامہ سندھی کے خلاف چند مسائل نکال کھڑے کئے تاکہ ان کو دار العلوم سے یہ کہکر نکال دیا جائے کہ "وہ اکابر کے مسلک سے ہٹ گئے ہیں یا گمراہ ہوگئے ہیں یا ان کے افکار و نظریات گمراہ کن ہیں لہٰذا ایسے شخص کا دار العلوم کی چہار دیواری میں رکھنا طلبا کے لئے مضر ہے۔ چنانچہ ارباب اہتمام نے چند مسائل کھڑے کئے اور مولانا کشمیری اور علامہ عثمانی کی ٹکر علامہ سندھی سے کرادی۔ دیوبند میں ان ہر سہ حضرات کے درمیان مناظرہ ہوا۔ جو حقیقت میں مولانا سندھی کے نکالنے کے لئے ایک بہانہ تھا۔ چنانچہ علامہ سندھی کے خلاف ایک ہلڑ بازی کھڑی کردی گئی اور ان کی پوزیشن کو ملک میں مجروح کرنے کی ناکام کوشش کی گئی۔

علامہ سندھی اپنے متعلق بیان کرتے ہیں۔

> دیکھو! میں سولہ برس کا تھا کہ گھر بار چھوڑ کر نکل آیا تھا۔ مانا کہ میرا خاندان بہت بڑا نہ تھا۔ اور ہمارے یہاں دولت کی فراوانی نہ تھی۔ لیکن آخر میری ماں تھی۔ میری بہنیں تھیں۔ اور ان کی محبت میرے دل میں جاگزیں تھی۔ لیکن مجھے اسلام سے اتنی محبت تھی کہ میں کسی کی محبت کو خاطر میں نہ لایا۔ خدا ہی

---

[1] نقش حیات ص۱۱۳ ج ۲، وخطبات سندھی ص۶۷۔

جانتا ہے کہ ماں کو چھوڑنے سے مجھے کس قدر ذہنی کوفت ہوئی (یہ
کہتے ہوئے مولانا آبدیدہ ہوگئے) آپ نے سلسلہ کلام جاری رکھتے
ہوئے فرمایا۔ اسلام سے میری اس شیفتگی کا نتیجہ تھا کہ جو بھی مجھے اسلام کی
بات سمجھاتا اور وہ بات میرے دل میں بیٹھ جاتی تو میں اس کا دل وجان
سے گرویدہ ہوجاتا۔ حضرت شیخ الہند رح مرحوم نے مجھے اسلام سکھایا اور
ان کے واسطے سے میں شاہ ولی اللہ کی تعلیمات کو سمجھا اور مجھ پر قرآن حکیم
کے حقائق منکشف ہوئے اور میں دین اسلام کی حکمت سے آگاہ ہوا اب
اگر میں موجودہ مذہبی طبقوں کے خلاف کوئی بات کہتا ہوں تو اسے یہ
سمجھنا کہ میں مذہب کے خلاف ہوں کس قدر غلط ہے۔[1]

اس تشریح سے یہ امر تو بخوبی ظاہر ہو رہا ہے علامہ سندھی کے خلاف کیسے حالات
پیدا کر دیئے گئے تھے اس پر مزید روشنی حضرت مولانا انور شاہ کشمیری کے مکتوب
سے پڑتی ہے۔ یہ مکتوب مولانا موصوف نے مکہ معظمہ علامہ سندھی کے پاس بھیجا تھا

قیام دیوبند کے زمانے میں غلط فہمی کی وجہ سے میں آپ کے لئے تکلیف کا
باعث بنا تھا اب میرے دل میں آپ سے کوئی رنج نہیں ہے۔ امید ہے کہ
آپ بھی معاف فرمائیں گے۔[2]

لیکن سوال یہ ہے کہ اگر یہ سب کچھ علمی اختلافات تھے تو کیا یہ اختلاف اس
قابل تھے کہ ایک سرگرم کارکن کو ضائع کر دیا جائے؟ اور کیا پھر یہ حالات صرف
علامہ سندھی کے ہی کے پیدا کئے ہوئے تھے؟ اگر غور کیا جائے تو اصل تحریک کے

---

[1] تعلیمات سندھی صلے [2] نقش حیات ص۱۷۷ ج ۲۔

محرک اعلیٰ حضرت شیخ الہندؒ تھے لیکن حضرت شیخ الہندؒ سے کون ٹکر لیتا؟ حقیقت یہ ہے کہ جمعیۃ الانصار کے پروگرام اس کی تجاویز سے جہاں انگریزوں کو بوکھلاہٹ تھی وہاں دارالعلوم دیوبند کے ارباب اہتمام کے اقتدار پر بھی شدید ضرب واقع ہو رہی تھی جس کے لئے انھوں نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ علامہ سندھی پر علمی اور مذہبی الزامات لگا کر ان کو علیحدہ کر دیا جائے۔

نظارۃ المعارف دہلی علامہ سندھی تحریر فرماتے ہیں۔ حضرت شیخ الہندؒ کے ارشاد سے میرا کام دیوبند سے دھلی منتقل ہوا ۱۳۳۱ھ میں نظارۃ المعارف قائم ہوئی اس کی سرپرستی میں حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ حکیم اجمل خاں صاحب اور نواب وقار الملک ایک طرح پر شریک تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ نے جس طرح چار سال دیوبند میں رہ کر میرا تعارف اپنی جماعت سے کرایا تھا اسی طرح دہلی بھیج کر مجھے نوجوان طاقت سے ملانا چاہتے تھے۔ اس غرض کی تکمیل کے لئے دہلی تشریف لائے اور ڈاکٹر انصاری سے میرا تعارف کرایا اور ڈاکٹر انصاری نے مجھے مولانا ابوالکلام اور مولانا محمد علی مرحوم سے ملایا اس طرح تخمیناً دو سال مسلمانان ہند کی اعلیٰ سیاسی طاقت سے واقف رہا[1]

ہجرت کابل ۱۳۳۳ھ مطابق ۱۹۱۵ء میں شیخ الہندؒ کے حکم سے کابل گیا مجھے کوئی مفصل پروگرام نہیں بتایا گیا اس لئے میری طبیعت اس ہجرت کو پسند نہیں کرتی تھی لیکن تعمیل حکم کے لئے جانا ضروری تھا۔ خدا نے اپنے فضل سے نکلنے کا راستہ صاف کر دیا میں افغانستان پہونچ گیا۔ دہلی کی سیاسی جماعت

---

[1] خطبات سندھی ص۶۔

کو میں نے نہیں بتایا کہ میرا کابل جانا طے ہو چکا ہے۔ انھوں نے اگرچہ مجھے اپنا نمائندہ بنایا مگر کوئی معقول پروگرام وہ بھی نہیں بتا سکے۔ کابل جا کر مجھے معلوم ہوا کہ حضرت شیخ الہندؒ جس جماعت کے نمائندے تھے اس کی پچاس سال کی محنتوں کا حاصل میرے سامنے غیر منظم شکل میں تعمیل حکم کے لئے تیار ہے۔ اس میں میرے جیسے ایک خادم کی حضرت شیخ الہندؒ کو اشد ضرورت تھی۔ اب مجھے اس ہجرت اور شیخ الہندؒ کے اس انتخاب پر فخر محسوس ہونے لگا میں سات سال تک حکومت کابل کی شرکت میں اپنا ہندوستانی کام کرتا رہا۔ ۱۹۱۶ء میں امیر حبیب اللہ نے ہندوؤں سے مل کر کام کرنے کا حکم دیا اس کی تعمیل میرے لئے فقط ایک صورت میں ممکن تھی کہ میں انڈین نیشنل کانگریس میں شامل ہو جاؤں اس وقت سے میں کانگریس کا ایک داعی بن گیا[1]

---

[1] خطبات سندھی ص۹۔

تحریک ریشمی خطوط اور اسکا پس منظر

تحریک سیّد احمد شہید

ہندوستان میں کمپنی بہادر کی حکومت قائم ہونے اور اس اعلان کے بعد کہ "خلق خدا کی" ملک بادشاہ کا اور حکم کمپنی بہادر کا" تحریک آزادی شروع ہو چکی تھی۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب نے ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ صادر کر دیا تھا۔ اس فتوے کے بعد حضرت سید احمد صاحب شہیدؒ نے جہاد کی تحریک شروع کی۔ حضرت سید صاحب اور ان کی جماعت کیا چاہتی تھی ملاحظہ فرمائیں۔

> کسی کا ملک چھین کر ہم بادشاہت کرنا نہیں چاہتے بلکہ سکھوں سے جہاد کرنے کی وجہ صرف یہی ہے کہ وہ ہمارے برادران اسلام پر ظلم کرتے ہیں اور اذان وغیرہ مذہبی فرائض میں مزاحم ہوتے ہیں اگر سکھ اب یا ہمارے غلبہ کے بعد ان حرکات مستوجب جہاد سے باز آجائیں تو ہم کو ان سے لڑنے کی ضرورت نہ رہے گی۔[1]

معلوم ہوا کہ سکھوں کے ساتھ جہاد کی نوعیت سیاسی (محض استخلاص وطن) نہ تھی بلکہ مذہبی اصولوں کی بنا پر یہ جہاد شرعی جہاد تھا۔ رہی انگریزوں کے خلاف تحریک جہاد وہ بھی محض سیاسی تحریک نہ تھی کیونکہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کا فتویٰ صادر

---

[1] نقش حیات ص۱۲ ج ۲۔

ہونے کی وجہ سے اس کو جہاد کہنا انسب ہے پھر استخلاص وطن خود ایک مذہبی چیز ہے
کیونکہ اسلام غلبہ کفر اور غلامی کو ہرگز ہرگز پسندیدہ نظر سے نہیں دیکھتا اس لئے کہ
غلامی کی حالت میں اسلام کے بہت سے معاملات اور شعار میں مداخلت لازم آتی ہے
جس کا دفعیہ اور ازالہ خود ایک شرعی فریضہ ہے۔

حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک اور جہاد کا منشا محض شعار اللہ کو زندہ کرنا اور ان کو مستحکم کرنا تھا یہ غلط ہے کہ وہ حکومت قائم کرنا چاہتے تھے انھوں نے صاف کہہ دیا تھا کہ

جس وقت ہندوستان ان غیر ملکی دشمنوں سے خالی ہو جائے گا اور ہماری کوششوں کا تیر مراد کے نشانوں تک پہونچ جائے گا۔ حکومت کے عہدے اور منصب ان لوگونکو ملیں گے جنکو انکی طلب ہوگی۔[1]

حضرت سید صاحب نے اپنی اس جہادی تحریک کو بالکل کتاب وسنت کی روشنی میں شروع کیا تھا اگر یہ تحریک کامیاب ہو جاتی تو آج ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت ہوتی۔ میں اس بات کو تسلیم کرنے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہوں کہ چونکہ حضرت سید صاحب کی فوج میں بعض غیر مسلم بھی شریک تھے۔ اس لئے نتیجۃً سیکولر حکومت قائم ہوتی۔ کیونکہ اس طرح کی تحریکات میں محض غیر مسلموں کی اعانت اور شرکت سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ کیا مدینہ منورہ کی حفاظت کے معاہدے میں یہود مدینہ شریک نہیں تھے۔ اگر وہ غزوہ خندق میں ساتھ دیتے تو کیا مدینہ منورہ سیکولر اسٹیٹ ہو جاتا؟ یا غزوہ خندق شرعی جہاد نہ ہوتا۔

---

[1] نقش حیات ص۱۲ ج ۲۔

یہ بات ضرور ہے کہ حضرت سید صاحب اور ان کے ساتھی کسی عہدے کے طالب نہیں تھے لیکن وہ اس بات کو بھی پسند نہیں کرتے تھے کہ انگریز کے ہاتھ سے اقتدار نکلنے کے بعد پھر اہل کفر کے ہاتھوں میں چلا جائے اور وہ پھر اپنے احکامات نافذ کرنے لگیں۔ اگر بالفرض یہی منشا ہوتا تو پھر ایک غلاظت سے نکلنے اور دوسری غلاظت میں جا پڑنے کے مترادف ہوتا۔ اور یہ تو ہوتا ہی ہے کہ جو قائد ہوتا ہے اسی کا دستور چلتا ہے۔ اس تحریک میں مسلمان قائد تھے اگر وہ نہ بھی چاہتے تب بھی اسلامی دستور چلتا اگرچہ اس کے بعض حاکم غیر مسلم ہی کیوں نہ ہوئے ہوتے۔ اور الشاذ کالمعدوم اور اس سے اسلامی حکومت میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ اور نہ اس کو سیکولرازم سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ہاں اسلامی شورائیت آج کل کی نام نہاد جمہوریت سے بالکل جدا ہے لہٰذا اسلامی شورائیت کو سیکولرازم سے تعبیر کرنا ایک اصولی غلطی ہے۔ غرضکہ حضرت سید صاحب کی تحریک کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ ملک میں ایک صالح معاشرہ تیار کر رہے تھے کہ جس کے ذریعہ ملک کے اندر ہی انقلاب پیدا ہو جائے اور خود ہندوستان کی شمالی و مغربی سمت سے مجاہدین کو لیکر حملہ آور ہونا چاہتے تھے مگر افسوس کہ وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔

انقلاب ۱۸۵۷ء

سنہ ۱۸۳۱ء میں حضرت سید صاحب کی تحریک کا خاتمہ ہو گیا تو اس کے ۲۵ یا ۲۶ سال بعد یہ انقلاب ۱۸۵۷ء میں آیا۔ یہ انقلاب بالکل علاقائی جد و جہد آزادی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے جس میں علاقوں نے اپنی سالمیت برقرار رکھنے کے لئے انگریزوں سے جنگ کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ علاقے بھی اپنی آزادی کو کھو بیٹھے اگر دل سے تمام علاقے تخت دہلی کا ساتھ دیتے تو

آزادی حاصل ہو جاتی۔

میسور کی ریاست پر مکمل انگریزوں کا قبضہ تھا۔ حیدرآباد انگریزوں کا باجگزار بن چکا تھا۔ پنجاب میں سکھ حکومت قائم تھی۔ جو دلی کی مسلم حکومت کو ایک آنکھ دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ راجپوتانہ میں چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں جن پر جاٹوں کا تسلط تھا جو آپس میں تورقابت رکھتی تھی۔ لیکن دلی کے تباہ کرنے میں متحد تھیں۔ دہلی کے شمال میں روہیلے تھے جو خود مختار تھے۔ اودھ کی حکومت تقریباً پامال ہو چکی تھی اس کے علاوہ اور بہت چھوٹے چھوٹے علاقے تھے جو آپس میں بغض و کینہ رکھتے تھے۔ ایسے ماحول میں بادشاہ دہلی نے ایک اعلان جاری کیا۔

> چونکہ اہل یورپ ہندومت اور اسلام دونوں کے دشمن ہیں اور اس وقت مذہب کی بنیاد پر جنگ جاری ہے۔ اس لئے پنڈتوں اور فقراء پر لازم ہے کہ وہ مابدولت کے حضور اپنے آپ کو پیش کریں اور مقدس جنگ میں حصہ لیں کیونکہ پنڈت اور فقراء ہندومت اور اسلام کے محافظ ہیں اگر ایسا نہ کریں گے تو وہ شرعی اور شاستر کی رو سے گنہگار ہوں گے۔ اگر وہ مابدولت کے حضور پیش ہو جائیں تو وہ بادشاہی حکومت کے قیام پر معافی اراضی پانے کے مستحق ہوں گے۔[1]

اس اعلان کے جاری ہونے کے بعد اکثر مسلم علاقوں نے بادشاہ کی حمایت کی لیکن بڑی ریاست سکھ اور مرہٹے انھوں نے دہلی حکومت کی کوئی اعانت نہیں کی۔ جہاں تک شمالی ہندوستان (پنجاب کو چھوڑ کر) کا تعلق وہ اس وقت بھی

---

[1] مدینہ ۲۸ مئی ۱۹۵۷ء۔

دلی کے بادشاہ کو اپنا بادشاہ تسلیم کرتا تھا اور اس کے ہر حکم پر فدا ہونے کو تیار تھا لیکن بدنظمی، خیانت، دھوکہ کا برا ہو کہ اس نے انقلاب ۱۸۵۷ء کو فیل کر دیا جس کے نتیجہ میں تقریباً سو سال ہندوستانیوں کو غلام رہنا پڑا۔

غدر کے بعد انگریزی پالیسی

اس جگہ سنہ ۱۸۵۷ء سے لیکر سنہ ۱۹۲۰ء تک کی چند چیزیں جن سے انگریزوں کی مسلمانوں سے دشمنی اور عناد اور مسلم کش پالیسی کا اندازہ ہو سکے گا پیش کی جا رہی ہیں۔

انقلاب سنہ ۱۸۵۷ء کے نتائج میں یکطرفہ مسلمانوں کا نقصان ہوا۔ ان کی جان مال، عزت آبرو، سب کچھ انگریزوں کے ظلم و ستم کی نظر ہو گئے۔ انگریز نے نہایت سوچ سمجھ کر ہندو نواز اور مسلم کش پالیسی کو اختیار کیا۔ میجر ڈی باسو (ایک مشہور ہندو مضمون نگار) لکھتا ہے کہ غزنی کی فتح کے موقع پر لارڈ النبرا نے ولایت سے ڈیوک آف ولنگٹن کو لکھا۔

> مجھے اچھی طرح ثابت ہو گیا ہے کہ وہ خاص لوگ جن کی گزری ہماری روٹیوں کے ٹکڑوں پر ہے وہ دل سے ہمارے بدخواہ تھے بخلاف اس کے ہندو ہماری فتح پر اظہار شادمانی کر رہے ہیں جب ہمیں ان مسلمانوں کی دشمنی کا یقین کامل ہے جن کی تعداد $\frac{1}{10}$ ہے پھر کیوں نہ ہم ہنود کا ساتھ دیں جن کی تعداد $\frac{9}{10}$ ہے اور جو ہمارے وفادار ہیں۔[1]

سر ولیم ہنٹر نے ۱۴ر جولائی سنہ ۱۸۶۹ء کو ایک بیان میں کہا۔

اس خبر کی کوئی تردید نہیں کی گئی کہ سندربن کے کمشنر نے گورنمنٹ گزٹ میں

---

[1] تیج دہلی، ار ستمبر سنہ ۲۵ء۔

اعلان کیا تھا کہ جو ملازمتیں خالی ہوئی ہیں ان پر سوائے ہندو کے کسی کا تقرر نہ کیا جائے۔[1]

اڈیٹر ملاپ انگریز کی اس مسلم کش پالیسی کے بارے میں راقم ہے۔

پہلے تو حکومت مسلمانوں کے برخلاف تھی اور سمجھتی تھی کہ ان میں سے بہتیرے امن پسند نہیں ہیں اور آج سے نصف صدی پہلے گورنمنٹ کا جھکاؤ ہندوؤں کی طرف تھا لیکن اب وہ صورت نہیں ہے۔ جن لوگوں نے ۱۸۵۷ء کا غدر دیکھا ہے وہ بوڑھے بتلاتے ہیں کہ انگریزی سرکار ہندوؤں کی پوری طرفدار تھی۔[2]

ایڈیٹر تیج لکھتا ہے۔

۱۸۵۷ء کے بعد حکومت مسلمانوں کو سخت نفرت کی نگاہ سے دیکھتی تھی اور اس بات کی کوشش کرتی تھی کہ جہاں تک ہوسکے انکو دبا کر رکھا جائے ہندوؤں کو ان دنوں اچھی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔[3]

ان چند اقتباسات سے یہ امر بخوبی واضح ہوجاتا ہے کہ انگریز نے ہندوستان میں مسلمانوں کو صرف تباہ ہی نہیں کیا بلکہ ایسی پالیسی بھی اختیار کی جو انکو پنپنے نہ دے۔

ہندو پالیسی

انگریز کی مسلم کش پالیسی سے اشارۃً یہ بات ظاہر ہورہی ہے کہ اس مدت میں ہندوؤں کی مسلمانوں کے متعلق کیا پالیسی ہوگی۔ تاہم چند اقتباسات انکے متعلق بھی پیش کیے دیتے ہیں۔

کانگریس کے قائم ہونے کے ۸ سال بعد اس کے سالانہ اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے سردار دیال سنگھ نے اپنے خطبہ صدارت میں فرمایا۔

---

[1] روشن مستقبل ص ۱۵۹[2] ملاپ ۱۱ اکتوبر ۱۹۲۷ء [3] تیج ۱۰ جون ۱۹۲۷ء۔

کانگریس اس ملک میں برٹش کی چمکتی ہوئی یادگار ہے ہم اس آئینی دور میں
رہنے کا فخر رکھتے ہیں جس کا نعرہ آزادی ہے اور جس کا سب سے بڑا ستون
رواداری ہے۔

دادا بھائی نوروجی فرماتے ہیں۔

ہم کو مردانہ وار کہدینا چاہیئے کہ ہم سر سے پا تک برطانیہ کے وفادار ہیں۔

بارہویں سالانہ اجلاس کانگریس ۱۸۹۶ء کی صدارت کرتے ہوئے اسکے صدر نے کہا۔

اس آفتاب کے نیچے انگریز قوم سے زیادہ ایماندار اور ثابت قدم کوئی قوم
موجود نہیں ہے۔

غرضکہ ۱۸۵۷ء لغایتہ ۱۹۲۰ء تک کانگریس اور ہندو پالیسی انگریز وفاداری
کی تھی۔ انگریز اور ہندو دونوں ہی ملکر مسلمانوں کو تباہ حال اور پس ماندہ کرنے کے
درپے تھے۔ ان حالات میں حضرت شیخ الہندؒ نے ۱۹۰۵ء میں اولاً جمعیۃ الانصار کی
بنیاد ڈالی (جس کے اغراض و مقاصد ہم اوپر بیان کر چکے ہیں) اس کے تقریباً آٹھ
سال بعد تحریک ریشمی خطوط کا آغاز فرمایا جس کے نتیجہ میں آپ کو مالٹا میں اسیر رہنا پڑا۔
اس پس منظر سے ہر صاحب فہم یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ کیا چاہتے تھے
میں یقین کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ حضرت شیخ الہندؒ جہاں انگریزوں کو ہندوستان
سے باہر نکالنا چاہتے تھے اسی کے ساتھ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ ہندوستان میں ایک
صالح معاشرہ قائم ہو جائے۔ اس کے بعد ہندوستان میں جو حکومت قائم ہو وہ اسلامی
حکومت ہو۔ مذکورہ بالا حالات کی روشنی میں۔ میں یہ کیسے یقین کروں کہ حضرت
شیخ الہندؒ بلا مقصد ہندوستان میں انقلاب لانا چاہتے تھے ان کا صرف واحد منشا

اخراج انگریز تھا اور بس۔ ان کو اس سے کوئی غرض نہیں تھی کہ ہندوستان میں انگریز کے بعد کونسا راج قائم ہوگا؟ میں کہتا ہوں کہ اگر اس وقت انقلاب آجاتا تو جس حکومت کی تشکیل ہوتی اسکے وزیر اعظم مولانا عبیداللہ سندھی ہوتے۔

آج میری اس رائے کے متعلق اشارے کئے جا سکتے ہیں لیکن ۱۹۳۶ء میں بھی یہی بات کہی گئی تھی جو میں کہہ رہا ہوں۔

واقعہ صرف اتنا ہے کہ مولانا ہندوستان میں ایسے انقلاب کے متمنی تھے جس میں شرعی نظام مکمل طور پر قائم رہے[1]

میرے نزدیک حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے اصطلاحی لفظ "فک کل نظام" کا یہی مطلب ہے جس کے لئے تحریک سید احمد شہید، جمعیۃ الانصار، تحریک ریشمی خطوط، تحریک خلافت وجود میں آئی۔ اس کے علاوہ تحریک ریشمی خطوط کے اراکین کی زندگیوں کا مطالعہ کرنے کے بعد اس کا تصور بھی محال ہے کہ ہندو جاتی کی تنگ نظری کے باوجود اور ایسی تنگ نظری کہ جو خود اپنے ہی فرقوں سے بیزار ہوں۔ وہ مستقبل کا کوئی خاکہ بنائے بغیر ایک منزل کی طرف بڑھ رہے تھے۔

یہ ہو سکتا ہے کہ بعض سیاسی حضرات میرے اس نظریہ سے متفق نہ ہوں اور مجھے اس کی فکر بھی نہیں ہے کیونکہ میرے نزدیک وہ حضرات ...... (جو اپنا سیاسی عقیدہ ایک غیر اسلامی سیاسی نظریہ .... قرار دیتے ہیں۔ اور جن کو یہ تک خبر نہیں ہے کہ ہماری زبان سے جو الفاظ نکل رہے ہیں ان کا پاور ہاؤس اسلامی ہے یا غیر اسلامی) وہ نہیں ہیں جن کے صدر حضرت شیخ الہندؒ تھے۔ اور اسکا ثبوت حضرت شیخ الہندؒ کے خطبات اور مکتوبات ہیں جو اس کتاب کے آخر میں درج ہیں۔

---

[1] مسلمانوں کا ایثار ص۸۷۔

اراکین تحریک ریشمی خطوط

یہ تحریک جس کا مختصر تعارف ہم گذشتہ سطور میں کرا چکے ہیں. ہندوستان کی آزادی اور یہاں پر اسلامی حکومت کے قیام کے لئے شروع کی گئی تھی جس کا طریقہ کار یہ تھا کہ پورے ہندوستان میں جمعیۃ الانصار کے ذریعہ یہاں کے مسلمانوں میں ایک تنظیم قائم کیا جائے اور باہر جا کر ایک حکومت موقتہ قائم کی جائے. یہ حکومت موقتہ (جس کے کچھ افراد ہندوستان میں بھی تھے) باہر اسلامی ملکوں سے امداد حاصل کر کے ہندوستان کے شمال مغربی گوشہ سے فرنیٹر اور افغانستان کے پٹھانوں کے ذریعہ ہندوستان پر حملہ کرنا چاہتی تھی۔ اور اندرون ملک اپنی تیار کردہ تنظیم کے ذریعہ حکومت کے نظام کو معطل کرنا چاہتی تھی۔

وہ افراد جنھوں نے اس تنظیم اور تحریک میں حصہ لیا ہے یہ ہیں (۱) حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ (۲) مولانا عبید اللہ سندھی (۳) حاجی ترنگ زئی (۴) مولانا سیف الرحمٰن صاحب (۵) مولانا منصور صاحب انصاری (۶) عزیز گل صاحب (۷) مولانا احمد اللہ صاحب پانی پتی (۸) شیخ عبد الرحیم صاحب (۹) مولانا ابوالسراج صاحب (۱۰) مولانا ظہور محمد خاں صاحب (۱۱) مولانا ابوالحسن صاحب تاج محمود (۱۲) مولانا صادق محمد صاحب (۱۳) مولانا فضل ربی صاحب (۱۴) مولانا محمد اکبر صاحب (۱۵ مولانا فضل محمود صاحب (۱۶) خان بادشاہ عبد الغفار (۱۷) ڈاکٹر انصاری (۱۸) محمد احمد صاحب چکوائی

(۱۹) حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری۔ ان حضرات میں سے حضرت مولانا عبیداللہ صاحب سندھی کا تذکرہ اجمالاً گذشتہ سطور میں آچکا ہے اور حضرت شیخ الہندؒ کے حالات آئندہ صفحات میں مرقوم ہیں۔ بقیہ حضرات کا تعارف اس جگہ کرایا جارہا ہے۔

۲۔ حاجی ترنگ زئی

پورا نام فضل واحد عرفیت ترنگ زئی ہے۔ آپ موضع اتمان زئی تحصیل چارسدہ ضلع پشاور کے ساکن ہیں آپ حضرت مولانا شاہ نجم الدین کے خلیفہ ہیں۔ اپنے علاقہ میں اپنے علم و عمل کے باعث نہایت باعزت و باوقار تھے۔ ایک اشارے میں پورا یاغستان جان فدا کرنے کو تیار ہو جاتا تھا۔

حضرت شیخ الہندؒ نے مولانا عزیز گل اور مولانا سندھی کے ذریعہ انکے پاس پیغام پہونچایا کہ آپ یاغستان میں مقیم رہ کر انگریزوں کے خلاف گوریلا جنگ کریں ساتھ ہی اپنے شاگردوں کو لکھا کہ حاجی ترنگ زئی کے اشاروں پر جان دینے کو تیار ہو جاؤ۔ چنانچہ حضرت شیخ الہندؒ کی ہدایت کے مطابق حاجی ترنگ زئی یاغستان پہنچے اور انگریزوں سے جنگ شروع کردی۔ ادھر انگریزوں کی تمام آموزدہ کار فوجیں دوسرے ملکوں میں لڑ رہی تھیں نئے رنگروٹ موجود تھے۔ جو گوریلا جنگ سے واقف نہ تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزوں کے دو ڈویژن ...... صاف کردیئے۔ ایک انگریز مورخ لکھتا ہے۔

ہم نے اس کا غلط اندازہ لگایا تھا وہ لوگ جو ان کے ساتھ مذہب کی بنا پر شامل ہوئے تھے فتح یا شہادت کی امید پر بڑے پرجوش اور بے صبر ہو رہے

تھے اور وہ قبائل جو ذرا متعصب تھے انہیں اس خدشہ کو کام میں لاکر اکسایا گیا تھا کہ ان کے علاقہ پر انگریزی فوجیں چڑھ آئی ہیں یا ان کا علاقہ میدان جنگ بنایا گیا ہے۔ اس طرح شوق اور رقابت نے قبائلی لوگوں میں آگ لگادی تھی۔ اور وہ تربیت یافتہ فوج کی ہر کوشش کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔

ایک دوسری جگہ لکھتا ہے۔

جب ہم نے اس مہلک گھاٹی کو چھوڑا تو اس کے چپہ چپہ پر برطانوی سپاہیوں کی قبریں تھیں۔[1]

جب انگریز طاقت کے بل بوتے پر کامیاب نہ ہوسکا تو اس نے اپنی پھوٹ ڈالنے والی پالیسی سے کام لیا۔ اور یہ مشہور کرادیا کہ جب تک تمہارا کوئی امیر نہ ہو اور اس کے ہاتھ پر تم بیعت جہاد نہ کرو اس وقت تک تمہارا جہاد، شرعی جہاد نہ ہوگا اس کے لئے اس نے اپنا روپیہ پانی کی طرح بہایا۔ مولانا سندھی لکھتے ہیں۔

انگریزوں نے کافی روپیہ امیر کو دیا کہ یاغستان میں تقسیم کرے اور اپنی سلطنت کے نام پر قبائل افغانیہ سے بیعت حاصل کرے اور پشاور میں افغانوں کو کہا جاتا تھا کہ امیر کابل جہاد کرے تو اس وقت بیشک تم جہاد میں شریک ہوجاؤ۔ لیکن بغیر بادشاہ کے جہاد ناجائز ہے اس عام بدنظمی سے پرہیز کرو اس طرح حاجی ترنگ زئی اور دوسرے مجاہدین کا کام رک گیا۔[2]

ان دنوں حضرت شیخ الہندؒ ہندوستان ہی میں تھے۔ اور یہاں سے پٹھانوں کی مالی

---

[1] نقش حیات ص۱۴۳ ج ۲ [2] ایضاً ص۱۴۶

امداد کر رہے تھے۔ سرحد سے چند مرتبہ خبریں آئیں کہ آپ آجائیں۔ مجاہدین آپ مجتمع ہو جائیں گے لیکن آپ چند مجبوریوں کی وجہ سے نہ جا سکے۔ ادھر سرکار انگلشیہ کو آپ کی سرگرمیوں کا علم ہو گیا جس کے نتیجہ میں آپ کو فوراً ہی ہندوستان چھوڑنا پڑا۔

مدینہ منورہ پہنچ کر آپ نے ترکی حکومت سے عہد نامے اور مواثیق حاصل کئے اور ان کو کسی ذریعہ سے یاغستان پہونچانے کا بندوبست کیا۔ عراق، ایران کا راستہ بند ہونے کی وجہ سے آپ نے جدہ کی راہ سے یاغستان جانا چاہا مگر شریف مکہ نے آپ کو گرفتار کرا دیا۔ ادھر انگریز اپنی پالیسی میں کامیاب ہو گئے۔ اور حاجی ترنگ زئی کو مورچہ چھوڑنا پڑا۔

۳۔ مولانا سیف الرحمن صاحب

یہ قندھاری افغان ہیں حضرت گنگوہی سے علم حدیث حاصل کیا تھا اور مدرسہ فتحپوری میں صدر مدرس ہو گئے تھے۔ بہترین واعظ تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ نے ان کو اپنی تحریک کا رکن بنایا۔ اور مدرسہ فتحپوری سے استعفیٰ دلوا کر حاجی ترنگ زئی کے ساتھ کام کرنے کو کہا۔ وہاں انھوں نے اپنی تقریروں کے ذریعہ انگریزوں کے خلاف خوب آگ بھڑکائی تھی۔

۴۔ مولانا منصور صاحب

آپ کا اصلی نام محمد میاں ہے۔ یہ نام (محمد منصور انصاری) روپوشی کے زمانہ میں کابل پہونچ کر رکھ لیا تھا۔ آپ حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ نانوتوی کے نواسے اور شمس العلما حافظ محمد احمد صاحب کے حقیقی بھانجے اور پیرجی عبداللہ صاحب سابق ناظم دینیات علیگڈھ کے فرزند ہیں۔ دارالعلوم دیوبند کے اچھے فضلا میں آپ کا

شمار ہوتا ہے۔ مختلف مقامات پر تدریسی خدمات انجام دے چکے تھے۔ آخر میں حضرت شیخ الہندؒ نے اعانت ترجمہ قرآن شریف کے لئے ان کو بلالیا تھا۔ اور اپنی اسکیم کا ممبر بھی بنالیا تھا۔ بہت دنوں تک انھوں نے جمعیۃ الانصار میں حضرت مولانا سندھی کی نیابت کے فرائض انجام دیئے۔

جس وقت حضرت شیخ الہندؒ نے ہندوستان سے ہجرت فرمائی تو یہ ہمراہ تھے۔ مدینہ منورہ پہونچ کر حضرت شیخ الہندؒ کی ہدایت کے مطابق غالب نامہ لیکر ہندوستان آئے لیکن ہندوستان آتے ہی تحریک کا راز افشا ہو چکا تھا اور گرفتاریاں شروع ہو گئیں تھی۔ یہ بھیس اور نام بدل کر یاغستان روانہ ہو گئے اور وہاں مولانا عبید اللہ سندھی اور حاجی ترنگ زئی سے جا ملے۔ انکی عدم موجودگی میں ڈاکٹر انصاری صاحب نے تیس روپے ماہانہ کے ذریعہ ان کے اہل و عیال کی اعانت کی۔

جب تحریک ناکام ہو گئی تو انھوں نے افغانستان کی حکومت میں ملازمت کر لی۔ کافی دنوں تک وزیر مختار رہے۔ اس کے بعد روس سفارت خانہ کے مشیر سیاسی بناکر بھیجے گئے۔ افغانستان رہ کر انھوں نے شادی بھی کر لی تھی۔ ہندوستان میں بھی ان کے بیوی بچے تھے۔ مولانا حامد الانصار غازی سابق ایڈیٹر مدینہ انکے بڑے فرزند ہیں۔

۵۔ مولانا عزیز گل صاحب آپ زیارت کا کا صاحب ضلع پشاور کے باشندے ہیں اور حضرت شیخ الہندؒ کے معتمد خاص و جاں نثار شاگرد ہیں۔ آپ ابتدا ہی سے تحریک ریشمی خطوط کے رکن خاص رہے۔ دیوبند سے علاقہ یاغستان میں خبر رسانی اور وہاں پر تحریک کو زور سے چلانا آپ کے ذمہ تھا

اس خدمت کو انجام دینے کے لئے دسیوں مرتبہ جانی خطروں میں مبتلا ہوئے مگر بفضلہ تعالیٰ بچ گئے۔ حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ گرفتار ہو کر مالٹا بھی گئے تھے۔ وہاں بھی حضرت کی دل و جان سے خدمات انجام دیں۔

مالٹا سے آنے پر دیوبند کی خلافت کمیٹی کے صدر منتخب ہوئے۔ چونکہ پہلی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا اس لئے حضرت شیخ الہندؒ کی بھانجی کی لڑکی سے نکاح کر لیا تھا اور دیوبند میں لکڑیوں کی ایک دوکان ذریعہ معاش کے لئے کر لی تھی۔ اس بیوی کے انتقال کے بعد رڑکی تشریف لے گئے اور وہاں مدرسہ رحمانیہ میں صدر مدرس ہو گئے اور ایک میم سے اسکی خواہش پر نکاح کر لیا۔ اس کے بعد اپنے وطن تشریف لے گئے۔

۶۔ مولانا احمد اللہ صاحب

پانی پت کے رہنے والے اور شیخ جلال الدین کبیرالاولیاء کی اولاد میں سے ہیں۔ علوم عربیہ مختلف مدارس میں حاصل کیا اور دورہ حدیث حضرت شیخ الہندؒ سے پڑھا۔ اس کے بعد مختلف مدارس میں پڑھاتے رہے۔ جب حضرت شیخ الہندؒ نے ترجمہ قرآن شریف کا کام شروع کیا تو اپنی اعانت کے لئے ان کو بلالیا۔ یہ حضرت کے ساتھ کافی عرصہ تک یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ حضرت شیخ الہندؒ کو ان پر اس قدر اعتماد ہو گیا تھا کہ اپنی ڈاک کا کام ان ہی کے سپرد کر دیا تھا۔ اور تحریک میں بھی شریک کر لیا تھا۔ جب حضرت شیخ الہندؒ نے ہندوستان سے ہجرت فرمائی تو ان کو ہندوستان میں تحریک سے متعلق تمام امور جزئیہ کا مختار کر دیا اور بڑے امور کے لئے حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری کی طرف رجوع کرنے کے لئے حکم فرمایا۔

حضرت شیخ الہندؒ کے بعد جب پولیس نے گرفتاریاں شروع کیں تو یہ اپنے

وطن پانی پت آ گئے. مگر یہاں بھی ان کا پیچھا کیا گیا۔ پولیس جس وقت ان کے مکان پر چھاپہ مارنے جا رہی تھی تو انھوں نے تھوڑی دیر پہلے تمام کاغذات کو دوسری طرف منتقل کر دیا تھا۔ اس لئے پولیس کو ناکامیاب واپس ہونا پڑا لیکن اس نے یہ چالاکی کی کہ ایک سی، آئی، ڈی کو ان پر مسلط کر دیا وہ ان سے بیعت ہو گیا۔ مولانا نے مرید باوصفا پر اعتماد کرتے ہوئے تمام حالات سے آگاہ کر دیا جس کے نتیجہ میں مولانا کو گرفتار ہونا پڑا۔ کافی عرصہ تک جیل میں رہے۔ بالآخر تحریک کے ختم ہو جانیکے بعد معافی مانگ کر آزاد ہوئے۔

۷۔ مولانا ظہور محمد صاحب آپ سہارنپور کے رہنے والے اور حضرت شیخ الہندؒ کے شاگرد ہیں۔ شروع سے تحریک کے رکن رہے تحریک کے لئے چندہ فراہم کرنے کا کام ان ہی کے سپرد تھا۔ آخر میں سی، آئی، ڈی کی اطلاع پر گرفتار کر لئے گئے۔ چند سال جیل میں رہے اور پھر بعد میں آزاد ہو گئے تھے تحریک خلافت کے زمانہ میں انتقال ہوا۔

۸۔ شیخ عبدالرحیم صاحب سندھی آپ اچاریہ کرپلانی کے بڑے بھائی تھے۔ تعلیمات اسلام سے متاثر ہو کر اسلام قبول کر لیا تھا اور مولانا عبیداللہ سندھی کے گہرے دوست ہو گئے تھے۔ مولانا عبیداللہ سندھی نے ان کو تحریک کا رکن بنا لیا تھا۔ مولانا موصوف صوبہ سرحد سے ان ہی کے ذریعہ خط و کتابت کیا کرتے تھے۔ صوبہ سندھ میں تبلیغ اسلام کا کام انھوں نے نہایت عمدہ طور پر شروع کیا جس کے نتیجہ میں بہت سے غیر مسلم مسلمان ہوئے۔ ڈاکٹر شمس الدین صاحب نے بھی انھیں کی کوششوں سے اسلام قبول کیا۔ جب سی آئی

ڈی کو معلوم ہوا کہ یہ بھی تحریک میں شریک ہوگئے ہیں تو ان کو گرفتار کرنا چاہا۔ مگر یہ روپوش ہوگئے اور بحالت روپوشی سرہند میں انتقال فرمایا۔

۹۔ مولانا ابوالسراج غلام محمد صاحب

آپ موضع دین پور علاقہ خان پور ریاست بہاولپور کے باشندے اور حضرت حافظ محمد صدیق صاحب بھرچونڈوی شریف کے خلیفہ اول تھے۔

حضرت حافظ محمد صدیق صاحب اپنے زمانہ کے اولیاء کاملین میں سے تھے۔ آپ روحانی کمالات میں اتنے بلند مرتبے پر فائز تھے کہ ان کو کوئی بزرگ بھی بیعت کرنے کی ہمت نہیں کرتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی بزرگ نے فرمادیا تھا "تجھے وہ بیعت کریگا جس کے سامنے بھنی ہوئی مچھلی زندہ ہوجائے گی"[1] چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ ایک مرتبہ آپ کے یہاں شاہ حسن صاحبؒ مہمان ہوئے۔ اتفاق سے اس دن حافظ صاحب کے یہاں بھنی ہوئی مچھلی موجود تھی وہ لاکر پیش کردی۔ شاہ صاحب نے فرمایا۔ میاں کوئی زندہ مچھلی بھی کھاتا ہے؟ دسترخوان اٹھاکر دیکھا تو مچھلی زندہ تھی۔ فوراً ہی ان کے دست حق پرست پر بیعت ہوگئے۔ حضرت مولانا عبیداللہ سندھی بھی ان ہی حافظ صاحب سے بیعت تھے۔ حافظ صاحب ہی نے ان کو مسلمان کیا اور انکی ختنہ کرائیں تھی۔ بالآخر آپ کو اپنا منہ بولا بیٹا بنالیا۔ ان ہی کے اشارے پر آپ دیوبند حضرت شیخ الہندؒ کی خدمت میں علم دین حاصل کرنے حاضر ہوئے تھے۔ ابھی مولانا سندھی فارغ بھی نہ ہوئے تھے کہ حافظ صاحب کا وصال ہوگیا۔

بہرحال حضرت غلام محمد صاحب دین پوری ان ہی بزرگ کے خلیفہ ہیں۔

---

[1] مرد مومن صـ۱۳۔

حضرت دین پوری کے بارے میں مشہور ہے کہ آپ اپنے زمانے کے قطب الاقطاب ہوئے ہیں۔ تمام مجذوبوں کے تقرر و برخاست اور تعین کے فرائض آپ ہی کے سپرد تھے۔ حضرت مولانا عبید اللہ صاحب سندھی کی وساطت سے حضرت شیخ الہند رح نے اپنی تحریک کی دعوت ان کے سامنے پیش کی۔ انھوں نے دل و جان سے اس کو قبول کیا اور نہایت رازداری سے اس خدمت کو انجام دیتے رہے۔ آپ نے انقلاب لانے کے تمام سامان کر لئے تھے لیکن انگریزوں کو کسی طرح اس کا علم ہو گیا تو ان کو بڑی حکمت عملی سے گرفتار کر کے جالندھر میں نظر بند کر دیا گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد عوام کے اشتعال اور ثبوت نہ ملنے کی وجہ سے چھوڑ دیا۔

۱۱۔ مولانا محمد صادق صاحب کرانچوی

آپ حضرت شیخ الہند رح کے شاگرد رشید ہیں۔ محلہ کھڈہ کراچی کے باشندے تھے۔ مولانا عبید اللہ سندھی سے گہرے تعلقات تھے۔ شروع ہی سے حضرت شیخ الہند رح کی تحریک میں شریک رہے۔ جنگ عمومی کے دوران جب انگریزوں نے عراق پر حملہ کیا تو انھوں نے لس بیلا اور بلوچستان میں بغاوت کرا دی جس کی وجہ سے انگریزوں کو عراق کے محاذ سے طاقت تقسیم کر کے بلوچستان میں لگانی پڑی۔ ادھر عراق میں انگریزی کمانڈر کو امداد نہ پہونچنے کی وجہ سے ہتھیار ڈال دینے پڑے۔ اس جنگ میں انگریزوں کے سترہ ہزار سپاہی کام آئے۔ جب انگریزوں کو مولانا محمد صادق صاحب کی سازش کا پتہ چلا تو ان کو گرفتار کر لیا لیکن ثبوت نہ ملنے کی وجہ سے چھوڑ دیا ۔ سنہ ۱۹۵۳ء میں ان کا انتقال ہوا ہے۔

۱۲۔ مولانا فضل ربی صاحب آپ پشاور کے باشندے اور حضرت شیخ الہندؒ کے شاگرد خاص ہیں۔ پشاور میں درس دیا کرتے تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ کا حکم پہونچا کہ تم باغستان چلے جاؤ اور وہاں لوگوں کو جہاد کے لئے آمادہ کرو۔ چونکہ ان کو تقریر بہت اچھی کرنا آتی تھی اس لئے حاجی ترنگ زئی کے ساتھ ملکر خوب کام کیا۔ جب تحریک فیل ہوگئی تو حکومت افغانستان کی ملازمت اختیار کر لی۔

۱۳۔ مولانا محمد اکبر صاحب حضرت شیخ الہندؒ کے شاگرد ہیں۔ دیوبند سے فارغ التحصیل ہو کر ساؤتھ افریقہ چلے گئے تھے وہاں دو تین سال تک رہے۔ اس کے بعد اپنے وطن یاغستان چلے گئے اور وہاں جہاد آزادی کے لئے پٹھانوں میں اتحاد قائم کرایا۔

۱۴۔ مولانا فضل محمود صاحب ضلع پشاور کے باشندے ہیں حضرت شیخ الہندؒ کے حکم سے یاغستان چلے گئے اور وہاں جہاد کے لئے نہایت ٹھوس کام انجام دیئے۔ جب تحریک فیل ہوگئی تو اپنے وطن پشاور میں روپوشی کی زندگی گزارتے رہے۔

۱۵۔ حضرت مولانا تاج محمود صاحب امروٹیؒ آپ کی ولادت قصبہ دیوانی تحصیل روہڑی ضلع سکھر میں ہوئی۔ آپ کی تاریخ تولد متعین نہیں ہو سکی۔ اندازہ یہ ہے کہ آپ اٹھارویں صدی کے نصف آخر کے ابتدائی سالوں میں پیدا ہوئے۔ آپ حسب و نسب کے لحاظ سے سید تھے۔ آپ کا خاندان اپنے علاقہ میں رشد و ہدایت کا مرکز تھا۔ آپ کے والد

حضرت مولانا سید عبد القادر صاحب علوم ظاہریہ و باطنیہ میں باکمال بزرگ تھے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم کے مراحل اپنے والد کے یہاں طے کئے اور علوم ظاہریہ کی تکمیل حضرت مولانا عبد القادر صاحب پھنواروی تحصیل پنو عاقل ضلع سکھر کے یہاں کی۔ علوم شرعیہ کے حصول کے بعد آپ علوم باطنیہ حاصل کرنے کے لئے قدوۃ العارفین سید السالکین حضرت حافظ محمد صدیق صاحب بھرچونڈوی کے ہاتھ پر بیعت ہوئے اور مسلسل ریاضت کے بعد نہایت قلیل عرصہ میں خرقۂ خلافت سے نوازے گئے۔ جب آپ روحانی تربیت کے سلسلہ میں بھرچونڈی شریف میں مقیم تھے انھیں دنوں حضرت عبید اللہ صاحب سندھی بھرچونڈی شریف آئے اور حافظ صاحب کے ہاتھ پر مشرف باسلام ہوئے۔ یہیں دونوں حضرات کا ایک دوسرے سے تعارف ہوا اور یہ تعارف آگے چلکر اشاعت اسلام اور احیائے ملت کے لئے بہت مفید ثابت ہوا۔ یہ ۱۸۸۶ء کا واقعہ ہے۔

حصول خلافت کے بعد آپنے اپنے مرشد کے حکم سے امروٹ شریف تحصیل گڑھی یاسین ضلع سکھر کو اپنا مستقل مسکن بنایا اور دعوت الی اللہ و دعوت الی الاصلاح کے لئے۔۔۔ مشغول ہوگئے۔ امروٹ میں آپ کے ابتدائی ایام نہایت صبر آزما تھے۔ کئی کئی اوقات آپ کو فاقے ہوتے اور بعض دفعہ آپ صرف ساگ پات، پر اکتفا کرتے۔ لیکن آپ عزم و عمل کا پیکر بن کر دعوت و عزیمت کے کام میں برابر مصروف رہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ آپ کی طرف عوام کے رجوع میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ اور نہایت قلیل عرصہ میں امروٹ شریف دعوت الی اللہ کا ایک عظیم مرکز بن گیا۔ امروٹ شریف میں عوامی ضروریات کے پیش نظر آپ نے ایک وسیع مسجد کی بنیاد رکھی اور کئی حجرے تعمیر کرائے اس میں آپ دوسرے خدام کے ساتھ مل کر کام کرتے اور کسی قسم کا امتیاز برتنے نہ دیتے جب

مسجد کی تعمیر مکمل ہو گئی۔ آپ نے حفظ قرآن اور ناظرہ کے لئے مسجد کے اندر ہی ایک مدرسہ کھولا جس کے تمام اخراجات کے آپ خود ذمہ دار تھے۔ ۱۳۰۸ھ میں سید العارفین حضرت حافظ محمد صدیق بھرچونڈوی رحمتہ اللہ علیہ کی وفات سے آپ ہمہ وقت مغموم اور متفکر رہنے لگے۔ اس المیہ نے آپ کے اندر شعر و شاعری کو جنم دیا۔ آپ نے اپنی شاعری کا آغاز نعتیہ کلام سے کیا۔ مدح نبی اکرم صلعم پر آپ نے سندھی زبان میں جو اشعار کہے ہیں وہ آج تک عوام میں بے حد مقبول ہیں۔ اپنے بیٹے سید حسن شاہ کی عین نوجوانی کی موت نے آپ کی شاعری میں اور اضافہ کیا۔ آپ نے فارسی کی "یوسف زلیخا" کی طرز پر سندھی زبان میں "پریت ناموں" کے نام سے ایک منظوم کتاب لکھی۔ یہ کتاب عوام وخواص میں بے حد مقبول ہوئی ہے۔ آج تک اس کے کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ آپ نے سورہ یٰسین کا سندھی زبان میں منظوم ترجمہ بھی کیا ہے۔ یہ ترجمہ بھی طبع ہو چکا ہے۔

سنہ ۱۳۰۸ھ میں حضرت مولانا عبید اللہ صاحب سندھی رحمتہ اللہ علیہ دیوبند سے فارغ التحصیل ہو کر سندھ میں واپس آئے آپ کی آمد سے دو دن قبل حضرت حافظ محمد صدیق صاحبؒ بھرچونڈوی اس دار فانی سے رخصت ہو چکے تھے۔ آپ بھرچونڈوی شریف سے ہوتے ہوئے سیدھے امروٹ شریف آئے اور یہیں مستقل سکونت کا ارادہ کیا۔ حضرت مولانا امروٹی رحمتہ اللہ علیہ نے آپ کے ارادہ کو بہت پسند کیا اور رہنے کی تمام سہولیتیں مہیا کر دیں۔ حضرت مولانا امروٹی نے آپ کی شادی کرا دی۔ اور آپ کی والدہ کو پنجاب سے بلوا لیا۔ نیز آپ کے لئے عربی کتابوں کا ایک بہترین ذخیرہ جمع کیا۔ جس میں مصر، استنبول اور قاہرہ کی اہم نادر کتابیں تھیں۔ مولانا عبید اللہ صاحب سندھی مسلسل سات سال تک نہایت سکون و اطمینان سے امروٹ شریف میں قیام

پذیر رہے۔ اس دوران آپ نے ایک دار العلوم کھولا جس میں علوم اسلامیہ عربیہ خصوصاً فلسفہ ولی اللہی کی تعلیم دیتے رہے۔ آپ نے امروٹ شریف میں ایک مطبع بھی قائم کیا۔ جس میں سندھی زبان میں کئی دینی کتابیں چھپیں۔ اسی پریس سے "ہدایۃ الاخوان" نامی سندھی زبان میں ایک دینی ماہنامہ بھی کچھ عرصہ تک شائع ہوتا رہا۔

انہی دنوں حضرت مولانا امروٹی ؒ نے سندھی زبان میں ترجمہ قرآن شروع کیا، جسے کئی سال کی جدوجہد کے بعد آپ نے شائع کرایا۔ اس ترجمہ کے کام میں دیگر مقتدر علماء کے علاوہ حضرت مولانا سندھی سے بھی آپ خصوصی مشورے لیتے رہے۔ یہ ترجمہ آپ کی زندگی میں ہی طبع ہو کر شائع ہوا اور بہت زیادہ مقبول ہوا۔ آپ کی وفات کے بعد یہ ترجمہ حضرت مولانا احمد علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی سرپرستی میں انجمن خدام الدین دروازہ شیرانوالہ لاہور سے شائع ہوتا رہا۔ اور اب بھی یہی انجمن اس کی اشاعت میں مصروف ہے۔

گو حضرت مولانا عبید اللہ صاحب سندھی سات سال کے بعد امروٹ شریف سے پیر جھنڈا سندھ منتقل ہو گئے لیکن امروٹ شریف سے آپ کا رابطہ برابر قائم رہا۔ آپ نے حضرت مولانا شیخ الہند ؒ کو حضرت مولانا امروٹی ؒ سے متعارف کرایا اور حضرت شیخ الہند ؒ دوبار امروٹ شریف تشریف لائے اسی طرح حضرت مولانا امروٹی ؒ بھی دیوبند تشریف لے گئے اور مدرسہ دیوبند کی پچاس سالہ جوبلی کے جشن میں بھی شریک ہوئے۔

۱۳۳۳ھ میں حضرت مولانا شیخ الہند ؒ کے حکم سے جب حضرت مولانا سندھی نے کابل جانے کا ارادہ کیا تو حضرت مولانا امروٹی ؒ نے ان کو وہاں تک پہنچنے میں ہر طرح کی مدد کی۔ کابل جانے کے بعد بھی حضرت مولانا سندھی نے امروٹ شریف سے رابطہ قائم

رکھا۔ چنانچہ آپ نے جو ریشمی خطوط اندرون ہند بھیجے تھے ان میں سے ایک خط حضرت مولانا امروٹی کے نام تھا جو فتح محمد شیخ نامی ایک شخص لایا تھا۔ حکومت کو اس خط کا بروقت علم ہوگیا۔ آپ کو نظر بند کرکے کراچی بلوایا گیا۔ کراچی کے کمشنر نے اس سلسلے میں آپ سے سوال وجواب کئے لیکن کافی ثبوت نہ ملنے پر آپ کو رہا کرنے پر مجبور ہوگیا۔ اس نظر بندی سے آپ کی سیاسی زندگی کا باقاعدہ عملی آغاز ہوا اس کے بعد جتنی بھی عوامی اور دینی تحریکیں اٹھیں آپ نے باقاعدہ ان میں حصہ لیا۔ تحریک خلافت میں آپ سندھ میں سب سے پیش پیش تھے اس تحریک کے دوران امروٹ شریف سندھ کا عظیم سیاسی مرکز بن گیا تحریک سے متعلق تمام امور آپ کے مشوروں سے ہی طے ہوتے تھے اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے آپ نے اپنی پیرانہ سالی کے باوجود سندھ اور بیرون سندھ کئی دورے کئے آپ دیوبند، دہلی، میرٹھ ناگپور اور اجمیر شریف گئے اور کئی جلسوں کی صدارت کی۔ ترک موالات کو کامیاب بنانے کے لئے آپ نے بڑے جوش و خروش سے سندھ کے دورے کئے اور اس مقصد میں آپ کو نمایاں کامیابی بھی ہوئی۔ خلافت عثمانیہ کی بقا کے لئے مسلمانان پاک و ہند نے کابل کی طرف جو احتجاجی ہجرت کی آپ اس کے روح رواں تھے۔ آپ مہاجرین کی اسپیشل ٹرین کے قائد بن کر پشاور تک گئے لیکن یہ اسکیم کامیاب نہ ہوئی اور آپ بادل ناخواستہ وطن آئے

تحریک خلافت کے بعد آپ جمعیۃ العلماء ہند سے منسلک رہے اور تازیست اس جماعت کے ساتھ مل کر کام کرتے رہے۔ احیائے ملت اسلامیہ اور حریت وطن کے علاوہ آپ کو غیر مسلموں میں اشاعت اسلام کا بھی بہت شوق تھا۔ اکیلے آپ نے اس سلسلے میں جو کام کیا وہ آج بڑی بڑی انجمنیں سرانجام نہیں دے سکتیں، آپ نے اپنی زندگی میں کم و بیش پانچ ہزار غیر مسلموں کو دائرہ اسلام میں داخل کیا۔ آپ نے غیر مسلموں میں اشاعت

اسلام کا کام جس طرح شروع کیا وہ نہایت پرکشش اور زود اثر تھا۔ آپ کسی کے سامنے اسلام پر لیکچر نہ دیتے اور نہ دائرہ اسلام میں داخل ہونے کی کسی کو دعوت دیتے۔ اس قسم کی نمائشی تبلیغ سے آپ بچتے۔ آپ ذاتی طور پر غیر مسلموں سے روابط قائم کرتے اور وہ لوگ آپ کے اخلاق حسنہ سے اتنے متاثر ہوتے کہ فوراً اسلام قبول کرنے پر آمادہ ہو جاتے آپ کسی پر اسلام قبول کرنے کے لئے جبر نہ کرتے بلکہ اگر کوئی مسلمان ہونے کے لئے آپ کی خدمت میں آتا تو آپ اسے تلقین کرتے کہ "بیٹا اسلام قبول کرنے میں اتنی جلدی نہ کرو اور سوچ سمجھ کر یہ قدم اٹھاؤ" جب وہ ہر طرح اطمینان کرنے کے بعد اسلام قبول کرنے پر اصرار کرتا تب آپ اس سے باقاعدہ طور پر بیعت لیتے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا کہ باہر کے کچھ ہندو مسلمان ہونے کے لئے امروٹ شریف آتے مقامی ہندوؤں کو اس کا علم ہو جاتا تو وہ وفد بنا کر آپ کی خدمت میں آتے اور عرض کرتے "حضور ان لوگوں نے جذبات میں آ کر یہ فیصلہ کیا ہے آپ موقع دیجئے کہ ہم ان سے علیحدگی میں بات چیت کر لیں۔" آپ ان لوگوں کی درخواست قبول کر لیتے اور مسلمان ہونے والے افراد سے ان کو بات چیت کرنے کی اجازت دیتے۔ وہ لوگ ان کو اپنے گھروں میں لے جاتے۔ مندروں میں جا کر ان کو مسلمان نہ ہونے کی تلقین کرتے۔ لیکن ان کو اسلام قبول کرنے سے باز آنے پر ہرگز آمادہ نہ کر سکتے۔ اس طرح یہ بڑے شوق و ذوق سے دائرہ اسلام میں داخل ہو جاتے لیکن جب آپ کے ہاتھ پر اسلام لانے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا متعصب اور یہ سماج ہندوؤں میں آپ کے خلاف نفرت کا جذبہ شدید ہو گیا اب وہ کھل کر آپ کے مقابلے پر آ گئے۔ ایک بار ایک متمول ہندو گھرانے کا ایک نوجوان لڑکا آپ سے متاثر ہو کر آپ کے ہاتھ پر مسلمان ہو گیا۔ آپ نے اسے اپنے ساتھ رکھا۔ ایک بار آپ اس لڑکے کے ساتھ ایک

دعوت میں شریک ہونے کے لئے باگڑجی ریلوے اسٹیشن پہنچے تو مقامی ہندوؤں کو اس کا علم ہوگیا وہ لوگ راستہ میں جمع ہوگئے اور زبردستی اس لڑکے کو چھین کر اپنے ساتھ لے گئے۔ رات بھر اس کو بند رکھا اور اسلام سے باز آنے کے لئے اسے آمادہ کرنے لگے انہوں نے اس کو ہر طرح دھمکایا اور ہر قسم کے لالچ دیئے لیکن یہ نوجوان کسی طرح بھی ان کی باتوں میں نہ آیا۔ حضرت مولانا امروٹی نے اس معاملہ کی پولیس میں رپورٹ درج کرائی۔ پولیس نے تفتیش کے بعد اس لڑکے کو اپنے قبضہ میں لے لیا اور متعلقہ ہندو لیڈروں کو گرفتار کرکے معاملہ عدالت کے سپرد کردیا۔ کافی عرصہ تک مقدمہ چلتا رہا اس نوجوان نے ہر بار یہ بیان دیئے کہ میں عاقل و بالغ ہوں اور میں نے برضا و رغبت اسلام قبول کیا ہے ہندوؤں نے یہ موقف اختیار کیا کہ یہ لڑکا نابالغ ہے اس کو اپنے والدین کی مرضی کے بغیر مذہب تبدیل کا کوئی اختیار نہیں۔ ہندوؤں نے متحد ہوکر یہ مقدمہ لڑا۔ عدالت نے کافی عرصہ کے بعد آخرکار فیصلہ دیا کہ لڑکا بالغ ہے۔ اس کو اپنا مذہب تبدیل کرنے کا اختیار ہے جس طرف چاہے وہ جاسکتا ہے۔ اس عدالت میں ایک طرف حضرت مولانا امروٹی مع اپنی جماعت کے کھڑے تھے۔ دوسری طرف اس لڑکے کے والدین اعزہ و اقارب اور سینکڑوں ہندو کھڑے تھے۔ اس لڑکے نے جونہی عدالت کا فیصلہ سنا وہ سیدھا مولانا امروٹی کے قدموں میں گر پڑا اور اس کے والدین نے اسے اپنی طرف بہت کھینچا لیکن وہ دگیا۔ یہ لڑکا اب مولوی نورالحق ہیں۔ موصوف ضلع لاڑکانہ کے ایک قصبہ میں مقیم ہیں اور دینی تعلیم و تدریس میں مشغول ہیں۔ ایسا ہی ایک اور واقعہ آپ کے ساتھ پیش آیا۔ ایک ہندو پنڈت کا بیٹا ازخود آپ کے ہاتھ پر مشرف باسلام ہوگیا۔ ہندوؤں نے بڑے جوش و خروش سے آپ کے خلاف عدالتی چارہ جوئی کی لیکن ناکام ہوئے۔ وہ

لڑکا بعد میں شیخ عبداللہ کے نام سے مشہور ہوا۔ جو جماعت امروٹی کے ایک اہم رکن تھے۔

آریہ سماج والے جب آپ کے مقابلے میں ناکام ہوئے تو انھوں نے شدھی کی تحریک شروع کر دی وہ نو مسلم افراد کے پاس جاتے اور ان کو ہر طرح کے لالچ دے کر دوبارہ ہندو مذہب اختیار کرنے پر آمادہ کرتے۔ حضرت مولانا امروٹی نے اس فتنہ کو دبانے کے لئے مثبت قدم اٹھایا۔ آپ نے چند علماء کی ایک جمعیت بنائی جس میں اس وقت کے مشہور علماء حضرت مولانا عبدالکریم صاحب چشتی، حضرت مولانا دین محمد صاحب وفائی، حضرت مولانا محمد ہاشم صاحب قاسمی، حضرت مولانا عبدالکریم صاحب، حضرت مولانا نبی بخش صاحب عودوی اور دیگر مقتدر علماء شامل تھے۔ آپ نے اس آریہ سماجی اقدام کا منظم مقابلہ کیا اور اس فتنہ کو سرزمین سندھ میں سر اٹھانے کا موقع نہ دیا۔

اشاعت اسلام کی طرح حضرت امروٹی میں جہاد کا بھی بڑا شوق تھا۔ آپ ہر وقت اپنے آپ کو جہاد کے لئے مستعد رکھتے۔ آپ فرماتے "کاش کہ میں جہاد میں شریک ہو کر جام شہادت نوش کروں"۔ اس مقصد کے لئے آپ نے چند گھوڑے بھی پال رکھے تھے آپ بذات خود ان گھوڑوں کی ہر طرح خدمت کرتے۔ فرماتے تھے "جہاد کے لئے گھوڑے پالنا سنت ہے اور انکی خدمت کرنا کار ثواب ہے"۔

آپ کی زندگی کے آخری ایام میں سکھر بیراج کی کھدائی ہو رہی تھی۔ نہر وکی کھدائی کی زد میں تین مساجد آ رہی تھیں محکمہ انہار نے طے کیا کہ ان مساجد کو منہدم کر کے راستہ صاف کیا جائے۔ جب آپ کو اس بات کا علم ہوا تو آپ نے تحفظ مساجد کی خاطر اس محکمہ کے خلاف حکومت کو متنبہ کیا کہ اگر ان مساجد کو شہید کر دیا گیا تو مسلمانان سندھ حکومت برطانیہ کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیں گے۔ شروع میں حکومت نے اس

اعلان کو کوئی اہمیت نہ دی اور انہار کی کھدائی کا کام جاری رہا۔ حضرت مولانا امروٹی نے بالآخر جہاد کا اعلان کر دیا اور معہ اپنی جماعت کے سر پر کفن باندھ کر گھروں سے نکل آئے اور ان مساجد کے گرد خیمہ زن ہو گئے۔ تو حکومت فوراً مصالحت پر آمادہ ہو گئی۔ آخر طے ہوا کہ مساجد کو اپنی اصلی حالت پر رہنے دیا جائے اور نہر و نکوان کے گرد کھودا جائے یہ مساجد اب تک ان انہار کے وسط میں قائم ہیں۔

حضرت مولانا امروٹی جس طرح ایک عظیم مبلغ اسلام تھے۔ ویسے ہی بے مثل سیاسی رہنما بھی تھے۔ برطانوی استعمار کے خلاف ان کی جدوجہد زریں حروف میں لکھنے کے قابل ہے۔ حکومت برطانیہ کے لئے آپ کا وجود ناقابل برداشت تھا۔ مشہور ہے کہ حکومت نے خفیہ طریقہ سے آپ کو زہر دلوایا۔ یہ زہر دیر میں اثر کرنے والا تھا اس کی وجہ سے آپ کا جسم آہستہ آہستہ نحیف ہوتا گیا۔ اور آپ کے تمام بدن پر چھالے نکل آئے اور باوجود بہترین علاج کے طبیعت دن بدن کمزور ہوتی گئی۔ آپ فرماتے تھے "مجھے انگریزوں نے زہر دلوایا ہے۔ میں اب زندہ نہیں رہ سکتا"۔ چنانچہ یہ عظیم پیشوا اور بطل حریت سنہ ۱۹۲۹ء کے آخر میں اس دار فانی سے رخصت ہو کر ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ہم سے جدا ہو گیا۔

آپ نے اپنے پیچھے ایک عظیم جماعت چھوڑی۔ یہ جماعت توحید اور اتباع سنت میں اپنی مثال آپ ہے۔ یوں تو جماعت کا ہر فرد اسلام کا بہترین عملی نمونہ ہے لیکن آپ کے خلفاء وقت کے اہم اور نامور لوگوں میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ کے خلفا کی کافی تعداد ہے۔ لیکن حسب ذیل حضرات زیادہ مشہور ہوئے۔

۱۔ حضرت مولانا محمد صالح صاحب بائی شریف۔ ضلع سکھر

۲۔ " " عبدالعزیز " تھر۔ بچائی "

۳۔ حضرت مولانا حماد اللہ صاحب ہالیجی شریف ضلع سکھر
۴۔ " " احمد علی " لاہور

یہ تمام خلفا اپنے وقت کے عظیم دینی و سیاسی رہنما تھے۔ توحید اور سنت کے مبلغ تھے۔ ان حضرات کے آثار ابھی تک منظر عام پر ہیں۔

حضرت مولانا امروٹی کی وفات کے بعد آپ کے بھتیجے حضرت میاں نظام الدین صاحب آپ کی جگہ مسند آرائے خلافت ہوئے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے فرزند ارجمند حضرت مولانا محمد شاہ صاحب امروٹی ان کے جانشین ہوئے جو اشاعت دین متین میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ (الرحیم)

۱۶۔ خان عبد الغفار خاں

آپ اتمان زئی ضلع پشاور کے باشندے ہیں ان کی سیاسی خدمات کا آغاز حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ تعلق قائم ہونے سے ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ حضرت شیخ الہندؒ سے بیعت بھی ہو گئے تھے۔ آپ حضرت شیخ الہندؒ کو اپنے آنے کی خفیہ طور پر اطلاع دیا کرتے تھے۔ اور سی، آئی، ڈی کے خوف کی وجہ سے دیوبند سے پہلے کسی اسٹیشن پر اتر جاتے حضرت شیخ الہندؒ بھی وہاں پہونچ جاتے۔ اس طرح پروگرام طے ہوتا۔ اور عمل میں لایا جاتا تحریک خلافت کے بعد کانگریس میں شریک رہے اور آزادی وطن کے لئے بیش بہا قربانیاں پیش کرتے رہے۔ تقسیم ہند کے بعد سے لیکر اب تک آپ کی عمر کا بیشتر حصہ جیل خانوں میں گزرا ہے۔ آج کل تو آزاد ہیں لیکن صاحب فراش ہیں۔

۱۷۔ ڈاکٹر انصاری

آپ موضع یوسف پور ضلع غازی پور کے رہنے والے ہیں حضرت شیخ الہندؒ سے بیعت تھے۔ آپ کے دو بھائی اور

تھے (حکیم عبدالوہاب صاحب عرف حکیم نابینا دوسرے حکیم عبدالرزاق صاحب) یہ حضرت شیخ الہندؒ کے مشن کے شروع سے ممبر رہے. جب ہندوستان کے سرکردہ لیڈروں کو گرفتار کرلیا گیا تو حضرت شیخ الہندؒ کو انھوں نے اطلاع دی اور فرمایا کہ اب آپ کی گرفتاری بھی یقینی ہے. چنانچہ حضرت شیخ الہندؒ نے مکہ معظمہ کا عزم فرمایا لیکن روپیہ پاس نہیں تھا. تب ڈاکٹر انصاری مرحوم نے روپئے کا بندوبست کیا۔

حضرت شیخ الہندؒ کے تشریف لے جانے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے ایک انجمن "انجمن اعانت نظر بندان اسلام" قائم کی. جس کی ملک میں مختلف شاخیں قائم ہوئیں. اس کی تفصیل ذیل میں پیش کی جارہی ہے۔

صدر دفتر انجمن اعانت نظر بندان اسلام۔ دہلی

صدر۔ راجہ سر محمد علی خاں صاحب آف محمود آباد

جنرل سکریٹریان:۔ ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری اور ڈاکٹر عبدالرحمن صاحب

ممبر صاحبان:۔ حکیم اجمل خاں صاحب اور حکیم عبدالغفار صاحب

صوبہ پنجاب میں:۔ آنریبل میاں فضل حسین صاحب بیرسٹر ایٹ لا، محمد محسن شاہ صاحب، آغا محمد صفدر صاحب،

صوبہ یو.پی مغربی حصہ علیگڑھ:۔ خواجہ عبدالمجید صاحب، تصدق احمد خاں صاحب، اٹاوہ میں غلام پنجتن صاحب۔

مشرقی حصہ الہ آباد:۔ سید رضا علی صاحب وکیل، ظہور احمد صاحب بیرسٹر ایٹ لا۔

" " بنارس:۔ عبدالواحد خاں صاحب وکیل، محمد وسیع صاحب وکیل۔

" " گورکھپور:۔ شاکر علی صاحب بیرسٹر ایٹ لا۔

مشرقی حصہ غازی پور:۔ قمر احمد صاحب

روہیلکھنڈ مراد آباد میں:۔ مولوی محمد یعقوب صاحب وکیل، مسعود الحسن صاحب بیرسٹر ایٹ لا، معظم علی خانصاحب، عبدالسلام صاحب رئیس۔

روہیلکھنڈ بریلی میں:۔ عزیز احمد خاں صاحب وکیل

اودھ لکھنؤ میں:۔ آنریبل سید وزیر علی صاحب، نواب ذوالقدر جنگ بہادر

" بارہ بنکی ":۔ شیخ ولایت علی صاحب وکیل

" فیض آباد ":۔ محمد فائق صاحب وکیل

صوبہ بہار پٹنہ میں:۔ آنریبل مظہر الحق صاحب، ڈاکٹر سید محمود صاحب، سید حسن امام صاحب۔

صوبہ بنگال کلکتہ میں:۔ آنریبل مولوی فضل الحق صاحب، آنریبل مولوی ابوالقاسم صاحب، قاضی عبدالغفار صاحب ایڈیٹر جمہور، مولوی محمد اکرام صاحب ایڈیٹر محمدی۔

صوبہ مدراس میں:۔ آنریبل سیٹھ یعقوب حسن صاحب وکیل

بمبئی میں:۔ مسٹر محمد علی جناح، عمر سبحانی صاحب

سندھ ":۔ آنریبل غلام محمد صاحب بھوگری، انور محمد صاحب وکیل، غلام علی صاحب چاغلا۔

ڈاکٹر انصاری صاحب نے اس انجمن کے مندرجہ ذیل اغراض و مقاصد تحریر فرمائے ہیں۔

۱۔ نظر بندان اسلام کی رہائی کے لئے ہر قسم کی آئینی جد و جہد قائم رکھنا۔

۲۔ ایسی تدابیر عمل میں لانا جن سے جلد نظر بندان اسلام کی رہائی ہو جائے۔

۳۔ انجمن کی شاخیں صدر دفتر کے ماتحت ہر حصہ ملک میں قائم کرنا جو اپنے مفصلات میں باضابطہ اور موثر تحریک جاری رکھیں۔

۴۔ ہر حصہ ملک میں خواہ وہ قصبہ ہو یا قریہ جہاں بھی مسلمان آباد ہوں نظر بندان اسلام کی رہائی کے لئے جلسے کرنا اور مطالبے کے تار حضور وائسرائے بہادر اور وزیر ہند کی خدمت میں بھیجنا۔

۵۔ جلسوں کی پوری کارروائی اخباروں اور صدر دفتر انجمن اعانت نظر بندان اسلام دہلی کو بھیجنا۔

۶۔ جلسوں میں نظر بندان اسلام کی اعانت کے لئے چندہ جمع کرنا اور صدر خزانچی نواب ذوالقدر جنگ بہادر بیرسٹر لا ہیولاک روڈ لکھنؤ کے پاس روانہ کرنا اور اسکی اطلاعات اخبارات اور صدر دفتر دہلی میں بھیجنا۔

۷۔ کافی رقوم کے وصول ہو جانے کے بعد صدر دفتر سے نظر بندان اسلام کی امداد جاری کرنا اور آئینی جدوجہد جاری رکھنے کے لئے اخراجات ادا کرنا۔

۸۔ حضور وائسرائے بہادر کی خدمت میں وفود لے جانا۔

۹۔ اخباروں میں نظر بندان اسلام کے صحیح حالات درج کرنا۔

۱۰۔ نظر بندان کے متعلق میموریل تیار کرانے اور کاونسلوں اور دیگر اکابر ملک کو مطلع کرنا۔

اس انجمن نے ایک اپیل شائع کی تھی جس کے الفاظ یہ ہیں۔

قوم کو اپنے مقاصد اور مطالبہ کی پامالی کا اور توہین کا پورا احساس ہو گیا ہے اور

اب ہماری حالت ہمیں مجبور کر رہی ہے کہ ہم پوری ہمت اور کامل استقلال کے ساتھ اس اپنے اہم قومی فرض کو انجام دیتے رہیں۔ ہم اپیل کرتے ہیں کہ جن برگزیدہ بندوں نے قوم کی بہبود اور فلاح کے لئے گرفتار مصیبت ہو جانا اور نظر بندی کی زندگی بسر کرنا گوارہ کیا اور جنھوں نے قوم اور محض قوم کی خاطر اپنا مال و متاع اور عیش و آرام نثار کر دیا آخر ان کی ضروریات زندگی اور کچھ علائق بھی تو ہیں کیا اس طرف سے غافل رہنا اور اسیران بلا۔ گرفتاران آلام کو ان کی حالت پر چھوڑ دینا اور خود عیش و راحت کی زندگی بسر کرنا ہمارے لئے شرمناک نہیں ہے۔ کیا ان مبتلایان رنج و محن کا اتنا بھی ہم پر فرض نہیں ہے کہ ہم ان کی ذاتی ضروریات کا خیال و لحاظ کریں اگر ہے تو افراد قوم کو اس میں بھی حصہ لینا ایک اخلاقی فرض سمجھنا چاہیئے۔ امید ہے کہ با حمیت افراد قوم اور دردمندان مسلمان اس طرف توجہ دیں گے۔

وماعلینا الا البلاغ۔ خادمان قوم مختار احمد، محمد عبد الرحمٰن

جنرل سکٹریان از صدر دفتر انجمن

اعانت نظر بندان اسلام فتحپوری دہلی جنوری ۱۹۱۸ء

(از شیخ الہند ص ۳ مطبوعہ ۱۹۱۸ء)

بہرحال ڈاکٹر صاحب کی اس جد و جہد سے حکومت غافل نہیں تھی۔ اس نے ان کے اوپر مقدمہ چلایا اور پوچھا تم لوگ حکومت کے باغیوں کی امداد کرتے ہو؟ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا وہ ہمارے مذہبی پیشوا ہیں اگر وہ حکومت کے غدار ہیں تو اس سے ان کی پیشوائیت پر کیا اثر پڑتا ہے۔ ہمارا ان سے ایمانی اور اسلامی رشتہ ہے اس بنا پر

ہم ان کی اعانت کریں گے۔ چونکہ ڈاکٹر صاحب قانون سے واقف تھے اس لئے حکومت نے ان کو بری کر دیا۔

۱۸۔ شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری

اصلی وطن موضع تگری ضلع انبالہ ہے بعد میں موضع رائے پور ضلع سہارنپور میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ بڑے عبادت گزار اور نیک صفت انسان ہوئے ہیں۔ اپنے زمانے کے اولیاء کبار میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ پہلے شاہ عبدالرحیم صاحب سہارنپوری سے بیعت ہوئے ان سے بھی آپ کو سلسلہ قادریہ میں خلافت حاصل ہوئی۔ بعد میں حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی سے بیعت ہو گئے وہاں سے بھی آپ کو اجازت بیعت اور خلافت حاصل ہوئی۔

حضرت رائے پوری بڑے باکمال لوگوں میں سے تھے ایک مرتبہ حضرت مولانا عزیز گل صاحب نے بدن دبانے کی اجازت چاہی آپ نے منع فرمایا لیکن جب انھوں نے اصرار کیا تو اجازت دیدی وہ تھوڑی دیر دبا کر ہٹ گئے کیونکہ بدن اسقدر گرم تھا کہ ہاتھ رکھنا دشوار تھا۔ حالانکہ مولانا بیمار نہیں تھے لیکن سوزش عشق الٰہی اور اس کی تپش سے اندر ہی اندر کشتۂ عشق الٰہی ہو رہے تھے۔

حضرت رائے پوری کو بھی کسی طرح حضرت شیخ الہند کی تحریک جہاد کی اطلاع ہو گئی تو بہت گھبرائے کیونکہ اس تحریک سے دارالعلوم کا وجود خطرے میں تھا۔ جب حضرت شیخ الہند سے تنہائی میں بات چیت ہوئی تو پھر تو تحریک اور صاحب تحریک پر فدا ہو گئے۔ اور نہایت رازداری سے سرگرم عمل رہے۔ جب حضرت شیخ الہند مکہ معظمہ تشریف لے جانے لگے تو اپنی جگہ ہندوستان میں تحریک کا صدر انکو مقرر کر دیا۔

(ج ۱۴۲)

تمام متعلقین کو ہدایت کردی کہ بغیر مولانا کے مشورہ کے کچھ نہ کیا جائے۔

حضرت شیخ الہندؒ کے تشریف لے جانے کے بعد پولیس ان کے پاس بھی تفتیش کے لئے پہونچی مانھوں نے تمام چیزوں کا صاف انکار کر دیا۔ اس پر سی آئی ڈی کے افسر نے کہا مولانا جھوٹ بولتے ہیں۔ حضرت شیخ الہندؒ کے زمانہ اسارت ہی میں انتقال فرماگئے تھے۔ حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری آپ کے اعظم خلفا میں سے تھے۔

۱۹۔ مولانا محمد جلیل صاحب کیرانوی

کیرانہ وطن ہے اسوقت دارالعلوم دیو بند کے درجہ اعلیٰ کے مدرسین میں آپ کا شمار ہوتاہے۔ اس عاجز راقم الحروف نے مولانا موصوف سے مشکوٰۃ شریف پڑھی ہے۔ حضرت شیخ الہندؒ کے خادم خاص تھے۔ صغر سنی ہی سے حضرت کی خدمت دل و جان سے کیا کرتے۔ تحریک کے وقت اگرچہ بچہ تھے۔ لیکن حضرت شیخ الہندؒ کو ان پر بڑا اعتماد تھا۔ اس لئے ان کے سامنے تحریک کی تمام باتیں اور راز بیان کر دیا کرتے تھے اگرچہ تحریک کے باقاعدہ ممبر نہیں تھے۔ مگر بچپن ہی میں کام ممبروں کی طرح کیاہے۔

حضرت شیخ الہندؒ کے مالٹا پہونچ جانے کے بعد گھر کا سب کام یہی کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ جب پولیس تلاشی لینے آئی تو انھوں نے ڈاک کے بہت بڑے ذخیرے کو نہایت حفاظت سے مخفی کر لیا تھا اور اس کو رات کے دو بجے جلادیا تھا پولیس نے ان پر بہت زیادہ سختی کی لیکن انھوں نے کوئی بات بتلا کر نہ دی۔

۲۰۔ حضرت مولانا مدنیؒ

سیدی و مرشدی حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ محتاج تعارف نہیں ہیں ابھی ان کے دیکھنے والے لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد میں موجود ہیں حضرت

شیخ الہندؒ کی تحریک کے اگرچہ آپ باقاعدہ ممبر نہ تھے کیونکہ ان دنوں آپ مدینہ منورہ مقیم تھے۔ حضرت مولانا عزیز گل صاحب نے ایک دفعہ حضرت سے عرض بھی کر دیا تھا کہ ان کو بھی تحریک میں شامل کر لیا جائے لیکن حضرت نے منع فرما دیا تھا اور ارشاد فرمایا تھا کہ وہ عارضی طور سے ہندوستان آئے ہیں ان کو مشوش نہ کرنا چاہیئے لیکن جب حضرت شیخ الہندؒ مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو وہاں پہونچنے کے بعد تحریک کے متعلق تمام باتیں آپ کو بتلا دیں۔ اور تحریک میں شامل کر لیا۔

حضرت اقدسؒ نے قیام مدینہ منورہ میں حضرت شیخ الہندؒ کی بہت خدمات کیں۔ غالب پاشا وغیرہ افسران ترکیہ سے ملاقات کرانے میں بہت کام کیا۔ جب شریف مکہ نے حضرت شیخ الہندؒ کو گرفتار کرا دیا تو آپ نے بھی از خود اپنے آپکو گرفتاری کے لئے پیش کر دیا چنانچہ آپ کی درخواست پر حکومت نے ان کو بھی گرفتار کر کے حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ بھیجدیا۔ آپ بھی مالٹا میں اسیر رہے۔ اور وہاں اپنے شیخ محترم کی قابل فخر خدمات انجام دیں۔ حضرت شیخ الہندؒ کے وصال کے بعد قوم نے جانشین شیخ الہندؒ اور اس کے بعد شیخ الاسلام کے خطابات سے اپنے جذبات محبت کو تسکین دی۔

۲۱۔ مولانا محمد مبین صاحب

آپ دیوبند کے باشندے اور دیوبند کی جامع مسجد اور عیدگاہ کے خطیب تھے۔ مظاہر علوم سہارنپور کے فارغ التحصیل تھے۔ لیکن حضرت شیخ الہندؒ کے مشن اور تحریک کے رکن تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ نے متعدد بار ان کو برہما اور رنگون تحریک کے چندہ کے لئے بھیجا اس کام کو انھوں نے نہایت رازداری سے کیا۔ حکومت نے ان پر بہت زیادہ سختیاں بھی کیں مگر یہ اپنی جگہ پر اٹل رہے۔

۲۲۔ مولانا محمد ابراہیم صاحب

آپ راندیر ضلع سورت کے باشندے ہیں نہایت جوشیلے تھے مگر خاموش رہکر ٹھوس کام کرنے والے تھے۔ متعدد بار بڑی بڑی رقموں کے ساتھ مالی اعانت فرماتے تھے مکہ معظمہ کے قیام میں بھی حضرت شیخ الہندؒ کو ایک کثیر رقم بھیجی تھی۔

۲۳۔ ہندو اراکین

حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ اس تحریک میں کچھ ہندو بھی شریک تھے۔ جن کے قیام کے لئے دیوبند میں ایک کمرہ حضرت نے علیحدہ کرایہ پر لیا تھا وہاں ان سے راتوں کو خفیہ طور پر باتیں ہوا کرتی تھیں۔ حضرت شیخ الاسلام کی تحریر کے مطابق ان لوگوں کے نام معلوم نہ ہوسکے۔

اس میں شک نہیں کہ اس تحریک کا غالب عنصر مسلمان تھے۔ تحریک کی قیادت بھی ان ہی کے ہاتھ میں تھی اس لئے یہ سوال نہیں پیدا ہوتا کہ ان چند افراد کی شرکت سے تحریک سیکولر ہوگئی تھی۔ حضرت شیخ الاسلامؒ ارشاد فرماتے ہیں۔

> جب کوئی تحریک کسی شخص کی طرف منسوب ہوگی تو وہ قبلہ توجہ ہوگا اور اس شخص کے عقائد اور اخلاق کا اکثر ممبروں پر قطعی طور پر ضرور اثر پڑیگا۔[1]

لہٰذا یہ کیسے ممکن ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک میں غیر مسلموں کی شرکت شیخ الہندؒ کے منصوبہ کے خلاف ہوگی۔ اور اسلامی حکومت کے قیام کے منافی ہوگی۔

---

[1] مکتوب از آخری مکتوبات شیخ الاسلام ج ۲۔

کابل میں حکومت موقتہ کا قیام

جن دنوں حضرت شیخ الہندؒ نے اپنی تحریک چلا رکھی تھی (جس کے ذریعہ آپ ہندوستان کے شمالی مغربی گوشہ سے ہندوستان پر حملہ کرنا چاہتے تھے) ان ہی دنوں ہندوستان کے چند دوسرے لیڈر ہندوستان سے باہر پہونچ چکے تھے اور وہ جرمنی اور ترکی سے سازباز کر رہے تھے۔ ہندوستانیوں کا ایک وفد ترکی اور جرمنی گیا تھا اور ایک وفد حضرت شیخ الہندؒ کی قیادت میں مدینہ منورہ پہونچ کر ترکی حکمران سے وثیقے اور معاہدے حاصل کرنے کی فکر میں تھا اور دونوں کا منشا یہی تھا کہ حضرت شیخ الہندؒ نے حاجی ترنگ زئی کے ذریعہ سے یاغستان میں جو تحریک شروع کر رکھی تھی افغانستان اور ترکی حکومت اس کی امداد کرے۔ حضرت مولانا سندھی حضرت شیخ الہندؒ اور دیگر مسلم لیڈران کے نمائندے کی حیثیت سے یہ کام کر رہے تھے۔

جب تک حضرت شیخ الہندؒ ہندوستان میں رہے تو تحریک کی پوری قوت آپ کے ہاتھ میں تھی اور پیغامات اور ہدایات آپ ہی کے ذریعہ سے مجاہدین کو پہونچا کرتے تھے۔ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب نے ارشاد فرمایا ہے۔

> اس وقت میری عمر ۹ سال کی تھی بعد میں مجھے لوگوں سے اس تحریک کے بارے میں معلوم ہوا۔ جو شخص پیغام رسانی کا کام کرتے تھے وہ بہار نپور ہی کے رہنے والے تھے میں نے ان سے بات چیت کی ہے۔ ہوتا یہ تھا کہ وہ صاحب کاغذ کے

پھول بنایا کرتے تھے اور ان پھولوں کو بیچتے ہوئے سرحد پہونچ جاتے تھے۔
ان میں سے جن پھولوں کے ذریعہ پیغام بھیجا جاتا تھا اس کو دوسرے پھولوں
کے ساتھ رکھتے تھے۔ اگر کوئی خریدار اسی پیغام والے پھولوں کو پسند کرتا تو
وہ اس سے کہتے کہ اس میں یہ نقص ہے اس کو نہ لو بلکہ اس سے بہتر پھول دکھلاتے۔
اس طرح حضرت شیخ الہند رح کی ہدایات مجاہدین کے پاس جایا کرتی تھیں۔
بہر حال کابل میں جس حکومت موقتہ کا وجود عمل میں آیا حضرت شیخ الہند اگرچہ
اس کے مشورے میں شریک نہیں تھے لیکن آپ کی حمایت اس کو حاصل تھی۔ اس
حکومت موقتہ کے متعلق ضروری تفصیلات سطور ذیل میں درج ہیں۔
جنگ کے شعلے ہر طرف پھیل رہے تھے۔ اس اثنا میں ہندوستان کے انقلابی
نوجوان خفیہ راستوں سے جرمنی، ترکی، ایران، اور افغانستان پہونچے۔ ان نوجوانوں
میں مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا برکت اللہ، مسٹر محمد علی، راجہ مہندر پرتاپ، صوفی
امبا پرشاد، اللہ نواز خاں ملتانی، مسٹر ہردیال پرشاد، مسز سروجنی نائیڈو کے بھائی
چٹوپادھیائے قابل ذکر تھے۔ راجہ مہندر پرتاپ اور مولانا برکت اللہ برلن میں قیصر ولیم
سے ملے اور ہندوستان کو آزاد کرانے کے سلسلے میں ایک جامع منصوبہ تیار کیا گیا۔
چنانچہ اس منصوبہ پر ہندوستانی انقلاب پسندوں اور جرمن افسروں نے کئی روز تک
غور و خوض کیا اور جب یہ منصوبہ ترمیم و ایزاد کے ساتھ منظور کر لیا گیا تو راجہ مہندر پرتاپ
مولوی برکت اللہ اور دوسرے جرمن افسر برلن سے ترکی پہونچے اور ہندوستانی انقلاب
پسندوں نے غازی انور پاشا اور سلطان ترکی سے طویل ملاقاتیں کیں۔ چنانچہ ایک وفد
ترتیب دیا گیا جس میں راجہ مہندر پرتاپ، مولانا برکت اللہ، ڈاکٹر فان ہٹنگ کیپٹن

بینڈ وینر اور کیپٹن قاسم بے شامل تھے یہ وفد سلطان ترکی، قیصر جرمنی، اور جرمن چانسلر کے خاص خطوط لے کر کابل کی طرف روانہ ہوا۔ خفیہ راستوں سے یہ لوگ ہرات پہنچے ہرات میں افغان گورنر نے اس وفد کا شاہانہ استقبال کیا۔ افغان فوج کے ایک دستے نے ترک کرنیل کی کمان میں ارکان کو گارڈ آف آنرز پیش کیا۔ اس کے بعد وفد نے ہرات کی مساجد اور دوسرے تاریخی مقامات کو دیکھا۔ ہرات میں ایک دو روز قیام کرنے کے بعد یہ وفد افغانی فوجی افسروں کی رہنمائی میں گھوڑوں پر سوار ہو کر ہزارہ کی پہاڑیوں کے دشوار گزار راستوں کو طے کرتا ہوا ۲ اکتوبر ۱۹۱۵ء کو کابل پہنچا۔ کابل میں ارکان وفد کو افغان فوج نے سلامی دی۔ اور وفد کو حکومت افغانستان کی طرف سے بابر باغ کے شاہی مہمان خانے میں ٹھہرایا گیا۔ مہمان خانے میں تمام انتظامات نہایت عمدہ اور آرام دہ تھے

شاہ افغانستان سے ملاقات

ارکان وفد کو جس سرکاری مہمان خانے میں رکھا گیا تھا یہ قیامگاہ قدرتی مناظر کے اعتبار سے نہایت حسین و جمیل تھی۔ مہمان خانے کے سامنے سبز و شاداب ادیلاں تھیں مہمان خانہ کے کمروں کے باہر انگور اور عشق پیچاں کی بیلیں پھیلی ہوئی تھیں۔ ارکان وفد کی خاطر تواضع کے تمام انتظامات موجود تھے۔ لیکن ارکان وفد کو باغ سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔ اور ان کی کڑی نگرانی کی جا رہی تھی۔ علاج و معالجہ کے لئے ایک ترک ڈاکٹر منیر بے مقرر تھے۔ انقلابی وفد کو تمام اطلاعات ڈاکٹر منیر بے کی وساطت سے پہنچتی رہتی تھی۔ دو ماہ تک انقلابی وفد کے ارکان اس مہمان خانے میں ایک نظر بند کی حیثیت سے رہے لیکن دو ماہ کے بعد ایک روز راجہ مہندر پرتاپ کے احتجاج کرنے پر شاہ افغانستان امیر حبیب اللہ خاں سے ارکان وفد کی ملاقات کا انتظام کیا گیا۔ شاہ افغانستان امیر

حبیب اللہ خاں نے اپنے گرمائی محل میں ارکان وفد کو شرف باریابی بخشا۔ ملاقات کے وقت وزیر اعظم افغانستان سردار نصر اللہ خاں ولی عہد شہزادہ عنایت اللہ خاں اور شہزادہ امان اللہ خاں موجود تھے۔ شاہ کے سامنے کی کرسیوں پر راجہ مہندر پرتاپ، ڈاکٹر فان ہنٹنگ، کیپٹن بینڈو نیز، ترک کیپٹن قاظم بے اور مولانا برکت اللہ بیٹھے تھے۔ دوسری طرف مرکزی نشست پر امیر حبیب اللہ خاں ان کے پہلو میں وزیر اعظم افغانستان سردار محمد نصر اللہ خاں اور دوسرے پہلو میں شہزادہ عنایت اللہ خاں، شہزادہ امان اللہ خاں اور سردار محمد عزیز خاں بیٹھے تھے۔ انقلابی وفد کی قیادت راجہ مہندر پرتاپ کر رہے تھے انھوں نے قیصر ولیم اور سلطان ترکی کے مکتوبات گرامی، شاہ افغانستان کی خدمت میں پیش کیے۔ اس کے بعد ڈاکٹر فان ہنٹنگ نے جرمن چانسلر کا خط شاہ کی خدمت میں پیش کیا۔

دوپہر تک بات چیت کا سلسلہ جاری رہا شاہ افغانستان نے انقلابی پارٹی کے منصوبے سے متعلق تفصیلات دریافت کیں اور پوچھا کہ اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کے سلسلے میں جرمنی اور ترکی کی حکومتیں حکومت افغانستان کی کیا مدد کریں گی مولانا برکت اللہ راجہ مہندر پرتاپ، اور ڈاکٹر فان ہنٹنگ کے ترجمان کے فرائض ادا کر رہے تھے گفت و شنید کا سلسلہ صبح کے وقت شروع ہوا تھا اور دوپہر کے کھانے تک جاری رہا۔ کیپٹن فان بینڈو نیز اور کیپٹن قاظم بے فارسی جانتے تھے اس لئے وہ آزادی سے گفت و شنید میں حصہ لیتے رہے دسترخوان پر راجہ مہندر پرتاپ کے لئے ہندوانہ کھانے کا انتظام کیا گیا تھا لیکن راجہ مہندر پرتاپ نے یہ ہندوانہ کھانا کھانے سے انکار کر دیا اور کہا کہ وہ دوسرے ساتھیوں کے ساتھ مل کر کھانا کھائیں گے چنانچہ انھیں بھی شاہی کھانے میں شامل کر لیا گیا۔

افغانستان میں ہندوستانی طلباء

بہت سے آزادی پسند ہندو سکھ اور مسلمان طالب علم اور قومی کارکن ہندوستان سے بھاگ کر افغانستان پہونچ چکے تھے۔ ان میں اجیت سنگھ عبیداللہ سندھی، محمد علی وغیرہ شامل تھے۔ افغان حکومت نے ان سب کو قید کر رکھا تھا۔ انقلابی وفد کو جب اس کی اطلاع ملی تو مولانا برکت اللہ اور راجہ مہندر پرتاپ نے افغان حکومت سے ان نوجوانوں کی رہائی کا مطالبہ کیا۔ راجہ مہندر پرتاپ اور مولانا برکت اللہ کے شہزادہ امان اللہ خاں اور شہزادہ عنایت اللہ خاں ولی عہد سلطنت سے نہایت گہرے تعلقات تھے۔ چنانچہ ان کی کوششوں سے مولانا عبیداللہ سندھی اور دوسرے تمام ہندوستانیوں کو رہا کر دیا گیا۔ یہ سب لوگ انقلابی وفد کی قیام گاہ پر ہی آگئے اور اب بڑی سنجیدگی سے ہندوستان کو آزاد کرانے کیلئے سرگرمیوں کا آغاز کرنے پر غور ہونے لگا۔

شاہ افغانستان سے الگ الگ ملاقاتیں

پہلی ملاقات کے بعد شاہ افغانستان نے انقلابی وفد کے ارکان کو الگ الگ گفت وشنید کے لئے طلب کیا۔ پہلے وزراجہ مہندر پرتاپ اور مولانا برکت اللہ، امیر حبیب اللہ خاں سے ملاقات کرنے کے لئے شاہی محل میں پہونچے۔ شاہ افغانستان اور ہندوستانی لیڈروں کے درمیان گفت وشنید کا سلسلہ تین ساڑھے تین گھنٹے تک جاری رہا۔ اس ملاقات میں بہت سے اہم مسائل پر غور کیا گیا جن میں ہندوستان کی متوازی حکومت قائم کرنے کا سوال بھی شامل تھا۔

دوسرے روز انقلابی وفد کے جرمن ارکان ڈاکٹر فان ہنٹنگ اور فان بینڈوینز نے شاہ سے ملاقات کی۔ اور اس امر کا یقین دلایا کہ افغانستان میں جو متوازی انڈین گورنمنٹ

قائم ہوگی قیصر جرمنی کی حکومت نہ صرف اسے تسلیم کریگی بلکہ اس کی اسلحہ اور سرمایہ کے ذریعے مدد بھی کرے گی۔ اگر ان حالات میں ہندوستان کی برطانوی حکومت کی طرف افغانستان پر کوئی حملہ ہوا تو جرمنی اور ترکی دونوں افغانستان کی مدد کرینگے۔

تیسرے روز ترک نمائندے کیپٹن قاسم بے نے شاہ سے تنہا ملاقات کی یہ ملاقات کئی گھنٹے تک جاری رہی اور اس ملاقات میں تمام مسائل اور ان کے نتائج پر غور و خوض ہوتا رہا۔ چنانچہ ان ملاقاتوں کے بعد حکومت افغانستان کی طرف سے وزیر اعظم افغانستان سردار نصر اللہ خاں نے اپنے معتمد خاص آقائے عبدالرزاق خاں کو وفد کا مشیر اعلےٰ مقرر کر دیا۔ اس کے بعد انقلابی کونسل کے تمام اجلاس آقائے عبدالرزاق خاں کے دولت کدہ پر منعقد ہوئے۔

عبوری حکومت کا قیام

انقلابی کونسل کا آخری ہنگامی اجلاس ۲۹ اکتوبر ۱۹۱۵ء کو آقائے عبدالرزاق خاں کے دولت کدہ پر منعقد ہوا جس میں ہندوستان کی متوازی حکومت قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ حکومت افغانستان کی طرف سے بعض سرکاری عمارات کو اس متوازی حکومت کے دفاتر کے لئے مخصوص کر دیا گیا۔ یکم دسمبر ۱۹۱۵ء کو متوازی حکومت کے قیام کا اعلان کر دیا گیا جس پر راجہ مہندر پرتاپ کے دستخط بحیثیت صدر ثبت تھے۔

مولانا برکت اللہ وزیر اعظم مقرر ہوئے

متوازی حکومت میں راجہ مہندر پرتاپ کو تاحیات صدر منتخب کیا گیا۔ مولانا برکت اللہ کو وزیر اعظم اور مولانا عبید اللہ سندھی کو وزارت داخلہ سونپی گئی۔ کیپٹن قاسم بے کو عارضی طور پر وزیر دفاع مقرر کیا گیا اور بہت سے

ہندوستانی طلبا جو افغانستان میں موجود تھے۔ اس حکومت میں سیکرٹری مقرر ہوئے دو سکھ نوجوان جن پر ہندوستان میں بم کیس چل رہا تھا وہ بھاگ کر کابل پہونچ گئے تھے۔ لیکن حکومت افغانستان نے ان دونوں کو گرفتار کرکے جیل میں بند کردیا تھا متوازی حکومت نے سب سے پہلے انھیں رہا کرایا۔ مسٹر محمد علی کو متوازی حکومت کا سیکرٹری جنرل مقرر کیا گیا۔ یہ وہ محمد علی ہیں جنھیں تھرڈ انٹرنیشنل میں ایک عہدہ تفویض کیا گیا تھا۔ انکے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اس وقت بھی ماسکو میں موجود ہیں۔ تمام خارجہ امور بھی بعد میں انکے سپرد کردیئے گئے۔ محمد علی نے ترکی، ایران، افغانستان اور جرمن حکومت سے استدعا کی کہ متوازی حکومت کو تسلیم کرلیا جائے۔ متوازی حکومت کے صدر راجہ مہندر پرتاپ کے سیکرٹری آقائے اللہ نواز خاں تھے۔ (اللہ نواز خاں ملتان کے رہنے والے تھے بعد میں انھوں نے افغانی شہریت اختیار کرلی اور افغان حکومت میں اہم عہدوں پر فائز رہے۔ وہ مختلف ممالک میں افغانستان کے سفیر رہے۔ وہ امان اللہ خاں اور اس کے بعد نادر خاں کے دور حکومت میں بھی افغانستان کی وزارت میں شامل رہے) اس متوازی حکومت نے ہندوستان کی انقلابی جماعتوں خلافت اور کانگریس کے رہنماؤں سے تعلقات استوار کئے۔ جب اعلیٰ حضرت شاہ امان اللہ خاں نے افغانستان کے تخت و تاج پر قبضہ کرلینے کے بعد جرنیل نادر خاں کی قیادت میں افغان فوجوں کے ذریعہ ٹل کے مقام پر برطانوی فوج کو شکست دے کر افغانستان کی مکمل آزادی کا اعلان کیا۔ برطانوی وظیفہ اور برطانوی حکومت کی سیادت و قیادت تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔ تو ہندوستان کی متوازی حکومت کے وزیر اعظم اس وقت مولانا عبیداللہ سندھی تھے۔ اور جس افغان فوج نے ٹل کے مقام پر انگریزی فوجوں کو شکست دی تھی اس میں بھی ہندوستان کی متوازی انقلابی حکومت

کے ارکان اور انقلابی جوانوں نے شرکت کی۔

امیر چند گپتا اور عزیز ہندی

تحریک خلافت میں جو مسلمان ہجرت کر کے افغانستان پہونچے۔ انمیں امرتسر کے عزیز ہندی، غلام محمد ترک، لاہور کے ایم۔ اے مجید، فضل الٰہی قربان، سلطان احمد علامہ حسین میر کاشمیری، مولانا احمد علی، مولانا خدا بخش، مولانا نثار محمد، شوکت عثمانی، مظفر احمد، ابوالوارث، شمس الہدیٰ، فیروز الدین منصور اور بے شمار دوسرے نوجوان شامل تھے جو بڑے پرجوش تھے۔ ان نوجوانوں نے مولانا عبیداللہ سندھی پر جو متوازی حکومت کے سربراہ تھے۔ زور دیا کہ افغان حکومت پر زور دیں کہ وہ ہندوستانی نوجوانو کو اسلحہ مہیا کرے۔ اور ہندوستان پر حملہ کرنے کی اجازت دے لیکن افغان حکومت نے اس بات کو تسلیم نہ کیا کیونکہ اس طرح افغانستان اور برطانیہ میں دوبارہ جنگ چھڑ جانے کا خطرہ تھا اور افغان حکومت دوبارہ جنگ چھڑ جانے کی پوزیشن میں نہیں تھی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ افغان حکومت کو ہندوستانی مسلمان مہاجروں پر اعتماد نہیں تھا اس کو یہ اطلاعات پہونچ چکی تھیں کہ مہاجروں میں سیکڑوں ایسے ہیں جو انگریز کے جاسوس ہیں اور خان صاحب عبدالعزیز خاں (جو بعد میں پنجاب پولس برانچ کے سپرنٹنڈنٹ مقرر ہوئے) سے ان جاسوسوں کا براہ راست تعلق تھا اور یہ لوگ خان عبدالعزیز خاں کو افغانستان میں انقلابی نوجوانوں کی سرگرمیوں سے باخبر رکھتے تھے۔ چنانچہ حکومت افغانستان کے اس رویہ کی وجہ سے بہت سے مہاجر بددل ہو کر واپس ہندوستان روانہ ہو گئے۔ لیکن متذکرہ بالا نوجوان نے ہندوستان آنے کے بجائے ماسکو کا رخ کیا۔ عزیز ہندی اور صوفی غلام محمد ترک بعض دوسرے مسلمان نوجوانوں کے ساتھ افغانستان

میں ہی رہے ہندوستان کی متوازی حکومت نے سوویت روس کی حکومت سے براہ راست تعلقات قائم کر لئے۔ راجہ مہندر پرتاپ اور دوسرے ارکان ماسکو چلے گئے اور اس طرح ہندوستان کی تحریک ایک نئے موڑ میں داخل ہوگئی۔ ہندوستان کی انقلابی اور سیاسی تحریک کو تقویت پہونچانے کے لئے متوازی حکومت نے کرنل عزیز ہندی اور صوفی غلام محمد ترک کو مقرر کیا کہ وہ ہندوستانی انقلاب پسندوں سے براہ راست تعلق قائم کریں۔ چنانچہ پشاور میں کامریڈ امیر چند گپتا سے تعلقات قائم کئے گئے۔ صوفی غلام محمد ترک متوازی حکومت کی طرف سے پیغامات لے کر پشاور پہونچے۔ اور صوفی ترک کے ذریعہ ہی ہندوستانی انقلاب پسندوں کو مالی امداد پہونچائی جاتی تھی۔ صوفی غلام محمد ترک بھیس بدل کر امرتسر، انبالا اور دہلی تک پہونچے اور ہندوستانی انقلاب پسندونکے جوابی پیغامات لے کر واپس کابل پہونچ جاتے۔ امیر چند گپتا ہندوستان اور افغانستان کے انقلاب پسندوں کے مابین رابطہ افسر کی حیثیت رکھتے تھے۔ افغانستان میں انقلاب آیا۔ شاہ امان اللہ خاں کی حکومت کا تختہ الٹ گیا۔ بچہ سقہ انگریزوں کی سازش سے افغانستان کی حکومت پر قابض ہوگیا۔ بچہ سقہ کے دور حکومت میں جہاں شاہ امان اللہ کے بہت سے حامیوں کو گرفتار کر کے گولی کا نشانہ بنا دیا گیا یا توپ دم کر دیا گیا۔ وہاں بہت سے لوگوں کو جن میں کرنل عزیز ہندی اور صوفی غلام محمد ترک بھی شامل تھے گرفتار کر کے قید کر دیا گیا۔ انقلابی متوازی حکومت کے ارکان کابل سے ماسکو، انقرہ، اور برلن چلے گئے۔ اس طرح متوازی حکومت جس کے صدر راجہ مہندر پرتاپ، وزیر اعظم مولانا برکت اللہ اور وزیر داخلہ مولانا عبید اللہ سندھی تھے۔ اس کا خاتمہ ہوگیا۔

جرنیل نادر خاں نے شاہ ولی اللہ خاں، سردار ہاشم خاں، مارشل شاہ محمود کی معیت

میں جب کابل پر قبضہ کرکے بچہ سقہ کی حکومت کا خاتمہ کیا تو اس وقت کرنل عزیز ہندی صوفی غلام محمد ترک اور بعض دوسرے انقلابی ہندوستانی نوجوان جیل میں تھے۔ جرنیل نادر خاں کے جشن تخت نشینی کی خوشی میں جب بہت سے افغان سیاسی قیدیوں کو جیل سے رہا کیا گیا۔ تو ان کے ساتھ ہی کرنل عزیز ہندی، صوفی غلام محمد ترک کو بھی رہا کیا گیا۔ صوفی غلام محمد ترک تو رہائی کے بعد امرتسر واپس چلے آئے لیکن عزیز ہندی کابل میں ہی رہے۔ وہ ۱۹۳۳ء کے وسط میں کئی سالوں کی جلاوطنی کے بعد امرتسر واپس آئے۔ وطن واپس آنے کے بعد بھی عزیز ہندی کی سیاسی سرگرمیوں میں کوئی فرق نہ آیا وہ مسلمانو کی سربلندی اور برصغیر آزادی کے لئے سرگرمیوں میں مصروف رہے وہ قیام پاکستان کے بعد تک وطن عزیز میں رہے۔ اس اثنا میں برطانی حکومت نے کئی مرتبہ گرفتار کرکے قید اور نظر بند کیا۔ قیام پاکستان کے بعد وہ لیاقت علی خاں مرحوم کے دور وزارت میں کابل تشریف لے گئے۔ لیکن کابل میں آپ کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس وقت سے لے کر اب تک آپ کابل کے جیل خانے میں اسیری کے دن گزار رہے ہیں۔

برصغیر ہند و پاک کی جدوجہد آزادی کا یہ درخشندہ و تابندہ باب ہے جس کا ایک ایک لفظ آزادی کی جدوجہد میں مسلمانوں کی تابندہ و درخشندہ قربانیوں کا آئینہ دار ہے لیکن اس کے باوجود کانگریس نے مسلمانوں کو ہمیشہ رجعت پسند قرار دیا۔ اور آج

- -

رکھا ہے اس پر کانگریسی لیڈروں اور ہندو راہنماؤں کو غور کرنا چاہیئے۔ اس برصغیر کی آزادی کی جدوجہد میں مسلمانوں نے ہندوؤں سے کسی طرح بھی کم قربانیاں نہیں دیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں نے اپنے تناسب آبادی سے چار گناہ زیادہ قربانیاں دیں

وہ اندرون ملک اور ملک سے باہر برصغیر کو انگریز سے آزاد کرانے کے لئے مسلسل جدوجہد کرتے رہے۔ کوئی بھی غیر جانبدار مورخ مسلمانوں کی ان عظیم قربانیوں اور بھارتی . . . .
. . . . کو نظر انداز نہیں کر سکے گا۔ ہندو مورخین تنگ دلی اور تعصب کا مظاہرہ کرتے ہوئے مسلمانوں کو بدنام کرنے کی لاکھ کوشش کریں لیکن تاریخ جدوجہد آزادی ہند کے ان عدیم النظیر کارناموں پر پردہ ڈالنے میں کبھی کامیاب ہو سکیں گے۔

(رٹیان ۱۲ر ستمبر ۱۹۶۴ء)

حضرت شیخ الہندؒ کا تحریک کیلئے سفر

حضرت شیخ الہندؒ نے اپنی تحریک کو نہایت رازداری اور اخفاء سے چلایا بس وہی لوگ واقف تھے جو اس میں شریک تھے لیکن اتنی بڑی تحریک بھلا کب راز رہ سکتی ہے لہٰذا ارباب دارالعلوم کو بھی حضرت کی تحریک کا پورا علم ہوگیا۔ حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری نے ایک مرتبہ حضرت مولانا مدنیؒ سے دریافت کیا تو حضرت مدنیؒ نے اس سے لاعلمی کا اظہار کیا۔ مگر دیوبند آکر حضرت سے دریافت کیا تو حضرت نے فرمایا

> حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ نانوتوی نے دعا فرمائی تھی کہ پچاس برس تک یہ دارالعلوم قائم رہے گا سو بحمداللہ پچاس برس گزر چکے ہیں [1]

اس سے دو باتیں سمجھ میں آتی ہیں اول یہ کہ حضرت شیخ الہندؒ کے پیش نظر جو مقصد تھا وہ دارالعلوم کی بقا اور تحفظ سے بھی اہم تھا اور وہ ظاہر ہے کہ ہندوستان کا آزاد ہونا اور یہاں اسلامی نظام کا قیام ہی ہو سکتا ہے کیونکہ دارالعلوم بھی جس غرض کے لئے قائم ہے وہ اسلامی نظام برپا کرنے کے صرف ایک جزو کو پورا کرتا ہے یعنی علوم اسلامیہ کی نشر و اشاعت جہاں تک حضرت کا معاملہ ہے انھوں نے اپنی تحریک عدیہ ہے کہ ہندوستان سے اپنی روانگی تک کو ارباب اہتمام پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ جس

---

[1] نقش حیات صفحہ ۲۰۳ ج ۲۔

طرح عام لوگوں کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ حضرت شیخ الہندؒ ہندوستان سے ہجرت فرمارہے ہیں اسی طرح ارباب اہتمام کو بھی معلوم تھا۔ اس عام افواہ کی تردید کرتے ہوئے آپ نے دارالعلوم دیوبند کی مشہور درسگاہ نو درہ میں ۲۹ شوال ۱۳۳۳ھ ۱۹۱۵ء کو بعد نماز ظہر تمام طلبا اور مدرسین کو جمع کرکے فرمایا

میرا ارادہ صرف زیارت حرمین شریفین کا ہے یہ بتلادینا تو مشکل ہے کہ کتنی مدت میں واپس ہوں گا مگر انشاء اللہ ضرور اور حتی الوسع جلد واپس ہونگا۔ مدرسہ کا کام خدا تعالیٰ کا کام ہے اس کی امانت سمجھ کر ہر شخص کو کوشش کے ساتھ اس کو انجام دینا چاہیئے۔

اسی طرح حضرت نے اسٹیشن پر ایک شخص کو جواب دیتے ہوئے فرمایا۔

نہیں بھائی ہجرت کا قصد نہیں ہے البتہ اگر خدا تعالیٰ نے توفیق دی تو کسی قدر قیام کا خیال ہے جس کی نسبت ابھی کچھ پوری تعیین نہیں ہو سکتی خدا جانے آئندہ کیا پیش آئے[1]

بہرحال حضرت شیخ الہندؒ کے اغراض سفر سے ارباب دارالعلوم واقف نہیں تھے صرف وہی لوگ جانتے تھے جو تحریک سے متعلق تھے۔

اغراض سفر حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ نقش حیات میں تحریر فرماتے ہیں "حضرت شیخ الہندؒ کے پاس برابر کیفیات جہاد کی خبریں آتی رہتی تھیں۔ ابتدائی کمزوریوں میں کارکنان مرکز (یاغستان) کا پیغام آیا کہ ہم رسد اور کارتوس کے ختم ہو جانے کی وجہ سے سخت مجبور ہیں جب تک ان دونوں کا

---

[1] حیات شیخ الہند ص۔

انتظام نہ ہو ہم کس طرح مقابلہ کر سکتے ہیں ہاں اگر ان دونوں چیزوں کا انتظام ہو جائے تو انگریزی فوج کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے لئے حضرت شیخ الہندؒ نے اولاً مولانا عبید اللہ سندھی کو یاغستان بھیجا اور خود ترکی حکومت سے امداد لینے کی غرض سے ادھر کا قصد کیا اور اپنے اس سفر کو حج کا عنوان دیا۔ لیکن چونکہ انگریزوں کی سی، آئی، ڈی آپ کی بہت سخت نگرانی کر رہی تھی اور آپ کی گرفتاری کا پروگرام بنا چکی تھی۔ جس سے بروقت ڈاکٹر انصاری نے حضرت شیخ الہندؒ کو اطلاع دیدی تھی اور کرایہ کا انتظام کر کے فوراً ہی ہندوستان چھوڑنے کا مشورہ دیا تھا۔ چنانچہ اسی مشورے کے تحت حضرت شیخ الہندؒ نے ہندوستان کو چھوڑنے کا قصد کر لیا اور اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں بعافیت جدہ اور وہاں سے مکہ مکرمہ پہونچ گئے۔[1]

گورنر حجاز سے ملاقات

مکہ معظمہ میں ہندوستان کے ایک بڑے تاجر جناب عبد الجبار رہتے تھے جو حضرت شیخ الہندؒ کے خاص آدمی سمجھے جاتے تھے۔ ان کے توسط سے حضرت نے گورنر مکہ معظمہ غالب پاشا سے ملاقات کی اور اپنی آمد کا منشا اور اپنی تحریک کا حال سنایا۔ اور فرمایا کہ میں انور پاشا اور جمال پاشا سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ غالب پاشا نے حضرت شیخ الہندؒ کے اصرار پر گورنر مدینہ کے نام ایک خط لکھ دیا کہ مولانا محمود حسن صاحب معتمد آدمی ہیں ان کو انور پاشا کے پاس پہونچا دو اسکے علاوہ تحریک کے متعلق کچھ ہدایات کیں کہ آپ ہندوستان میں تحریک آزادی کو خوب زوردار طریقہ پر چلائیں جب انگریزوں سے ہماری صلح کی بات ہوگی تو ہم اور ہمارے حلیف (جرمن، آسٹریا وغیرہ) ہندوستان کی مکمل آزادی

---

[1] نقش حیات ص۲۱۴ ج ۲۔

کو صلح میں پیش کریں گے۔ یہ ہدایتیں اور رقعہ حاصل کر کے آپ نے مدینہ منورہ کا قصد فرمایا اور مولانا مرتضےٰ حسن کو تمام ہدایتیں فرما کر مکہ سے ہندوستان روانہ کر دیا۔ ادھر مولانا مرتضےٰ حسن صاحب کو یہ باتیں ہضم نہ ہو سکیں اور انھوں نے طویل طویل خطوط جدہ سے حضرت کے پاس بھیجنا شروع کر دیئے جو پکڑے گئے جس کے نتیجہ میں حضرت شیخ الہند رح عرب میں بھی ایک مخدوش شخصیت شمار ہونے لگے حقیقت یہ ہے کہ اسی قسم کی اور دوسری باتیں کر کے مولانا مرتضےٰ حسن صاحب نے حضرت شیخ الہند رح کو گرفتار کرایا تھا۔

انور پاشا سے ملاقات

مکہ معظمہ کے کام سے فارغ ہو کر حضرت شیخ الہند رح نے مدینہ منورہ کا قصد فرمایا۔ یہاں پہلے ہی سے آپ کے شاگرد رشید حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی (جو شیخ الحرم مشہور تھے) آپ کے منتظر تھے۔ حضرت شیخ الہند رح کے لئے ان کا گھر گویا اپنا گھر تھا۔ یہاں آکر آپ نے حضرت مدنی اور مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری کو اپنی تحریک کا راز بتلایا اور اپنی تحریک میں شریک کر لیا۔ ادھر مولانا مرتضےٰ حسن صاحب کی دانستہ یا نادانستہ بے احتیاطی کی وجہ سے گورنر مدینہ حضرت شیخ الہند رح کی طرف سے مشکوک ہو گیا تھا جو بعد میں غالب پاشا کے دوسرے خط سے مطمئن ہو گیا۔

اسی زمانہ میں انور پاشا اور جمال پاشا محاذ جنگ کا معائنہ کرتے ہوئے مدینہ منورہ بھی زیارت کی غرض سے تشریف لائے۔ یہاں ان کا بہت بڑا استقبال کیا گیا اور مسجد نبوی میں ایک استقبالیہ جلسہ بھی منعقد کیا گیا جس میں حضرت شیخ الہند رح اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحب اور حضرت مدنی بھی شریک تھے۔

تعریض اور کذب کا مسئلہ

جناب غلام رسول مہر کی حضرت شیخ الاسلام پر تنقید

اسے حسن اتفاق کہوں یا سوئے اتفاق کہ ایک دن جناب غلام رسول مہر کی کتاب "سرگذشت مجاہدین کی چوتھی اور آخری جلد" دیکھنے کا اتفاق ہوا اور ورق کھولتے ہی مندرجہ ذیل سطور سد نظر ہوئیں جن کو بار بار پڑھا اور بالآخر کتاب سے نقل کر لیا، وہ یہ ہیں۔

ایک تعجب انگیز امر مولانا حسین احمد مدنی نے اپنی کتاب اسیر مالٹا میں پورے وثوق اور قطعیت سے فرمایا تھا کہ "حضرت شیخ الہند نے نہ غالب پاشا، انور پاشا، اور جمال پاشا سے ملاقاتیں کیں نہ ان کے لئے ایسا کوئی موقع تھا" لیکن نقش حیات میں ایک ایک شے کا تفصیلاً ذکر فرمایا، ساتھ ہی اس طرز عمل کے جواز کی دو وجہیں پیش کر دیں فرماتے ہیں:۔

۱۔ تعریضی جواب دینا یعنی ایسے کلمات کو جواب میں استعمال کرنا جن کے دو معنی ہوں متکلم ان کے دوسرے معنی لے اور مخاطب کچھ اور سمجھے یہ جھوٹ نہیں ہے اور ایسے موقع پر بلا شبہ جائز ہے[۱]

---

[۱] نقش حیات ص۲۰۴ ج ۲۔

۲۔ عام لوگ سمجھتے ہیں کہ جھوٹ ہر حالت میں برا اور حرام ہے حالانکہ جھوٹ بعض اوقات میں فرض اور واجب ہو جاتا ہے اور بعض اوقات میں مستحب اور بعض اوقات میں مباح اور بعض اوقات میں حرام اور مکروہ ہوتا ہے۔

تعریفی جواب کے لئے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے "لیکن دوسری صورت کے متعلق جب مولانا حسین احمد مدنی جیسے بزرگ جواز کا فتویٰ دیں" تو میرے جیسے فرومایہ علم کے لئے کچھ عرض کرنے کی کیا گنجائش باقی رہ جاتی ہے۔ تاہم صاف صاف کہہ دینا چاہیئے کہ "دل اس پر مطمئن نہیں اور اگر ذاتی تحفظ کے مسئلہ کو اس انداز میں قبول کر لیا جائے جس انداز میں اسے پیش کیا گیا ہے تو پھر مجاہدانہ کارناموں اور ان کے ضمن میں قربانیوں کا معاملہ ختم سمجھنا چاہیئے اور تسلیم کر لینا چاہیئے کہ عزیمت کوئی شئے نہیں جو کچھ ہے رخصت ہی رخصت ہے، نصب العین کے لئے کام ایسے طریق پر کرنا چاہیئے کہ جان کو کوئی گزند نہ پہنچے۔ جان کا اندیشہ ہو تو مقدم شئے جان کا تحفظ ہے۔ خواہ نصب العین کا حشر کچھ ہو۔ جبتک تاریخ کے صفحات سے عزیمت کے تمام واقعات دھونڈ ڈالے جائیں اس مسلک کو دل کیونکر قبول کر سکتا ہے جو مولانا حسین احمد نے پیش فرمایا ہے اگرچہ اس کے لئے دواوین فقہ میں کوئی بنیاد موجود ہو۔"[۲]

جناب غلام رسول مہر نے اس عبارت میں چند باتیں تحریر فرمائی ہیں:۔

(۱) تعریفی جواب کے لئے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں یعنی تعریفی جواب پر اعتراض نہیں ہے۔

۲۔ حضرت شیخ الاسلام نے باوثوق طور پر غالب پاشا، اور انور پاشا، جمال پاشا کی

---

[۱] نقش حیات ص۵۰۰ ج ۲ [۲] سرگذشت مجاہدین ص۵۶۱-۵۶۲

حضرت شیخ الہندؒ کی ملاقات کا انکار کیا ہے اور نقش حیات میں اقرار یعنی جھوٹ بولا ہے اور جھوٹ کے جواز کے لئے دو وجہیں پیش کر دیں۔

۳۔ حضرت شیخ الاسلامؒ کا جھوٹ کے متعلق جواز کا فتویٰ قابل تسلیم نہیں اور دل اس سے مطمئن نہیں۔ اگرچہ اس کی بنیاد دواوین فقہ میں موجود ہیں۔

۴۔ ملاقات مذکورہ کے اقرار یا انکار کا مسئلہ ایک ذاتی تحفظ کا مسئلہ ہے جس میں رخصت کو اختیار کرنا اور عزیمت کو ترک کر دینا، نصب العین کے خلاف ہے بلکہ مجاہدانہ سرگرمیوں میں جان کے تحفظ کا خیال کئے بغیر کام کرتے رہنا چاہیئے۔

۵۔ حضرت شیخ الاسلام کے نظریہ کو اختیار کرنے کی صورت میں تاریخی صفحات سے عزیمت کے تمام واقعات کو دھو دینا چاہیئے۔ (او کما قال)

ان معروضات کے بعد ہم اسیر مالٹا اور نقش حیات کی ان عبارتوں کو پیش کرتے ہیں کہ جنکی وجہ سے جناب غلام رسول مہر صاحب اتنے برافروختہ ہیں۔

اقتباس اسیر مالٹا

حضرت شیخ الاسلام نے جمال پاشا، انور پاشا کی مدینہ منورہ میں آمد اور ان کا جلوس اور پھر مسجد نبوی میں ایک جلسہ کے انعقاد کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے۔

۱۔ شب کو انور پاشا نے ان (مفتی مامون بری شیخ المشائخ مدینہ منورہ) کے پاس حکم بھیجا کہ میں چاہتا ہوں کہ صبح کو اشراق کے بعد علمائے شہر کا مسجد شریف میں اجتماع ہو اور سب اپنی اپنی تقریریں سنائیں چونکہ میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ ہر ایک کے حلقہ درس میں جا کر تقریریں سنوں۔ اس لئے اس ایک مجلس میں مشرف ہونا چاہتا ہوں۔ علی الصبح مفتی صاحب نے کاتب الحروف (حضرت مدنی) سے کہا کہ بہت زیادہ مناسب ہے کہ

دونوں حضرات (حضرت شیخ الہند اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحب) اس مجلس میں تشریف لائیں تاکہ مجھ کو تعارف کرانے کا موقع ہاتھ آئے۔ اور پھر میں مناسبت پا کر صفائی کرادوں گا۔ چنانچہ ہردو حضرات تشریف لائے۔ صف اول میں مفتی صاحب موصوف بیچ میں بیٹھے۔ ان کے بائیں طرف حضرت مولانا مرحوم تھے۔ ان کے بائیں مولانا خلیل احمد صاحب ان کے بائیں کاتب الحروف تھا اور اسی طرح دوسرے علماء تھے۔ مفتی صاحب کے دائیں بھی بہت سے علماء تھے۔ شیخ الحرم صاحب خاص طور سے منتظم تھے۔ انھوں نے ہردو حضرات سے خواہش کی اگر دونوں وزراء میں سے کوئی صاحب آپ سے تقریر کی خواہش کریں تو آپ انکار نہ فرمائیں۔ جبکہ مجمع پورا ہوگیا اور دونوں وزراء تشریف لے آئے تو اولاً انھوں نے مفتی صاحب سے تقریر کی خواہش کی۔ انھوں نے تھوڑی دیر تقریر فرمائی۔ اس کے بعد انور پاشا مرحوم نے مولانا مرحوم سے خواہش کی۔ مگر مولانا مرحوم نے انکار فرمایا۔ پھر انھوں نے مولانا خلیل احمد صاحب سے درخواست کی مگر دونوں حضرات نے یہ عذر پیش کیا کہ ہماری آواز نہایت کمزور ہے ہم تقریر نہیں کر سکتے۔ اس کے بعد کاتب الحروف کی طرف اشارہ ہوا۔ میں نے حسب لیاقت ایک عرصہ تک عربی میں تقریر کی۔ اس کے بعد دوسرے علماء نے تقریریں کیں۔ اختتام جلسہ پر مفتی صاحب اور شیخ الحرم نے اسی جلسہ میں مولانا مرحوم اور مولانا خلیل احمد صاحب کا تعارف کرایا۔ آپس میں مصافحہ ہوا اور مزاج پرسی کی نوبت آئی۔" اس سے زیادہ نہ وہاں موقع تھا اور نہ وقت تھا۔ مجمع بہت ہی زیادہ تھا۔ ہردو وزراء اسی وقت اٹھے اور اپنی قیام گاہ پر چلے گئے اور کھانا کھا کر ظہر کی نماز ادا کرتے ہوئے مدینہ منورہ سے روانہ ہوگئے۔

۲۔ مگر اس تعارف کی وجہ سے مفتی صاحب اور دوسرے احباب کو موقع مل گیا کہ

انھوں نے کھانا کھاتے وقت یا اور کسی وقت یہ عرض کر دیا کہ پولیس ایسے مقدس اشخاص کی نسبت ایذارسانی کا قصد رکھتی ہے۔ مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ چونکہ مسلمانوں کا مرکز ہے یہاں پر ہر ملک کے لوگ مذہبی حیثیت سے آتے رہتے ہیں۔ ان پر شبہ کرنا کسی طرح مناسب نہیں، چنانچہ شام پہونچ کر جمال پاشا نے ایک خاص حکم بھیجا کہ حرمین شریفین میں دول متحاربہ کی رعایا کے ساتھ وہی معاملہ کیا جائے جو ہماری رعایا کے ساتھ کیا جاتا ہے اس حکم کے آنے کے بعد پولیس کی تمام کارروائیاں بیکار ہوگئیں اور اس کے ہاتھ پیر ٹوٹ گئے۔ الخ

حضرت شیخ الاسلام نے اس ملاقات پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

۳۔ یہی وہ ملاقات ہے جس کی نسبت اصحاب اغراض نے گورنمنٹ کے کانوں تک یہ خبر پہونچائی کہ مولانا انور پاشا اور جمال پاشا سے ملے اور دیر تک تخلیہ میں گفتگو کرتے رہے اور ان سے عہدنامے اور وثائق حاصل کئے مگر افسوس کہ ایسی دروغ گوئی اور افترا پردازی پر کیونکر جرارت کی گئی۔ دونوں وزیروں کی مدینہ منورہ میں مدت اقامت کل ۲۴ گھنٹے کے قریب تھی جن میں ہزاروں آدمیوں کا اجتماع ہر وقت تھا ان کو بات کرنے کی فرصت نہ تھی۔ شہر کے بڑے بڑے عمائد تو ان کے پاس پھٹک نہیں سکتے تھے۔ پردیسی اور وہ بھی مولانا مرحوم جیسے زاہد اہل دنیا سے نفرت کرنیوالے کہاں وہاں تک پہونچ سکتے تھے؟ اور پھر وثائق اور عہدناموں کا لکھنا اور مقرر کرنا اور شروط کا لحاظ کرنا کیسے ہو سکتا تھا الخ۔[۲]

۴۔ مولانا کا ملنا غالب پاشا سے یا تو قبل از حج ممکن تھا یا بعد از حج مگر چونکہ تمام عالم کو معلوم ہے کہ غالب پاشا طائف میں رہتا تھا خصوصاً ایام گرما میں اسلئے اس سے

---

[۱] اسیر مالٹا ص۲۳ مطبوعہ مدینہ پریس [۲] ایضاً ص۲۴ ایضاً

ملاقات قبل از حج مکہ میں ممکن نہ تھی۔ غالب پاشا اس سال بھی طائف سے سیدھے روانہ ہوکر عرفات میں آکر شریک ہوا تھا اور مولانا مرحوم بھی حج سے پہلے مکہ معظمہ سے باہر کہیں تشریف نہیں لے گئے تھے۔ البتہ حج کے بعد وہ مکہ معظمہ آیا مگر چونکہ محمل شامی میں آیا ہوا تھا اور اسکے مہتمم وزیر جنگ انور پاشا کے والد ماجد تھے اس لئے گورنر موصوف کو اپنے رسمی کاروبار سے اتنی مہلت نہ تھی کہ کسی سے بات تک کر سکتے۔ تمام محمل کے انتظامات خزانہ کی افکار، انور پاشا کے والد ماجد کی تکریمات، حج کے انتظامات، شہر کی کارروائیاں اور دور و دراز سے آنے والے ترکی افسروں سے ملاقات وغیرہ وغیرہ اس قدر کاروبار تھے جن کی بنا پر اس کو اتنی مہلت کہاں تھی کہ مولانا سے ابتدائی ملاقات اور ربط و ضبط کی نوبت آئے اور پھر وہ روابط اس درجہ کے قابل اعتماد ہو جائیں کہ شاہی عہدنامے اور وثائق کے تنظیم و تسطیر کی نوبت آئے ایسے معاملات میں تو مہینے گزر جاتے ہیں ادھر مولانا کو افکار سفر مدینہ منورہ اور اس کے انتظامات مختلف طبقات کے ہندوستانی حجاج کی ہر وقت آمد و رفت جن کا ہجوم ہر وقت مولانا کے پاس رہتا تھا، شوق ادائے عبادات در حرم محترم جو کہ مدتہائے دراز کے بعد نصیب ہوا تھا کہاں ایسی باتوں کی مہلت لینے دیتے تھے پھر اس پر طرہ یہ کہ غالب پاشا محمل کے روانہ ہوتے ہی طائف کو لوٹ گیا نہ وہ ترکی زبان کے سوا اردو فارسی وغیرہ جانتا تھا۔ عربی کے دو چار ضروری الفاظ کے علاوہ گفت و شنید سے بھی واقف نہ تھا۔ نہ مولانا کو ترکی زبان سے واقفیت مولانا کے لئے وہاں کوئی ایسا وسیلہ بھی نہ تھا جس کی وجہ سے ایسے بڑے حکام کے یہاں رسائی ہوتی الخ۔[1]

---

[1] اسیر مالٹا صفحہ ۱۴۱، مطبوعہ مدینہ پریس۔

یہ اقتباسات ہیں جن کے بل بوتے پر جناب غلام رسول صاحب نے نہایت شد و مد کے ساتھ تحریر فرمایا ہے۔

مولانا حسین احمد نے اپنی کتاب "اسیر مالٹا" میں پورے وثوق اور قطعیت سے فرمایا تھا کہ حضرت شیخ الہند نے نہ غالب پاشا اور انور پاشا و جمال پاشا سے ملاقاتیں کیں اور نہ ان کے لئے ایسا کوئی موقع تھا۔ پھر نقش حیات میں ایک ایک کا تفصیلاً ذکر فرمایا ہے۔ الخ

نقش حیات کا اقتباس

۱۔ نقش حیات ج ۲ صفحہ ۲۱۴ پر حضرت شیخ الاسلام نے تقریباً ڈھائی صفحہ پر حضرت شیخ الہندؒ کی غالب پاشا سے ملاقات اور ان سے ایک خط بنام گورنر مدینہ کا ذکر کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے۔

اگلے دن حضرت ملاقات کے لئے تشریف لے گئے تو بہت زیادہ اعزاز کیا اور نہایت تپاک سے ملے اور جو کچھ حضرت نے کہا اس کو قبول کیا دیر تک تحریک اور مشن آزادی سے متعلق باتیں ہوتی رہیں پھر حضرت نے فرمایا میں انور پاشا سے ملنا چاہتا ہوں انھوں نے فرمایا ان سے ملنے کی کوئی ضرورت آپ کو نہیں۔ جو کچھ میں کہتا ہوں وہ انور پاشا ہی کا کہنا ہے مگر حضرت نے انور پاشا سے ملنے پر اصرار کیا تو انھوں نے ایک تحریر ہندوستانی مسلمانوں کے لئے اپنی طرف سے بحیثیت گورنر حجاز لکھ کر دی اور ایک تحریر گورنر مدینہ بصری پاشا کو لکھی۔ الخ

۲۔ جس وقت انور پاشا اور جمال پاشا کا مدینہ منورہ میں جلوس نکلا ہے اسکا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں

چنانچہ میں قطار چیر کر انور پاشا کے پاس پہونچا اور اس عرضی کو (جس میں حضرت شیخ الہند نے تنہائی میں ملاقات کی استدعا کی تھی) پیش کر دی الخ میں جب عرضی دیکر واپس آیا تو بعد میں معلوم ہوا کہ عرضی پر غور کیا گیا اور دونوں مذکورہ بالا معززین کی سعی سے مغرب کے بعد کا وقت تنہائی میں ملاقات کا دیا گیا۔ چنانچہ حضرت شیخ الہند رح اور مولانا خلیل احمد صاحب موقعہ ملاقات پر پہونچے ایک تنہا اور بند کمرہ میں ملاقات ہوئی۔[۱]

اس کے بعد ص۲۲ پر اسی جلسۂ مسجد نبوی کا ذکر فرمایا ہے جو اگلے دن بعد اشراق کے ہوا تھا جس میں حضرت شیخ الہند اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحب اور دوسرے علماء و مشائخ تھے گویا کہ ملاقات کا وقت انور پاشا کی آمد والے دن کا بعد مغرب ہے اور جلسہ کا وقت اگلا دن بعد اشراق ہے۔[۲]

مذکورہ عبارتوں میں تعریض ہے یا کذب

نقل عبارات کے بعد یہ دیکھنا ہے

کہ حضرت مدنی رح کی عبارت میں بقول جناب غلام رسول صاحب مہر انکار اور دروغ گوئی ہے جیسا کہ موصوف نے اپنی کتاب کے مذکورہ اقتباس ۱ میں فرمایا ہے

ہمیں افسوس ہے کہ جناب غلام رسول صاحب مہر جو ہندوستان اور پاکستان کے مشہور عالم، مورخ، نقاد، تذکرہ نویس، صاحب کلام، صاحب تصانیف ہیں ان کی لغزش قلم پر گرفت کی جا رہی ہے۔ امید ہے کہ ہمیں معاف رکھا جائے گا کیونکہ موصوف نے اپنی تاریخی کتاب میں مسلمانوں کی تاریخ کو بری طرح مجروح کر دیا ہے اور جد و جہد آزادی کی داستان میں (جس کے طفیل میں موصوف خود اور موصوف کے رہنما اور

---

[۱] نقش حیات ص۲۱۹ ج۲ [۲] تفصیل کیلئے ملاحظہ فرمایئے نقش حیات ص۲۲ ج ۲۔

حکام ایک مملکت خداداد کے وارث ہوئے) جو مجاہدین کے خون سے نوشتہ ہے اور جو آب زر سے لکھنے کے قابل ہے ایک سیاہ دھبہ ڈالدیا ہے۔

میری ان معروضات اور ان کی اہمیت کو وہی خوب سمجھ سکتے ہیں جنکو اس تحریک یا اور کسی قومی تحریک (جس میں جان و مال کی بازی لگانی پڑتی ہے) میں عملاً حصہ لینا پڑا ہے ورنہ ؎

کوئی سمجھے گا کیا راز گلشن
جب تک الجھے نہ کانٹوں سے دامن

تاریخی واقعات کا تجزیہ، ان پر تنقید، اور ان سے نتائج کا اخذ، استنباط بہت سہل ہے لیکن تاریخ سازی اور اس کے بدلنے میں جدوجہد نہایت دشوار راستہ ہے ان دشواریوں کو عملاً حصہ لینے والے ہی جانتے ہیں۔

رموز مملکت خویش خسرواں دانند

بہرحال اب عرض ہے۔

ا۔ تعریفی جواب کو جناب غلام رسول صاحب مہر نے تسلیم کیا ہے اور اسیر مالٹا کی تمام عبارتیں تعریفی ہیں کیونکہ

ا۔ اقتباس ۱ میں جلسہ مسجد نبوی کا ذکر فرماتے ہوئے تحریر فرمایا ہے" اس سے زیادہ نہ وہاں موقع تھا اور نہ وقت الخ"

گویا کہ مسجد نبوی کے جلسہ کی ملاقات جس قدر اور جس تفصیل سے ہو چکی ہے اس کے علاوہ اس سے زیادہ ملاقات کی اسوقت اس جگہ گنجائش نہ تھی۔

ب۔ لفظ" اس سے" اشارہ قریب ہے جس سے پورے قیام مدینہ منورہ کی

ملاقات سے انکار نہیں ہے بلکہ اس جلسہ اور اسکی ملاقات کی طرف اشارہ ہے اب جناب غلام رسول مہر کی طرف بھی توجہ فرمایئے۔

حضرت شیخ الہندؒ نے نہ غالب پاشا اور نہ انور پاشا، وجمال پاشا سے ملاقاتیں کیں اور نہ ان کے لئے ایسا کوئی موقع تھا۔ الخ

یعنی مہر صاحب نے نفی استغراقی فرمائی ہے جو حضرت شیخ الاسلام کی پوری کتاب میں کہیں نہیں ملتی۔ عجیب کلام فہمی ہے۔

ص۔ اقتباس ۲ میں مفتی صاحب کا مقولہ ذکر کیا ہے اور انکی سفارش بھی ذکر کی ہے۔ حضرت شیخ الہندؒ کی ملاقات کی نفی نہیں ہے جو روز اول بعد مغرب ہو چکی تھی۔

ج۔ اقتباس ۳ میں تمام قرینے ایسے ذکر کر دیئے ہیں جن سے ظاہر ہو رہا ہے کہ مسجد نبوی کی ملاقات کے علاوہ دوسری ملاقات ممکن نہ تھی۔ لیکن باوجود ان دشواریوں کے ملاقات ہوئی اور وثیقہ لکھا گیا ہے جس سے انکار نہیں سکوت ہے۔ اگرچہ ظاہر کلام سے انکار ہی معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقتاً صراحۃً کسی لفظ سے انکار ثابت نہیں ہے، اور یہی تعریضی کلام ہے۔

د۔ اقتباس ۴ میں وہ تمام قرائن موجود ہیں جن سے غالب پاشا سے عدم ملاقات تو ظاہر ہے لیکن صراحۃً انکار نہیں ہے اسی کا نام تعریض ہے نہ کہ کذب۔

ط۔ باوجود ان دشواریوں کے غالب پاشا سے ملاقات ہوئی جس سے انکار کسی لفظ سے ثابت نہیں ہو سکتا۔ فمن شاء فعلیہ البیان۔ لہٰذا ان تمام عبارات کی روشنی میں جناب غلام رسول مہر ہی اپنی عبارت

"مولانا حسین احمد نے اپنی کتاب "اسیر مالٹا" میں پورے وثوق اور قطعیت

سے فرمایا ہے الخ۔"

کا خوب تجزیہ کر سکتے ہیں۔ اگر غلام رسول مہر صاحب نے حضرت مدنیؒ کی مذکورہ عبارتوں سے مثوق اور قطعیت کو ثابت کر دیا تو ہم اعلانیہ اسی سے رجوع کریں گے۔ اگر ایسا ہو گیا تو جناب غلام رسول مہر کو مجاہدانہ کارناموں کو تاریخ کے صفحات سے دھونا نہیں پڑیگا اور انکا کام مولانا مدنیؒ کیخلاف پروپیگنڈے کا بہت سہل ہو جائیگا۔

ذاتی تحفظ کا مسئلہ

ذاتی تحفظ کا مسئلہ جس کی اہمیت جناب غلام رسول صاحب مہر کے نزدیک کچھ نہیں ہے کے متعلق بھی عرض کرتا ہے اور یہ دیکھنا ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ کی انور پاشا وغیرہ سے ملاقات اور اس سے انکار آیا ذاتی تحفظ کا مسئلہ ہے؟ یا پوری تحریک کی حفاظت اور ہزاروں بندگان خدا کی جانوں کی حفاظت کا مسئلہ ہے۔

تاریخ آزادیٔ ہند کے قاری جانتے ہیں کہ استخلاص وطن کی پہلی تحریک حضرت مولانا سید احمد شہیدؒ نے شروع کی جو بالاکوٹ کے معرکہ میں بظاہر ناکام ہو گئی۔ لیکن اس تحریک اور جہاد کا ایک رکن جناب میانجی نور محمد جھنجھانویؒ بچ رہا جس نے ظاہراً لوہاری ضلع مظفر نگر میں ایک مکتب کی بنیاد ڈالی اور پیری مریدی کے طریق پر حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی، حافظ ضامن شہید وغیرہ کو تیار کیا۔ ہر دو حضرات تھانہ بھون کے رہنے والے ہیں اور ایک عرصہ تک قصبہ تھانہ بھون میں اپنی آزاد علاقائی حکومت قائم کر چکے تھے جو شاملی کے میدان میں ناکام سی ہو گئی اور اس تحریک کا ایک برا رکن جناب حافظ ضامن صاحب شہید ہو گئے۔

ان ہر دو حضرات نے اپنے دو جانباز سپاہیوں یعنی حضرت مولانا رشید احمد

صاحب گنگوہی اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کو تیار کر لیا تھا اور ان دونوں حضرات کو ہندوستان چھوڑ کر جناب حاجی صاحب مکہ معظمہ پہونچ گئے تھے۔

یہ دونوں صاحب بھی تحریک آزادی ۱۸۵۷ء میں شریک تھے اور گورنمنٹ کا مقابلہ کر چکے تھے۔ جہاں ان کے اور دوسرے ساتھیوں کو پھانسی کی سزا دی جا چکی تھی۔ ان کیلئے بھی یہی حکم تھا چنانچہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رح کو گرفتار کر لیا گیا۔ اور مولانا محمد قاسم صاحب کا وارنٹ گرفتاری جاری تھا لیکن ہر دو حضرات کو اللہ تعالیٰ نے بچا لیا اور جو کام اس کو لینا تھا لیا۔

ہر دو حضرات نے دار العلوم دیوبند کی بنیاد ڈالی۔ بظاہر تعلیم و تعلم کا سلسلہ جاری رکھا لیکن بباطن حکومت کے خلاف مجاہد تیار کئے اور جمعیۃ الانصار جماعت بنائی اور تحریک خلافت کو فروغ دیا یہیں سے جناب مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا محمد میاں صاحب انصاری، مولانا مدنی، مولانا عزیر گل، مولانا حکیم نصرت حسین اور انکے کمانڈر حضرت شیخ الہند رح پیدا ہوئے جنہوں نے تحریک ریشمی خطوط میں حصہ لیا۔

اس تحریک میں حصہ لینے والے حضرات میں ڈاکٹر انصاری، مولانا ابوالکلام آزاد راجہ مہندر پرتاپ، شاہ عبد الرحیم صاحب رائے پوری، حضرت مولانا خلیل احمد صاحب مولانا ہادی حسن وغیرہ حضرات تھے۔ ان سب حضرات نے ایک عارضی حکومت کی تشکیل دی جس کے صدر راجہ مہندر پرتاپ وغیرہ تھے لیکن یہ حکومت گورنمنٹ کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے و نیز اس کی اپنی اسکیم کی وجہ سے جلاوطن ہو گئی۔ اس طرح تاریخ عالم میں یہ پہلی جلاوطن حکومت تھی۔ اس جلاوطن حکومت کی طرف سے موصول ہونیوالی خفیہ تجاویز کے مطابق یہاں کام کرتے تھے۔

اس اجمال کو ملاحظہ فرمانے کے بعد ہم ہر صاحب انصاف سے درخواست کرینگے اور خصوصاً جناب غلام رسول مہر سے عاجزانہ طور پر عرض کریں گے کہ اگر اس تحریک اور مشن آزادی کے کسی ممبر نے بالفرض اگر کبھی جھوٹا بیان بھی دیدیا ہو (لیکن ہمیں تعریفی بیان کے علاوہ کچھ نہیں ملا) تو کیا اسکو ذاتی تحفظ کا مسئلہ قرار دیا جائے گا۔

ہمارے اس سوال کے جواب میں یہی کہا جائے گا کہ یہ ذاتی تحفظ کا مسئلہ نہیں بلکہ ایک جماعت اور ایک ملک اور اس کے ہزاروں باشندوں اور سیکڑوں خاندانوں کی حفاظت کا مسئلہ ہے جس میں اگر کہیں بالفرض دروغ گوئی سے کام لیا بھی گیا ہو تو وہ شرعاً جائز ہے بلکہ مستحسن ہے۔ افسوس کہ جناب غلام رسول مہر نے اس کو ذاتی تحفظ کا مسئلہ بنا دیا جو ان کے بنانے سے نہیں بن سکتا۔ ذاتی تحفظ کا مسئلہ تو ہمارے سامنے پاکستان میں فوجی حکومت کے قائم ہونے کا زمانہ ہے۔ اس وقت ہم نے اچھے اچھوں کی عزیمت کو اخباروں میں پڑھا ہے۔

نقش حیات کا دوسرا اقتباس

جناب غلام رسول صاحب نے جو مندرجہ بالا عبارت میں فرمایا ہے کہ

"مولانا حسین احمد صاحب نے اس طرز عمل کے جواز کی دو وجہیں پیش کر دیں" اور "دل اس مسلک کو قبول کرنے کو نہیں چاہتا" اگرچہ اس کی بنیادیں دواوین فقہ میں موجود ہیں" وغیرہ ذلک یا بالفاظ دیگر حضرت مدنی رح نے اپنے جھوٹ (نعوذ باللہ منہا) کے جواز کی دو وجہ پیش کر دیں اور اس پر جواز کا فتویٰ صادر فرما دیا اور اس فتوے کی بنیاد صرف دواوین فقہ پر ہے لہٰذا گذارش ہے کہ

۱۔ جس کلام کو جناب غلام رسول مہر نے جھوٹ یا کذاب قرار دیا ہے۔ وہ کذب

نہیں بلکہ ان کے تسلیم شدہ الفاظ میں تعریض ہے۔

۲۔ حضرت شیخ الاسلام رحمہ اللہ نے نقش حیات میں بر سبیل تذکرہ جو مسئلہ بیان فرمایا ہے وہ ان کا فتویٰ نہیں اور نہ اس کی بنیاد صرف دواوین فقہ پر ہے بلکہ وہ آئمہ مجتہدین کا ایک متفق علیہ مسئلہ ہے اور اس کی بنیاد احادیث رسول پر ہے۔ اگر اسکے قبول کرنے سے جناب غلام رسول صاحب مہر کو انکار ہے تو استغفر اللہ علیٰ ذلک۔

اب نقش حیات کا اقتباس ملاحظہ فرمایئے۔

ا۔ مگر افسوس کہ ہمارے مالٹا میں اسیر ہونے کے کچھ عرصہ بعد ہی مولانا رائے پوری مریض ہو گئے اور عرصہ تک بستر مرض پر ناچارگی اور ضعف میں مبتلا رہے اور ایام دار و گیر میں سی، آئی، ڈی کا افسران کے پاس بھی تفتیش و استنطاق کے لئے گیا۔ مولانا مرحوم (حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری) نے تمام الزامات کی تردید کر دی اور بعض میں لاعلمی کا اظہار فرمایا جس پر وہ ناکام واپس آیا اور کہنے لگا مولانا جھوٹ بولتے ہیں۔[1]

ب۔ ممکن ہے بعض ناظرین کو خلجان ہو کہ اس جگہ (حضرت رائے پوری نے تفتیش کے وقت) اقرار نہ کرنا یا لاعلمی کا اظہار کرنا کس طرح جائز ہو سکتا ہے یہ تو کذب اور جھوٹ ہے جو کہ حرام ہے تو اس میں عرض یہ ہے کہ توریہ یعنی جواب دینا یعنی ایسے کلمات کو جواب میں استعمال کرنا جن کے دو معنی ہوں متکلم ان کے دوسرے معنی لے اور مخاطب کچھ اور سمجھے یہ جھوٹ نہیں ہے، اور ایسے موقعہ پر بلاشبہ جائز ہے۔

ج۔ عام لوگ سمجھتے ہیں (جیسا کہ سرگزشت مجاہدین میں سمجھ لیا گیا ہے کہ جھوٹ ہر حالت میں برا اور حرام ہے حالانکہ جھوٹ بعض اوقات فرض اور واجب ہوتا ہے اور بعض

---

[1] نقش حیات صفحہ ۲۱۲ ج ۲۔

اوقات مستحب اور بعض اوقات مباح اور بعض اوقات میں حرام اور مکروہ[1]۔ الخ

مسئلہ کذب اب یہ دیکھنا ہے کہ :۔

ا۔ کذب کے متعلق مذکورہ فتویٰ صرف حضرت مدنی رح ہی کا ہے یا اور کسی کا بھی۔ اگر یہ فتویٰ صرف موصوف ہی کا ہے تو وہ قابل مواخذہ ہیں۔

ب۔ اس فتوے کی بنیاد دواوین فقہ ہی پر موقوف ہے یا حدیث وغیرہ سے بھی ثابت ہے۔

لیس الکذاب الذی یصلح	یعنی جو شخص جھوٹ بول کر لوگوں میں
بین الناس۔ الحدیث	صلح کرادے وہ جھوٹا نہیں ہے۔

یہ حدیث صحیح ہے اور اسی جگہ لکھی ہے جہاں سے جناب غلام رسول صاحب نے نقش حیات کی عبارت نقل کی ہے۔

کل الکذب یکتب علی ابن	ابن آدم کے تمام جھوٹ مکتوب ہوتے
آدم الا ثلاث خصال رجل	ہیں مگر تین چیزوں میں نہیں ۱۔ وہ آدمی
کذب لامرأته لیرضیها او	جس نے اپنی ناراض بیوی کے خوش کرنے
رجل کذب فی خدیعة حرب	کیلئے بولا ۲۔ وہ آدمی جس نے حرب میں
او رجل کذب بین امرأین	دھوکا دینے کے لئے بولا ۳۔ وہ آدمی جس
مسلمین لیصلح بینهما الحدیث	نے دو مسلمانوں میں صلح کرانیکے لئے جھوٹ بولا۔

یہ حدیث صحاح ستہ میں موجود ہے۔ اس حدیث میں جنگ میں دھوکہ دینے کیلئے جھوٹ بولنے کی اجازت دی ہے۔ اب غور طلب یہ مسئلہ ہے کہ انگریزوں سے ہندوستان

---

[1] نقش حیات ص ۴۰۵ ج ۲۔

آزاد کرانے کے لئے جو جنگ لڑی جا رہی تھی جس کو دوسرے الفاظ میں تحریک آزادی بھی کہتے ہیں اس تحریک میں انگریز کو دھوکہ دینے کے لئے اور ملک کو آزاد کرانے کیلئے (کہ جس کے نتیجہ میں پاکستان بھی وجود میں آگیا) اگر کسی مجاہد نے جھوٹ بات کہدی ہو تو کیا وہ اس حدیث کی رو سے جائز ہے یا نہیں ؟ ہمیں امید ہے کہ جناب غلام رسول صاحب مہر اس سے انکار نہ کرسکیں گے۔

ان دو حدیثوں کے نقل کرنے کے بعد عرض ہے کہ جناب غلام رسول مہر کا وہ دعویٰ تو ختم ہو گیا کہ جس کے متعلق انھوں نے ارشاد فرمایا تھا" اگرچہ اسکی بنیاد دواوین فقہ میں موجود ہو"۔

۱۔ عیسیٰ بن دینار کہتے ہیں اگر کوئی مسلمان ظلماً قتل ہونے والا ہو اور کسی کے جھوٹ بولنے سے اسکی جان بچ سکتی ہو تو جھوٹ بولنا واجب ہے۔

۲۔ طبری کہتے ہیں کہ اصلاح بین الناس کے لئے کذب جائز ہے۔

۳۔ حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں بیان فرمایا ہے کہ (اضطرار کے وقت کذب جائز ہے اور اس پر سب کا اتفاق ہے۔

۴۔ محلی ابن حزم میں ہے۔ ہر محمود مقصود اگر اس کو کذب کی وجہ سے حاصل کیا جا سکتا ہو اگر یہ مقصود مباح ہے تو کذب مباح ہوگا اور اگر یہ مقصود واجب ہے تو کذب واجب ہے۔

۵۔ ابن عربی کہتے ہیں حرب میں کذب مستثنیٰ ہے۔ اور یہ بات نص سے ثابت ہے[۵]۔ الخ

---

[۵] ادبجز صفحہ ۲۶۸ ج ۲۔

۶۔ مذکورہ بالا حدیث کی شرح میں ملا علی قاری نے بیان فرمایا ہے۔

یعنی الکذب المذموم	جو شخص جھوٹ بول کر مسلمانوں
عند اللہ تعالیٰ والممقوت	میں صلح کرادے وہ نہ اللہ کے
عند المسلمین لیس من یصلح	نزدیک مذموم ہے اور نہ مسلمانوں
ذات البین فانہ عند اللہ	کے نزدیک مغضوب ہے بلکہ
تعالیٰ وعندھم محمود[1]	محمود ہے۔

۷۔ ایک صحابی رضؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات کی اجازت چاہی کہ وہ اہل مکہ سے اپنا مال چھڑانے کے لئے حضورؐ کی طرف سے جو چاہے کہہ دے اور یہ بھی ان کو خبر دیدے کہ اہل خیبر نے مسلمانوں کو شکست دیدی ہے تو حضور صلعم نے انکو اجازت دیدی۔ اور یہ حدیث مشہور ہے۔[2] الخ

اب ان تصریحات کی روشنی میں فیصلہ کیا جائے اور ان حالات کو سامنے رکھا جائے کہ جب استخلاص وطن کی تحریک جاری تھی اور اس کو بھی پیش نظر رکھا جائے کہ کتاب "اسیر مالٹا" عین ان ہی حالات میں لکھی گئی ہے اور نقش حیات ۱۹۴۷ء کے بعد طبع ہوئی ہے ایسے موقع پر اگر کسی نے کبھی کوئی بات خلاف واقعہ کہہ دی ہے تو اس سے عزیمت پر کوئی فرق نہیں آتا کیونکہ یہ معاملہ محض ذاتی تحفظ کا معاملہ نہیں تھا بلکہ ہزاروں نفوس کی جانوں کی حفاظت کا معاملہ تھا۔ اگر اس کو رخصت بھی قرار دیدیا جائے تو ایسی رخصت پر ہزاروں عزیمتیں قربان۔

علاوہ ازیں نہ حضرت مدنیؒ نے کذب سے کام لیا اور نہ حضرت شیخ الہندؒ نے اور نہ

---

[1] مرقات ص۲۶۵ ج ۴ [2] ایضاً ص۲۶۸ ج ۶۔

دوسرے حضرات نے بلکہ ان حضرات نے اپنے کلام میں تعریض سے کام لیا ہے جیسا کہ مندرجہ بالا عبارتوں سے ظاہر ہے۔ رہا حضرت مدنی رحؒ نے جو مسئلہ بیان فرمایا ہے وہ صرف ان کا ذاتی فتویٰ نہیں ہے بلکہ اس کی پشت پر مذکورہ احادیث اقوال اور دیگر قدیثین اور اقوال موجود ہیں اگر ان کو قبول کرنے کے لیے جی نہیں چاہتا تو اختیار ہے لیکن حضرت مدنی رحؒ کے مسئلہ بیان کرنے کی وجہ سے شریعت ہی سے انکار کر دینا ایک خطرناک امر ہوگا۔

ان وثائق کا ہندوستان پہنچنا
اور افشائے راز

حضرت شیخ الہندؒ کو جب یہ وثائق مل گئے تو ان کو اس پر بڑی فرحت ہوئی اس لئے انھوں نے اپنے آپ کو جلد از جلد تحریک کے مرکز یاغستان پہونچانا چاہا۔ لیکن ترکی افسروں نے آپ کو سمجھایا کہ آپ اپنی تحریک اسی جگہ سے بیٹھ کر چلائیں لیکن حضرت شیخ الہندؒ کو دھن لگی ہوئی تھی۔ مگر سوئے اتفاق جنگ کا زمانہ تھا خشکی کے راستے بند تھے اس لئے یاغستان پہونچنے کے لئے پھر ہندوستان کا راستہ اختیار کرنا تھا۔ اس مجبوری کی وجہ سے حضرت نے اپنے رفقاء سفر (جو حج وزیارت کیلئے آئے تھے) مولانا ہادی حسن صاحب خان جہانپوری، شیخ حاجی شاہ بخش صاحب۔ ان کے سپرد یہ کام کیا۔

طریقہ یہ اختیار کیا گیا کہ ان وثائق کو ایک لکڑی کے صندوق میں اس کے ایک تختہ کو مجوف کر کے رکھا گیا اور پھر ہموار کر دیا گیا۔ مولانا ہادی حسن صاحب کو ہدایت کر دی گئی کہ گھر پہونچ کر ان کاغذات کو نکال کر حاجی نور الحسن صاحب کو دیدیا جائے اور وہ احمد مرزا فوٹو گرافر کے پاس پہونچا دیں۔ اور اس کے فوٹو لیکر فلاں فلاں جگہ (یاغستان) وغیرہ پہونچا دیں۔

سی، آئی، ڈی کی تفتیش

چونکہ موسم حج نہیں تھا جہازوں کی آمد و رفت کم تھی لیکن باوجود اس کے اتفاقاً مولانا ہادی حسن صاحب کو وقت پر جہاز مل گیا۔ جب یہ جہاز بندرگاہ بمبئی پہونچا۔ پولیس حضرت شیخ الہندؒ کی تلاش میں ہر مسافر کو چھان بین کر کے نکلنے دیتی تھی۔ لیکن یہ حضرات بفضلہ تعالیٰ صاف نکل گئے اور صندوق کو جناب نورالحسن صاحب رئیس کے یہاں پہونچا دیا۔ انھوں نے صندوق کھول کر ان کاغذات کو نکالا ہی تھا کہ پولیس پہونچ گئی۔ انھوں نے جلدی سے ان کاغذات کو صدری کی جیب میں رکھکر کھونٹی پر ٹانگ دیا۔ پولیس نے تلاشی میں ہر چیز چھان ماری مگر اس صدری پر اس کی نظر نہ پڑی لہٰذا اسے مایوس جانا پڑا۔ اسکے بعد پولیس مخبر کی نشان دہی پر مرزا فوٹوگرافر کے یہاں پہونچی مگر اب تک ان کے یہاں یہ کاغذات نہیں پہونچے تھے۔ بلکہ جناب حاجی نورالحسن صاحب لے جا رہے تھے کہ مرزا صاحب کی دوکان پر یہ ہنگامہ دیکھ کر واپس آ گئے۔ دوسرے وقت پہونچے۔ مرزا صاحب نے باوجودیکہ خطرات تھے لیکن ان کا فوٹو لیا اور حاجی صاحب کے سپرد کر دیا۔ حاجی صاحب نے ان نقول کو یاغستان یا جہاں جہاں کے لئے حضرت شیخ الہندؒ کی ہدایت تھی پہنچا دیا۔

سبحان اللہ عجیب معاملہ ہے۔ حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک میں کتنے مخلص اور جی دار حضرات شریک تھے اور پھر حضرت شیخ الہندؒ سے کس قدر عقیدت اور محبت تھی۔ ان کی ہر ہدایت کو تمام خطرات مول لیکر انجام دیتے رہتے۔ لیکن اسی کے ساتھ حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک میں بعض کمزور دل اور اہل غرض بھی داخل ہو گئے تھے جسکے نیتجے میں حضرت شیخ الہندؒ اور آپ کے رفقاء کو عرصہ دراز تک مالٹا میں قید رہنا پڑا اگرچہ بعد میں وہ موت و حیات کی جنگ میں کامیاب ہو گئے۔

اپنے پرائے ہو گئے

حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک کا راز کیوں کر افشا ہوا؟ اور کس ثبوت اور کن کی مخالفانہ ریشہ دوانیوں کی وجہ سے حضرت شیخ الہندؒ گرفتار ہوئے؟ ایک تحقیق طلب اور دشوار ترین مسئلہ ہے۔ یہ بات نہیں ہے کہ اس موضوع پر کچھ نشان دہی یا تصریح موجود نہیں ہے۔ سب کچھ ہے لیکن منتشر بہت زیادہ ہے اس کی تلاش اور چھان بین اور پھر اس کو ایک جگہ جمع کرنا بہ نہایت دشوار ہے۔ اس لئے بعض حضرات جب اس مسئلہ پر کچھ کہتے ہیں تو اعتراضات میں اٹکل کے تیر چلاتے ہیں۔ لہٰذا جواباً بھی اسی قسم کا دفاع ہوتا ہے اور لوگ جواب دینے میں بوکھلاہٹ کا شکار ہو جاتے ہیں اور کچھ سے کچھ کہہ جاتے ہیں اس لئے لوگوں کو اور زیادہ شکوک کا موقعہ ملتا ہے لہٰذا ہم تفصیل سے اس کا جائزہ لیتے ہیں۔

حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ نے حضرت شیخ الہندؒ کی ہندوستان واپسی پران کے استقبال کا حال تحریر کرتے ہوئے آخر میں تحریر فرمایا ہے۔

> ایک وہ زمانہ تھا کہ نہ صرف احباب بلکہ تلامذہ، مریدین اور عزیز و اقارب کو یقین تھا کہ حضرت شیخ الہندؒ اور ان کے رفقاء کو پھانسی دی جائے گی ورنہ حبس دوام اور عبور دریائے شور کی سزا پائیں گے۔ اس لئے مریدوں اور شاگردوں تک نے نہ صرف تعلق ارادت اور شاگردی سے انکار کر دیا تھا بلکہ تعارف سے بھی منکر ہو گئے تھے۔ خاص خاص لوگ نہ صرف مکان پر آتے ہوئے گھبراتے تھے بلکہ اس محلہ اور کوچہ میں بھی نہیں گزرتے تھے۔ جہاں حضرت کا دولت خانہ تھا اور حضرت کے لئے تحقیر و ملامت کے الفاظ استعمال کرتے تھے۔ بعض مدعیان اخلاص جان و عزت کے خطرے سے انگریزوں کی سی، آئی، ڈی اور مخبر بن گئے

تھے اب یہ زمانہ بھی ان کے سامنے آگیا کہ ہندوستان اور بیرون ہند جہاں بھی حضرت
شیخ الہندؒ پہونچتے لوگ سروں پر بٹھاتے۔[۱]

یعنی پہلے عقیدت مندوں کا " صراحی چوں شود خالی جدا پیمانہ می گردد" کا سا معاملہ تھا۔ جتنے منہ آتنی ہی باتیں اور اس وقت کی باتیں بھی عجیب ہوتی ہوں گی" ہاں میاں ہاں انھوں نے کمال کردیا تھا حکومت کا تختہ لوٹنے جارہے تھے بھلا یہ چٹائی پر بیٹھنے والے اور ترمذی اور بخاری پڑھانے والے ان کو کس نے کہدیا تھا۔ میاں خیر ہوئی ہمیں تو پہلے ہی ہوش آگیا اور بھائی غدا لے دارالعلوم کو تو بال بال بچا دیا ورنہ اس کی خیر نہیں تھی۔ وہ تو یوں کہئے کہ خدا کا سایہ تھا کہ اس نے ایسی ایسی تدبیریں بتلا دیں۔ جس کی وجہ سے حکومت نے دارالعلوم کا پیچھا نہیں کیا" غرضکہ نہ معلوم اس طرز پر کتنی باتیں ہوتی ہوں گی۔ یہ قیاس نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ حضرت شیخ الاسلام نے اپنی اور حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری کی گفتگو کو نقل کیا ہے۔

مولانا عبدالرحیم صاحب مرحوم نے مجھ سے فرمایا کہ حضرت شیخ الہندؒ لوگوں سے بیعت
جہاد لیتے ہیں یہ تو بہت خطرناک امر ہے انگریزوں کو اگر خبر ہوگئی تو دارالعلوم
کی اینٹ سے اینٹ بجادیں گے اور مسلمانوں کا یہ مرکز علمی اور دینی اجاڑ دیا جائیگا۔[۲]

اس کے بعد حضرت شیخ الہندؒ نے حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب کو اپنا ہم خیال بنالیا بالآخر اپنی عدم موجودگی میں اپنی تحریک کا ان کو صدر مقرر کردیا۔ میرا خیال ہے ارباب دارالعلوم دیوبند پر حضرت شیخ الہندؒ کا یہ مقولہ " حضرت نانوتوی نے دارالعلوم کے لئے دعا کی تھی سو اب اس کو پچاس سال ہوگئے" یعنی دعا قبول ہوگئی لہٰذا اب اگر

---

[۱] نقش حیات ص ۲۳۶ ج ۲ [۲] ایضاً ص ۲۰۳ ج ۲۔

آئندہ دارالعلوم ختم ہوجاتا ہے اور ایک مقصد عظیم حاصل ہوجاتا ہے تو نہ معلوم اتنے کتنے دارالعلوم بن جائیں گے۔ حضرت شیخ الہند رح کا اس سے ہرگز یہ مقصد نہیں تھا کہ دارالعلوم ختم ہوجائے بلکہ اپنے مقصد اور اہمیت کو جتلانا مقصود تھا۔ لہٰذا یہ مقولہ بھی ان حضرات کو عادۃً ناگوار ہونا بھی چاہیئے تھا اور ہر اس شخص کو ناگوار ہونا چاہیئے تھا جو غلامی کی ذلت اور آزادی کی عظمت اور قیام نظام اسلامی کی شرافت سے ناواقف ہو یا واقف تو ہوں مگر جس حال میں مبتلا ہوں اسی میں خوش ہوں سعی اور کوشش کو تقدیر خداوندی پر محول کرتے ہوں۔

میری رائے یہ ہے کہ ارباب دارالعلوم اس تحریک کو سب سے زیادہ ناپسند کرتے تھے اسی وجہ سے انھوں نے حضرت مولانا عبیداللہ سندھی کو دارالعلوم دیوبند سے نکالنے کے لئے بہانے تلاش کئے تھے بالآخر ان کو نکال دیا تھا حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رح تحریر فرماتے ہیں۔

> واقعہ یہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے ارباب اہتمام (حضرت حافظ محمد احمد صاحب اور مولانا حبیب الرحمٰن صاحب) کے سامنے دارالعلوم کا بقا و تحفظ سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ ۱۸۵۷ء کے واقعات اور اس کے بعد انگریزی پالیسی انکے سامنے تھی۔ انھوں نے مولانا عبیداللہ سندھی کی سرگرمیوں کو نہ صرف دارالعلوم دیوبند بلکہ عام مسلمانوں کے لئے بھی خطرناک تصور کیا اور اپنے خیالات کے مطابق ضروری سمجھا کہ مولانا عبیداللہ سندھی کا تعلق اس مرکز سے نہ رہے [1]

اور یہ ظاہر ہے کہ یہ تحریک مولانا سندھی کی نہیں بلکہ حضرت شیخ الہند رح کی تھی لیکن

---

[1] نقش حیات ص ۱۴۴ ج ۲۔ اسکے متعلق ہم جمعیۃ الانصار تحریک کے سلسلہ میں لکھ چکے ہیں۔

وہ حضرت شیخ الہندؒ کا تو کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے اسلئے نزلہ مولانا سندھی پر اتار دیا اور حضرت شیخ الہندؒ کے متعلق دل میں جو کچھ بھی خیال ہوگا اسکو وہ جانیں اور ان کا خدا۔

حضرت شیخ الہندؒ بھی ان حضرات (ارباب اہتمام) سے مطمئن نہیں تھے کیوں کہ حکومت ہند نے جب حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب کو شمس العلما کا خطاب دیا اور ان کے ڈھائی سو روپیہ ماہانہ بطور وظیفہ مقرر کر دیئے تو حضرت شیخ الہندؒ کو اس سے تکلیف ہوئی۔ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ تحریر فرماتے ہیں۔

> بہرحال اصلی سبب وہ ہے کہ جس کی بنا پر مسٹن گورنر یو پی دیوبند اور دارالعلوم میں گیا تھا اور مہتمم صاحب کو شمس العلما کا خطاب ملا تھا۔[1]

دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں۔

> حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب صاحبزادہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب مرحوم مہتمم دارالعلوم دیوبند کو گورنمنٹ کی طرف سے شمس العلما کا خطاب سر جیمس گورنر یوپی نے دلوایا تھا۔ حضرت نے اس کو واپس کروایا اور ایسی موثر تقریر مجلس خصوصی میں فرمائی کہ نہ صرف حافظ صاحب مرحوم بلکہ تمام مجمع متاثر ہو کر بیک زبان واپسی کا متقاضی ہوا۔[2]

حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب تو بہت سیدھے سادے بزرگ تھے ان کو پٹی پڑھانے والے تو دوسرے ہی تھے وہ جو کرتے تھے وہ ہوتا تھا۔ ان ہی کے کہنے سے حافظ صاحب نے یہ خطاب قبول کیا تھا۔

---

[1] نقش حیات صفحہ ۲۴۱ [2] ایضاً صفحہ ۲۵۵۔

کیا مولانا تھانوی شریک تھے

چونکہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی اجتہادی طور پر اس تحریک کے مخالف تھے اس لئے بعض حضرات کو خیال ہوا تھا کہ حضرت تھانوی نے حضرت شیخ الہند کی گرفتاری میں حکومت کی اعانت کی ہوگی۔ حضرت شیخ الاسلام نے اپنے مکتوب میں اس کی تردید فرمائی ہے۔

یہ بالکل غلط ہے کہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نے حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ العزیز کو مالٹا میں قید کرایا تھا وہ حضرت شیخ الہند کے شاگرد اور محبین میں سے تھے البتہ تحریک آزادی ہند میں ان کی رائے خلاف تھی نہ انھوں نے کوئی مخبری کی اور نہ ان کو انگریزوں سے اس قسم کے تعلقات رکھنے کی کبھی نوبت آئی ہاں مولانا مرحوم کے بھائی محکمہ سی، آئی، ڈی میں بڑے عہدیدار آخر تک رہے ان کا نام منظہر علی ہے۔ انھوں نے جو کچھ کیا ہو مستبعد نہیں۔[1]

چونکہ فضا خراب تھی اور حضرت مولانا تھانوی ان معاملات میں قلبی اعتبار سے کمزور تھے پھر اجتہاداً ان کی سمجھ میں حضرت شیخ الہند کی یہ تحریک نہیں آئی تھی اس لئے الگ الگ رہتے تھے۔ اور کچھ ان کو ان کے بھائی اور مریدین نے بھی ڈرا دیا ہوگا چنانچہ حضرت مولانا فخر الدین صاحب موجودہ شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند فرماتے ہیں۔

جب حضرت شیخ الہند ہندوستان واپس تشریف لائے تو حضرت تھانوی بھی دیوبند ملنے آئے تھے مگر بالکل کھڑے کھڑے آئے اور گئے۔[2]

---

[1] مکتوب ۱۰۹ جلد ثانی ص ۲۹۹ [2] روایت مولانا فخر الدین صاحب۔

کیا حضرت مولانا خلیل احمد صاحب نے راز فاش کیا؟

حضرت مولانا میاں اصغر حسین صاحب نے حیات شیخ الہندؒ میں حضرت مولانا خلیل احمد صاحب کے متعلق تحریر فرمایا ہے۔

> یہ ظاہر ہے کہ حضرت مولانا ایک مقبول عالم دین اور مولانا رشید احمد صاحب قدس سرہٗ کے خلیفہ راشد ہیں اور یقین ہے کہ آپ کے منہ سے کلمۃ الحق کے سوا کچھ نہ نکلا ہوگا لیکن خدا جانتا ہے کہ کیا صورت پیش آئی افسران تفتیش نے آپ کے بیان سے کچھ غلط معنی استنباط کر لئے جس کے بعد بطور نتیجہ اور ثمرات کے متواتر تحقیقات اور متعدد حضرات کے اظہار و بیانات لینے کی نوبت آئی اور مکہ معظمہ میں حضرت کی گرفتاری کا واقعہ پیش آیا۔[1]

حضرت مولانا میاں اصغر حسین صاحب دارالعلوم دیوبند میں مدرس تھے اور ماتحت تھے۔ اس لئے انہوں نے بات کو ذرا ہلکا کر دیا ہے اور لوگوں کی توجہ کو تقسیم کر دیا کیونکہ مندرجہ ذیل تحقیقات اس کے خلاف ہیں۔ حضرت شیخ الاسلامؒ نقش

---

[1] حیات شیخ الہندؒ ص ۱۴۔ یہ غلط فہمی کیوں پیدا ہوئی۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ حراست سے چھوٹنے کے بعد حضرت مولانا خلیل احمد صاحب کے متعلق افواہ اڑائی گئی کہ وہ شریف مکہ کے موافق ہیں وغیرہ ذلک یہ افواہی مضمون اصلاح بجنور میں شائع ہوا اس کی تردید میں حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری نے ایک طویل خط مالک اخبار اصلاح بابو ظہور الحق کے نام ارسال فرمایا اور نہایت کھلے الفاظوں میں اس افواہ کی تردید اور حضرت شیخ الہندؒ کے مسلک کی تائید فرمائی۔ یہ پرانا اخبار میرے پاس موجود ہے اپریل سنہ ۲۱ء میں حضرت مدنیؒ نے بھی حضرت ممدوح کی صفائی میں بیان دیا تھا وہ بیان بھی شائع ہو چکا ہے۔

حیات میں تحریر فرماتے ہیں۔

حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سے وہاں پوچھ گچھ ہوئی تو فرمایا کہ میں فلاں جہاز سے فلاں تاریخ کو گیا تھا مولانا محمود الحسن صاحب شیخ الہند کا ساتھ نہ جانے میں نقارہ آتے میں۔ البتہ عام حاجیوں کی طرح حج و زیارت میں میری شرکت بھی رہی میں انکی پارٹی کا آدمی نہیں ہوں۔[۱]

یاد رہے کہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک کے رکن تھے۔ انور پاشا، جمال پاشا، غالب پاشا سے ملاقات میں برابر شریک رہے اور وثائق میں بھی برابر شریک رہے۔ نہایت مضبوط قسم کے انسان تھے نہایت ہی پاک طینت اور مخلص اور ولی اللہ تھے۔ اس لئے ان کے متعلق مذکورہ بیان کی صورت میں حضرت میاں اصغر حسین صاحب کی تحریر کے متعلق ہماری رائے وہی ہے جو ہم نے ذکر کر دی ہے

مولانا مرتضےٰ احسن صاحب آپ چاند پور ضلع بجنور کے باشندہ ہیں۔ حضرت شیخ الہندؒ کے شاگرد ہیں۔ آپ کے ساتھ حج کے ارادے سے گئے تھے۔ لیکن انھوں نے وہاں نہایت غیر محتاط رویہ اختیار کیا (جیسا کہ ہم گذشتہ سطور میں ذکر کر چکے ہیں) ان کی بے احتیاطیوں کی وجہ سے حضرت شیخ الہندؒ کو مدینہ منورہ میں دشواری پیش آئی تھی۔ مجھے معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ یہ اور صوفی محمود حسن صاحب دیوبندی اور ارباب اہتمام حکومت کے پاس خبریں پہونچاتے تھے۔ حضرت شیخ الاسلام نقش حیات میں تحریر فرماتے ہیں۔

اسی لئے تصدق حسین افسر خفیہ پولیس مولانا مرتضیٰ حسن صاحب کو نہایت

---

[۱] نقش حیات صفحہ ۲۴۴ ج ۲۔

سچا اور حضرت رائے پوری کو نہایت جھوٹا کہتا تھا کیونکہ ان کی رپورٹ سی، آئی، ڈی تصدق حسین کی دلی خواہش کے مطابق اور اس کے آقا انگریزوں کی طرفداری میں تھی[۱]

جس وقت حضرت شیخ الہند ہندوستان تشریف لائے تو مراد آباد تشریف لے گئے وہاں شوکت باغ میں قیام تھا حضرت شیخ الہند باہر بیٹھے ہوئے تھے اور مولانا مرتضیٰ حسن کمرے میں تھے۔ مولانا عزیر گل بھی پہونچ گئے تو مولانا مرتضیٰ حسن صاحب سے جاکر کہا۔

حضرت کے ساتھ اور کچھ کرنا ہو تو کرلو۔ یہ آواز حضرت شیخ الہند نے بھی سن لی تو فرمایا حسین احمد! جاؤ عزیر گل سے کہدو خاموش رہے۔ تب مولانا عزیر گل نے حضرت مولانا حسین احمد صاحب کو گھورتے ہوئے فرمایا تو ہی مجھے چپ کھتا ہے ورنہ جی میں آتا ہے کہ اس کو قتل کر دوں[۲]

ان تصریحات سے معلوم ہو رہا ہے کہ مولانا مرتضیٰ حسن صاحب حکومت کی سی آئی، ڈی کا کام کرتے تھے۔

قاضی مسعود احمد صاحب

مولانا قاضی مسعود احمد صاحب حضرت شیخ الہند کے بھانجے اور داماد ہیں موصوف دارالعلوم دیوبند میں نائب مفتی تھے۔ ڈاکٹر انصاری ان کے متعلق تحریر فرماتے ہیں۔

مولوی مسعود احمد صاحب (جو حضرت مولانا محمود حسن صاحب کے داماد اور بھانجے ہیں) ذیقعدہ ۱۳۳۲ھ میں حج کو گئے اور حج بیت اللہ سے فارغ ہوکر واپس

---

[۱] نقش حیات ص ۲۲۲ ج ۲ [۲] روایت ہیڈ ماسٹر خورشید الحسن صاحب مراد آباد۔

آرہے تھے کہ بمبئی میں انھیں روک لیا گیا اور وہیں سے زیر نگرانی الٰہ آباد پہونچائے
گئے اور طویل عرصہ تک وہاں رکھے گئے۔ اظہار لئے گئے اور افواہاً سنا گیا ہے کہ
ان پر بہت سختی کی گئی اور تکلیف پہونچائی گئی تقریباً ایک مہینہ کے بعد انھیں
گھر جانے کی اجازت دی گئی[1]

اس عبارت کو حضرت شیخ الاسلام کی عبارت کے ساتھ ملا کر پڑھئے۔

اتفاقاً قاضی مسعود احمد صاحب آخری جہاز میں اوائل ذی الحجہ میں آگئے۔ ان
سے احوال معلوم ہوئے[2]

اس کے بعد ڈاکٹر انصاری کی رقم پہونچنے کا تذکرہ کرتے ہوئے چند سطروں کے بعد
تحریر فرماتے ہیں۔

حج کا زمانہ تھا حجاج جا رہے تھے کسی معتمد حاجی کے ذریعہ رقم بھیجی جا سکتی تھی لیکن
ان دونوں (ڈاکٹر انصاری اور حکیم عبدالرزاق صاحب) رہنماؤں کی غیر معمولی
ہمدردی کا فیصلہ یہ ہوا کہ حضرت کے کسی قریبی عزیز کو جو خانگی حالات سے پوری
طرح واقف اور خانگی امور میں بے تکلف ہو بھیجا جائے تاکہ رقم کے ساتھ حضرت
کو اپنے متعلقین کے حالات بھی تفصیل سے معلوم ہو جائیں چنانچہ حضرت کے ایک
خاص عزیز جن کا نام لینا مناسب نہیں) اس خدمت کے لئے (جو ان کیلئے سراسر
سعادت تھی) نامزد کیا گیا[3]

ان عزیز سے مراد یہی قاضی مسعود احمد صاحب (جو حضرت کے بھانجے اور داماد
ہوتے ہیں) ہیں جن کا نام چند سطر بیشتر حضرت شیخ الاسلام نے بھی ذکر کیا ہے اور ڈاکٹر

---

[1] شیخ الہند ص ۳ مطبوعہ ۱۹۱۸ء [2] نقش حیات ص ۳ [3] ایضاً۔

انصاری نے بھی لیا ہے ان ہی کو حضرت شیخ الاسلام نے نقش حیات میں عزیز موصوف کے خطاب سے جگہ جگہ یاد کیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں۔

یہ محترم عزیز حضرت شیخ الہند سے جو رشتہ رکھتے تھے اس کا تقاضہ تھا کہ ان پر اعتماد کیا جائے بالخصوص ایسی صورت میں کہ تحریک ہی کے کام سے پوری رازداری کے ساتھ ایک کارکن کی حیثیت سے اتنا طویل سفر کر کے آپ حجاز شریف پہونچے تھے اس کے علاوہ چونکہ مولانا ہادی حسن صاحب تاریخی صندوق لیکر آئے تھے جہاز سے اترتے ہی نینی تال میں نظر بند کر دیئے گئے تھے۔ لہذا تشویش اور بے چینی تھی کہ جس مقصد کے لئے اتنی کوشش کی گئی اتنی مصیبتیں جھیلی گئیں اور جس راز کو اس طرح مخفی رکھا گیا یہ سب کچھ بے نتیجہ رہے گا بلکہ ممکن ہے کہ اس کے اثرات تباہ کن ہوں۔ اس بنا پر عزیز موصوف کو حضرت شیخ الہندؒ نے صندوق کا راز بھی بتا دیا تھا۔ اور یہ بھی فرما دیا تھا کہ ان تحریروں کے فوٹو لیکر فلاں فلاں مقام پر فلاں فلاں صاحب کے پاس بھجوا دیئے جائیں۔ دوسری طرف عجیب و غریب قصہ یہ تھا کہ عزیز موصوف کمزور دل، ناتجربہ کار نوگرفتار تھے اور سی، آئی، ڈی کے وہ افسر جنھوں نے الہ آباد میں ان سے گفتگو کی وہ پولیس کے کہنہ مشق، شاطر، اپنے فن کے بہترین تھے۔ ان افسروں نے ڈرا دھمکا کر پولیس کی تمام جابرانہ کارروائیاں عمل میں لاکر اور متعدد اوقات میں طرح طرح کر کے وہ تمام باتیں معلوم کرلیں جو عزیز موصوف کے حافظہ میں تھیں۔ ان میں سے کچھ ایسی باتیں بھی تھیں کہ اگر ثابت ہو جائیں تو نہ معلوم کتنوں کو جام شہادت نوش کرنا پڑتا اور کتنے عبور دریائے شور اور حبس دوام کی سزا پاتے۔ صندوق کا

قصہ بھی ان ہی کے ذریعہ معلوم ہوا۔ گویا سی، آئی، ڈی کو دولت کا خزانہ مل گیا
فوراً مظفر نگر پولیس کو تار دیا گیا اور مظفر نگر سے دوش خان جہاں پور پہونچی اور
مولانا ہادی حسن صاحب کے مکان کی تلاشی لی گئی۔ پھر حاجی نورالحسن صاحب،
اور حاجی احمد مرزا فوٹو گرافر کی تلاشی بھی اسی انکشاف کا نتیجہ تھا۔[1]

ڈاکٹر انصاری اور نقش حیات کے مذکورہ اقتباسات کو پڑھ جایئے۔ اور پھر دریافت کرتے لیجئے کہ یہ ذات شریف کون تھی۔ اسی کے ساتھ مولانا اصغر حسین صاحب کی مذکورہ عبارت پر بھی نظر ڈال لیجئے تو نتیجہ سامنے آ جائے گا کہ موصوف نے لوگوں کی توجہ تقسیم کرنے کے لئے بات حضرت مولانا خلیل احمد صاحب کی طرف منتقل کرنا چاہی تھی۔ میں نے اس باب میں صرف اسی قدر کیا ہے کہ سب عبارتوں کو ناظرین کے سامنے رکھ دیا ہے لہٰذا میرے اوپر غصہ نہ ہو جائے۔

ارباب اہتمام دارالعلوم

جس وقت حضرت مولانا خلیل احمد صاحب نینی تال پہونچ گئے اور حکومت ان سے بیانات لینے میں کامیاب نہ ہو سکی تو ان کو چھوڑ دیا۔ ڈاکٹر انصاری اس پر تبصرہ کرتے ہیں۔

بالآخر شمس العلما مولوی محمد احمد صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند اور مولانا حبیب الرحمٰن صاحب دیوبندی وغیرہ معلوم نہیں کہ باشارہ گورنمنٹ یا از خود نینی تال گئے اور مولانا خلیل احمد صاحب اور ان کی اہلیہ محترمہ اور حاجی مقبول احمد صاحب و مولوی مطلوب الرحمٰن صاحب ان کے ہمراہی میں باجازت سر جیمس مسٹن بہادر

---

[1] نقش حیات ص۲۳۱ ج ۲۔

تشریف لائے۔[1]

اس تحریر سے یہ ظاہر ہے کہ ارکان تحریک ارباب اہتمام کی طرف سے مطمئن نہیں تھے ان کو گورنمنٹ کا آدمی خیال کرتے تھے اس میں شک نہیں کہ ۵ نومبر ۱۹۱۷ء کو ایک وفد علماء دیوبند کا گورنر یوپی کے پاس پہونچا اور انھوں نے ایک تحریر پیش کی، جو القاسم میں شائع ہو چکی ہے۔ جس میں حضرت شیخ الہندؒ کے آزاد کرنے کا مطالبہ اور حضرت موصوف کی برئیت اور صفائی کا اظہار تھا۔

بہرحال اس باب میں ہم نے جس قدر از اول تا آخر اقتباسات نقل کئے ہیں اور جن جن حضرات کے متعلق کئے ہیں وہ بہت صاف ہیں۔ نقش حیات کا ابتدائی اقتباس اور ڈاکٹر انصاری کا مندرجہ ذیل ارشاد ایک تاریخ کے طالب علم کو مشکوک کرتا ہے ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں۔

> اصل بات یہ ہے کہ ہر مقدس ہستی کے ساتھ جہاں بہت سے اس کے دلدادہ او جاں نثار ہوتے ہیں وہاں بعض لوگ اس کے دشمن اور حاسد بھی ہوتے ہیں اسی طرح جہاں ذمہ دار اشخاص میں اپنی ذمہ داری کا احساس کرنے والے محتاط بزرگ ہوتے ہیں وہیں بہت سے ناعاقبت اندیش اور ناتجربہ کار بھی اس جماعت میں دیکھے جاتے ہیں جو رسّی کا سانپ بنانے اور جہاں سوئی نہ جائے وہاں پھالا گھسانے کو ہی اپنا کمال اور مایہ فخر سمجھتے ہیں۔ مولانا کے بارے میں اور نہ صرف مولانا بلکہ اکثر نظر بندوں کے بارے میں ہمارا یہی خیال ہے وہ ناعاقبت اندیشی ناتجربہ کاری حسد یا خود غرضی کا شکار ہوئے ہیں۔[2]

---

[1] شیخ الہندؒ مطبوعہ ۱۹۱۶ء ص۵۲ [2] ایضاً ص۲۵

ڈاکٹر انصاری کا یہ ارشاد اور حضرت شیخ الاسلام کی عبارت منقولہ از نقش حیات دونوں کو ملا کر پڑھئے اور پھر تحریک جمعیۃ الانصار سے لیکر حضرت شیخ الہندؒ کی گرفتاری تک کے حالات پر نظر ڈالئے اور اس کے بعد نشان لگاتے جایئے کہ کون کون شخصتیں مجروح ہو رہی ہیں اور کون کون بری الذمہ ہیں اس کے بعد پانی کے بہاؤ کا رخ خود بخود متعین ہو جائے گا۔

میری رائے

حضرت شیخ الہندؒ کی گرفتاری کے متعلق جو چیزیں سامنے آئی ہیں ان سے قطعی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مذکورہ شخصیتوں نے حضرت قدس سرہٗ کو قصداً گرفتار کرایا تھا یا ان کی خواہش یہ تھی کہ حضرت گرفتار ہو جائیں، بلکہ بات یہ ہے کہ ایسے انقلابی زمانے میں ایک تعلیمی ادارے کی پالیسی ہی یہ ہوتی ہے کہ وہ یکسو رہے اور ضرورت پیش آئے تو اس قسم کی تحریکات میں شریک ہونے سے اعلان بیزاری بھی کر دے، چنانچہ جتنے افراد کے اسماء اوپر ذکر ہوئے ہیں وہ ہرگز یہ نہیں چاہتے تھے کہ حضرت شیخ الہندؒ گرفتار ہو جائیں لیکن وہ اس کیلئے بھی تیار نہیں تھے کہ دوسرے کی بلا اپنے سر اوڑھ لیں، چنانچہ حکومت کی تفتیش کے وقت یہی ہوا کہ مذکورہ حضرات نے اپنی علیحدگی کا تو ثبوت دیدیا لیکن دوسرے کے مصائب کے دور کرنیکے لئے دفاع بھی نہیں کیا اور نہ ایثار کو شعار بنایا ایسے ماحول میں اگر حکومت کو تشدد کا رخ معلوم ہو گیا ہو تو کیا بعید ہے۔ اس سے یہ ہرگز نہیں سمجھنا چاہیئے کہ مذکورہ حضرات حضرت شیخ الہندؒ کی گرفتاری کو پسند کرتے تھے۔ وہ اضطرار میں مبتلا ہوئے اور اپنے کو بچا لے گئے لیکن دوسرے کے لئے مصائب کے دروازے کھول گئے۔

حضرت شیخ الہند رح کی گرفتاری و اسارت مالٹا

حضرت شیخ الہند رح نے ہندوستان کو شوال سنہ ۱۳۳۳ھ سنہ ۱۹۱۵ء میں چھوڑا تھا اور عرب کی زمین پر ذیقعد سنہ ۱۳۳۳ھ کو وارد ہوئے تھے. ایک حج آپ نے اسی سال ادا فرمایا. دوسرے سال سنہ ۱۳۳۴ھ میں دوسرا حج ادا فرمایا. دوسرے حج کے بعد آپ کی گرفتاری عمل میں آگئی۔

طائف کو روانگی

ہوا یہ کہ جب آپ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب کو روانہ کر کے مکہ معظمہ تشریف لائے تو اب آپ کو اس کی جلدی لگی کہ جلد از جلد مرکز تحریک یاغستان پہونچنا چاہیئے چونکہ خشکی کا راستہ بند تھا۔ یہ طے کیا کہ سمندر کے راستہ سے بلوچستان ہو کر بالا بالا نکل جائیں. اس کے لئے آپ نے مناسب سمجھا کہ پہلے طائف پہونچ کر غالب پاشا سے ملاقات کر کے مشورہ کر لینا چاہیئے چنانچہ آپ طائف تشریف لے گئے. ادھر شریف مکہ ترکی حکومت کا باغی ہو گیا اور انگریزوں سے مل بیٹھا. طائف میں بغاوت اٹھ کھڑی ہونے کی وجہ سے آپ وہاں ڈیڑھ مہینہ تک محصور رہے۔ رمضان المبارک کا مہینہ آپ کا وہیں گزرا۔ اس کے بعد مکہ معظمہ تشریف لے آئے۔ چونکہ حج کا زمانہ قریب آگیا تھا اس لئے آپ نے مناسب سمجھا کہ دوسرا حج بھی کر لیا جائے۔ اسی حج میں قاضی مسعود احمد صاحب آکر شریک ہوئے تھے اسی حج سے فارغ ہو کر آپ نے قاضی مسعود احمد صاحب کو صندوق کا قضیہ سمجھا کر اور صندوق دوسرے

حضرات کے ذریعہ روانہ کرکے یاغستان پہونچنا چاہا تھا مگر قسمت کا لکھا سامنے آیا۔

ادھر حکومت ہند نے قاضی مسعود احمد صاحب وغیرہ حضرات سے تمام راز کی باتیں دریافت کرکے اپنی سی، آئی، ڈی کے انسپکٹر کی ڈیوٹی عرب میں مقرر کردی تھی۔ اس نے آکر حکومت ہند کو رپورٹ دی۔ اور حکومت ہند نے شریف مکہ سے مطالبہ کیا اور شریف مکہ نے شیخ الاسلام مکہ کے سپرد یہ کام کیا اور اس نے ترکوں کے خلاف کفر کا فتویٰ حاصل کرنے کے لئے ایک استفتا مرتب کیا جسکی تفصیل یہ ہے۔

فتویٰ سے انکار اور گرفتاری

خان بہادر مبارک علی صاحب جو اورنگ آباد کے ساکن تھے انہیں دنوں یہاں آئے اور شریف مکہ سے آکر بیان کیا کہ میں حکومت ہند کا آدمی ہوں۔ ہندوستان میں وہاں کے باشندوں نے حکومت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر رکھی ہے اور حکومت حجاز کو بہت برا بھلا کہتے ہیں لہٰذا ایک محضرنامہ تیار کیجئے جو ترکوں کے خلاف ہو اس پر فلاں فلاں علماء ہند کے بھی دستخط ہوں۔ چنانچہ یہ محضرنامہ تیار کیا گیا۔ اور سب علماء مکہ نے تو اس پر دستخط کر دیئے مگر جب یہ محضرنامہ حضرت شیخ الہندؒ کے پاس پہونچا تو آپ نے یہ کہہ کر اس کو واپس کر دیا کہ اس کا عنوان

من علماء مکۃ المکرمۃ والمدرسین بالحرم الشریف ہے

اور میں نہ علمائے مکہ میں سے ہوں اور نہ حرم شریف کے مدرسین میں سے ہوں پھر اس میں ترکوں کے کفر پر فتویٰ ہے۔ اور دلیل میں سلطان عبدالحمید خاں کا تخت سے اتارنا مذکور ہے اور یہ کفر کے لئے کوئی شرعی علت نہیں۔ چنانچہ آپ نے اس کو واپس کر دیا۔ اس کا واپس جانا تھا کہ شیخ الاسلام مکہ مکرمہ آگ بگولہ ہو گیا اور

حضرت شیخ الہند رح کی گرفتاری کے منصوبے بنانے لگا۔

مکہ معظمہ میں دہلی کے کچھ تاجر بھی رہتے تھے۔ انھوں نے بیچ میں پڑکر حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رح کو تیار کیا کہ آپ شیخ الاسلام کی خوشامد کرلیں تو کام چل جائے گا۔ حضرت مدنی نور اللہ مرقدہٗ تیار ہوگئے اور فرمایا کہ اگر میرے اس عمل کی وجہ سے حضرت کو راحت پہونچتی ہے تو میں تیار ہوں۔ چنانچہ آپ تشریف لے گئے اور نام نہاد شیخ الاسلام کے ہاتھوں کو بوسہ دیا وہ کچھ ٹھنڈا بھی پڑ گیا۔ مگر سوئے اتفاق اسی رات کو کہیں سے شریف مکہ آمرا۔ اور اس نے نہایت سختی سے حکم دیا کہ ان لوگوں کو جلد از جلد گرفتار کر کے حکومت برطانیہ کے حوالہ کر دینا چاہیئے ورنہ وہ ہم سے ناراض ہو جائے گی۔

یہ خبر حضرت شیخ الہند رح اور آپ کے رفقاء کو بھی پہونچ گئی۔ تو دلی کے تاجروں نے ساتھ مل کر یہ طے کیا کہ حضرت کو تو روپوش ہو جانا چاہیئے۔ دو تین دن تلاش کے بعد معاملہ ختم ہو جائے گا۔ چنانچہ یہی کیا گیا۔ جب حضرت شیخ الہند رح ہاتھ نہ آئے تو مولانا عزیر گل اور حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رح کو گرفتار کر کے جیل بھیجدیا گیا اور ان پر سختی کی گئی کہ یا تو ان کا پتہ بتلاؤ ورنہ تم لوگوں کو گولی کا نشانہ بنا دیا جائیگا مگر واہ رے فدا کاری یہ حضرات ٹس سے مس نہ ہوئے۔ ادھر حضرت کو جب یہ معلوم ہوا تو انھوں نے فرمایا کہ اب میرا روپوش رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ چنانچہ یہ طے پایا کہ آپ احرام باندھ کر باہر سے آئیں تاکہ یہ معلوم ہو کہ آپ عمرہ کے لئے باہر تشریف لے گئے تھے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ آپ اونٹ پر احرام باندھے ہوئے سوار تھے کہ آپ کو گرفتار کر لیا گیا تب آپ نے فرمایا۔

الحمد للہ بمعصیتے گرفتارم نہ بمعصیتے

حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ حکیم نصرت حسین صاحب اور حضرت مولانا عزیر گل صاحب اور مولانا وحید احمد صاحب کو (یہ ابھی بچہ ہی تھے) گرفتار کر کے جدہ بھیج دیا گیا۔ حضرت مولانا مدنیؒ نے کوشش کرا کے جیل خانے سے خود کو حضرت شیخ الہندؒ کے پاس پہونچوا دیا۔ جدہ سے پانچ اسیران فرنگ کا مختصر قافلہ انگریزی فوج کی نگرانی میں سویز پہونچا دیا گیا۔

حکیم نصرت حسین صاحب

حضرت شیخ الہندؒ کے رفقائے اسارت میں سے ہی بقیہ حضرات کا تذکرہ تو آ گیا ہے۔ اس جگہ حکیم صاحب کے متعلق مختصراً کچھ عرض کرنا ہے۔ آپ اکوڑہ جہان آباد ضلع فتح پور ہسوہ کے ساکن ہیں حضرت شیخ الہندؒ سے دورہ حدیث پڑھا تھا اور آپ ہی سے بیعت بھی ہو گئے تھے۔ حج کرنے کے لئے تشریف لے گئے تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ رہنے کی وجہ سے ان کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ آپ نے مالٹا ہی میں انتقال فرمایا اور وہیں دفن کئے گئے۔

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

سویز میں سوالات

۱۸ ربیع الاول ۱۳۳۴ھ مطابق ۱۲ جنوری ۱۹۱۶ء کو اسیران فرنگ کا یہ مختصر قافلہ جدہ سے روانہ ہوا اور چار دن بعد یعنی ۱۶ جنوری ۱۹۱۶ء کو سویز پہونچا اور وہاں سے قاہرہ پہونچا۔ وہاں آپ کو ایک فوجی جیل خانہ میں بند کر دیا گیا۔ اور ہندوستان سے جو رپورٹ یہاں پہونچی تھی۔ اس کے مطابق ان حضرات سے سوالات کئے گئے۔ یہ حضرت شیخ الہندؒ کی کرامت تھی کہ ان سب حضرات کے جواب ایک ہی رہے باوجودیکہ چاروں حضرات

علیحدہ علیحدہ بند کئے گئے تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ سے جو سوالات ہوئے اور آپ نے جو جوابات دیئے ان کو ذیل میں درج کیا جا رہا ہے۔

سوال:۔ آپ کو شریف مکہ نے کیوں گرفتار کیا۔

جواب:۔ اس کے محضرنامہ پر دستخط نہ کرنے کی وجہ سے ا

سوال:۔ آپ نے اس پر دستخط کیوں نہ کئے۔

جواب:۔ مخالف شریعت تھا!

سوال:۔ آپ کے سامنے مولوی عبدالحق حقانی کا فتویٰ پیش کیا گیا تھا۔

جواب:۔ ہاں۔

سوال:۔ پھر آپ نے کیا کیا۔ جواب:۔ رد کر دیا۔

سوال:۔ کیوں۔ جواب:۔ مخالف شریعت تھا۔

سوال:۔ آپ مولوی عبیداللہ کو جانتے ہیں۔

جواب:۔ ہاں۔

سوال:۔ کہاں سے۔

جواب:۔ انھوں نے دیوبند میں عرصہ دراز تک مجھ سے پڑھا ہے۔

سوال:۔ وہ اب کہاں ہیں۔

جواب:۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں عرصہ ڈیڑھ سال سے زیادہ ہوتا ہے کہ حجاز وغیرہ میں ہوں۔

سوال:۔ ریشمی خط کی کیا حقیقت ہے۔

جواب:۔ مجھ کو کچھ علم نہیں اور نہ میں نے دیکھا۔

سوال :۔ وہ لکھتا ہے کہ آپ اس کی سیاسی سازش میں خلاف برطانیہ شریک ہیں اور آپ فوجی کمانڈار ہیں۔

جواب :۔ وہ اگر لکھتا ہے تو اپنے لکھنے کا خود ذمہ دار ہے۔ بھلا میں اور فوجی کمانداری میری جسمی حالت ملاحظہ فرمایئے اور پھر عمر کا اندازہ کیجئے۔ میں نے تمام عمر مدرسہ کی مدرسی میں گزاری۔ مجھ کو فنون حربیہ اور فوج کی کمان سے کیا مناسبت ؟

سوال :۔ اس نے دیوبند میں جمعیۃ الانصار کیوں قائم کی۔

جواب :۔ محض مدرسہ کے مفاد کے لئے۔

سوال :۔ پھر کیوں علیحدہ کیا گیا۔

جواب :۔ آپس کے اختلاف کی وجہ سے۔

سوال :۔ کیا اس کا مقصد اس جمعیۃ سے کوئی سیاسی امر نہ تھا۔

جواب :۔ نہیں۔

سوال :۔ غالب نامہ کی کیا حقیقت ہے۔

جواب :۔ غالب نامہ کیسا ؟

سوال :۔ غالب پاشا گورنر حجاز کا خط جس کو محمد میاں لے کر حجاز سے گیا اور آپ نے غالب پاشا سے اس کو حاصل کیا۔

جواب :۔ مولوی محمد میاں کو میں جانتا ہوں وہ میرا رفیق سفر تھا مدینہ منورہ سے مجھ سے جدا ہوا ہے۔ وہاں سے لوٹنے کے بعد اس کو جدہ اور مکہ میں تقریباً ایک ماہ ٹھہرنا پڑا۔ غالب پاشا کا خط کہاں ہے جس کو آپ میری

طرف منسوب کرتے ہیں۔

سوال:۔ محمد میاں کے پاس جواب:۔ محمد میاں کہاں ہے۔

سوال:۔ وہ بھاگ کر حدود افغانستان میں چلا گیا۔

جواب:۔ پھر آپ کو خط کا پتہ کیوں کر چلا

سوال:۔ لوگوں نے دیکھا۔

جواب:۔ آپ ہی فرمایئے۔ کہ غالب پاشا گورنر حجاز اور میں ایک معمولی آدمی۔ میرا وہاں تک کہاں گزر ہوسکتا ہے۔ پھر میں ناواقف شخص۔ نہ زبان ترکی جانوں نہ پہلے سے ترکی حکام سے کوئی ربط ضبط۔ حج سے چند دن پہلے مکہ معظمہ پہونچا۔ اپنے امور دینیہ میں مشغول ہوگیا تھا۔ غالب پاشا حجاز کا اگرچہ گورنر تھا۔ مگر طائف میں رہتا تھا۔ میری وہاں رسائی نہ حج سے پہلے ہوسکتی تھی نہ بعد از حج۔ یہ بالکل غیر معقول بات ہے۔ کسی نے یوں ہی اڑائی ہے

سوال:۔ آپ نے انور پاشا، جمال پاشا سے ملاقات کی۔

جواب:۔ بے شک۔

سوال:۔ کیوں کر۔

جواب:۔ جب وہ مدینہ میں ایک دن کے لئے آئے تھے تو صبح کے وقت انھوں نے مسجد نبوی میں علما کا مجمع کیا۔ مجھ کو بھی مولانا حسین احمد صاحب اور وہاں کے مفتی اس مجمع عام میں لے گئے اور اختتام مجمع پر انھوں نے دونوں وزیروں سے مصافحہ کرا دیا۔

سوال:۔ آپ نے اس مجمع میں کوئی تقریر کی۔

جواب :۔ نہیں۔

سوال :۔ کیوں   جواب :۔ مصلحت نہ سمجھا

سوال :۔ مولوی خلیل احمد صاحب نے تقریر کی۔

جواب :۔ نہیں۔

سوال :۔ مولانا حسین احمد صاحب نے کی۔

جواب :۔ ہاں۔

سوال :۔ پھر انور پاشا نے آپ کو کچھ دیا۔

جواب :۔ اتنا معلوم ہے کہ مکان پر ایک شخص پانچ پانچ پونڈ لیکر انور پاشا کی طرف سے آئے تھے۔

سوال :۔ پھر آپ نے کیا کیا۔

جواب :۔ حسین احمد کو دے دیا تھا۔

سوال :۔ ان کاغذات میں لکھا ہے کہ آپ سلطان ٹرکی، افغانستان، ایران میں اتحاد کرانا چاہتے ہیں اور پھر ایک اجتماعی حملہ ہندوستان پر کرکے ہندوستان میں اسلامی حکومت قائم کرانا چاہتے ہیں اور انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنا چاہتے ہیں۔

جواب :۔ میں تعجب کرتا ہوں کہ آپ کو حکومت کرتے ہوئے اتنے دن گزر چکے کیا آپ گمان کرسکتے ہیں کہ میرے جیسے گمنام شخص کی آواز پاشا ہوں تک پہنچ سکتی ہے اور پھر کیا سالہا سال کی ان کی عداوت میرے جیسا شخص زائل کرسکتا ہے اور پھر اگر زائل بھی ہو جائے تو کیا ان میں ایسی قوت ہے

کہ وہ اپنے ملک کی ضرورتوں سے زائد سمجھ کر ہندوستان کی حدود پر فوجیں پہونچادیں اور اگر پہونچا بھی دیں تو آیا ان میں آپ سے جنگ کی طاقت ہوگی۔

سوال:۔ فرماتے تو آپ سچ ہیں مگر ان کاغذات میں ایسا ہی لکھا ہے۔

جواب:۔ اس سے آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ اس میں کی باتیں کس قدر پایۂ اعتبار رکھتی ہیں۔

سوال:۔ شریف کی نسبت آپ کا کیا خیال ہے۔

جواب:۔ وہ باغی ہے۔

سوال:۔ حافظ احمد صاحب کو آپ جانتے ہیں۔

جواب:۔ خوب وہ میرے استاذزادے ہیں اور بہت سچے اور مخلص دوست ہیں۔

حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہ نے اسیر مالٹا میں سوالات اور جوابات کا سلسلہ اسی حد تک تحریر فرمایا ہے۔ حافظ محمد احمد صاحب کے بعد کے جوابات اور سوالات کو بیان نہیں فرمایا جس کی وجہ سے بعض شک کرنے والوں کو شک ہوا ہے کہ جناب حافظ محمد احمد صاحب نے بھی حکومت برطانیہ کو کچھ خبریں اور رپورٹیں بہم پہونچائیں واللہ اعلم

مالٹا اور اسکے حالات

مالٹا بحرِ روم میں ایک جزیرہ ہے فوجی اعتبار سے خاص اہمیت کا مالک ہے پہلے یہاں ترکوں کا قبضہ تھا بعد میں برطانیہ کا قبضہ ہو گیا۔ اس میں ایک قلعہ پہاڑ کھود کر بنایا گیا تھا اور اس میں مستقل ایک فوج تعینات رہتی تھی۔ جب جنگ عظیم چھڑ گئی تو حکومت برطانیہ

نے اس کو جنگی قیدیوں کے لئے مخصوص کر دیا۔

اس میں مختلف کیمپ تھے۔ روگیٹ کیمپ، سنیٹ کلیمٹ یا جرمن کیمپ بلغاریہ کیمپ، روم کیمپ، عرب کیمپ، دال فرسٹ۔ اس میں ایک چھوٹا سا بازار بھی تھا جہاں ہر قسم کی اشیا ملتی تھیں۔ قیدیوں کے لئے شفاخانے وغیرہ بھی اور اگر اسیروں میں آپس میں کوئی جھگڑا ہو جاتا تھا اس کے لئے پھر علیحدہ ایک جیلخانہ بھی تھا۔

حضرت شیخ الہندؒ اور ان کے رفقا ۲۱ر فروری ۱۹۱۷ء مطابق ۲۹ر ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ کو یہاں داخل ہوئے۔ پہلے آپ کو روگیٹ کیمپ میں رکھا گیا اور اسکے ایک ڈیڑھ مہینہ بعد سنیٹ کلیمت یا جرمن کیمپ میں منتقل کر دیا گیا جہاں آپ کو بڑا کمرہ دیا گیا جس کے دو حصے کر کے سامان رکھنے اور آرام کرنے کے لئے بنا لیا گیا تھا۔

کھانے کا انتظام حضرت شیخ الہند اور آپ کے رفقاء کے کھانے کا انتظام بجز چند ایام کے پورے زمانہ اسارت حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رح کے ہاتھ میں رہا پہلے تو رسد کی صورت میں سامان دیا جاتا تھا بعد میں نقد کی صورت میں ملنا شروع ہو گیا۔ دو وقت کھانا تیار کیا جاتا تھا صبح کو دس بجے کے قریب اور شام کو چار بجے کے قریب اور دن میں کم از کم تین مرتبہ چائے کا دور چلتا تھا۔

یہاں وہی گوشت ملتا تھا جو باہر سے مشنریوں کے ذریعہ ذبح کیا ہوا ہوتا تھا مگر ان سب حضرات نے ان کے لینے سے انکار کر دیا۔ تب اس کے عیوض ان حضرات کو زندہ جانور، پرند وغیرہ خرید کر ذبح کرنے اور کھانے کی اجازت مل گئی چونکہ اس گوشت کی حرمت میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں ہے اس لئے ان حضرات کی تبلیغ اور

کوششوں سے دوسرے مسلمان قیدیوں نے بھی اس کا کھانا ترک کردیا۔[1]

ہندوستان میں کیا ہوا

حضرت شیخ الہندؒ کی گرفتاری اور مالٹا میں محصور ہو جانا کوئی ایسی معمولی بات تو نہیں تھی کہ ہندوستانی چپ ہو کر بیٹھ جاتے۔ جگہ جگہ جلسہ ہوئے۔ حکومت سے احتجاج کیا گیا اور جیسا کہ ہم سابقہ سطور میں عرض کر چکے ہیں ایک انجمن "انجمن اعانت نظربندان اسلام" کے نام سے جناب ڈاکٹر انصاری مرحوم کی زیر قیادت قائم ہوئی اسوقت ہندوستان میں حضرت شیخ الہندؒ کی گرفتاری کا جو رد عمل ہوا اس کو ہم ڈاکٹر انصاری کے الفاظ میں ذکر کرتے ہیں

مولانا کی گرفتاری صفر یا ربیع الاول ۳۵ھ میں ہوئی ہے اور یہ وہ زمانہ تھا کہ ہندوستان کے حجاج واپس آچکے تھے اس لئے بہت دنوں تک تو ہندوستان کے مسلمانوں کو اطلاع ہی نہ ہوئی۔ جب قاہرہ سے مولانا کے ہمراہیوں کے خطوط آئے تو ان کے گھر والوں کو اور ان سے بعض متعلقین کو خبر ہوئی۔ اور پھر آہستہ آہستہ خبر پھیلی گئی اور جس جس جگہ اور جن جن حلقوں میں یہ خبر پہونچی گئی وہ انگشت حیرت بدنداں رہ گئے اور اضطراب و بےچینی پھیلتی گئی اور مسلمانوں نے آئینی حدود کے اندر مولانا کی آزادی کے لئے ہر قسم کی کوشش شروع کر دی (۱) مثلاً اخباروں میں مضامین کا سلسلہ شروع ہوا اور استفسارات، اور...... مطالبات غرض مختلف اقسام کے مضامین لکھے گئے۔ گورنمنٹ کو توجہ دلائی گئی۔ مولانا کے طرز عمل کے متعلق تمام مسلمانوں کا عام اعتماد اور عقیدہ ظاہر کیا گیا۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہوا ہے حسب ذیل

---

[1] راقم الحروف نے اس گوشت کی حرمت پر مدینہ اخبار میں دو قسطوں میں مضمون لکھا ہے۔ حضرت مدنی قدس سرہٗ نے اسیر مالٹا میں بھی یہی تحریر فرمایا ہے۔ انشاء اللہ کتابی صورت میں یہ مضامین شائع ہو جائیں گے۔

مسلم اخباروں نے مولانا کی نظر بندی کے بارے میں مضامین لکھے ہیں۔
صداقت کلکتہ، جمہور کلکتہ، نئی روشنی الہ آباد، مساوات الہ آباد، مشرق گورکھپور، مدینہ بجنور، الخلیل بجنور، ہمدم لکھنؤ، خطیب دہلی، الصباح لاہور
۲۔ وزیر ہند بہادر اور وائسرائے بہادر کی خدمت میں مولانا اور دیگر نظر بندان اسلام کی آزادی کے لئے ہزاروں تار بھیجے گئے۔
۳۔ آنریبل سید رضا علی صاحب نے صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ کی قانونی کونسل کے اجلاس میں حضرت مولانا محمود حسن صاحب کی نظر بندی کے متعلق سوال کیا
۴۔ علمائے دارالعلوم دیوبند کا ایک وفد ۵ر نومبر ۱۹۱۷ء کو سر جیمس مسٹن بہادر لفٹنٹ گورنر صوبہ یوپی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور بیان کیا جاتا ہے کہ لسان الوفد مولانا شبیر احمد صاحب نے ایک تحریر پڑھی جس میں علمائے دارالعلوم دیوبند کی طرف سے دیوبند کے روحانی مربی کی آزادی کے لئے درخواست کی گئی تھی۔ اگرچہ یہ تحریر باوجود وعدۂ اشاعت کے اب تک عام مسلمانوں کے سامنے بے نقاب نہیں ہوئی تاہم ہمیں امید رکھنی چاہیئے کہ انھوں نے تمام ہندوستان کے مسلمانوں اور مولانا کے ہزاروں روحانی فرزندوں یعنی شاگردوں اور مریدوں کے جذبات کی صحیح صحیح ترجمانی کی ہوگی۔ اور مسلمانوں کے اس عام اعتماد کو جو وہ حضرت مولانا کی بے گناہی کے متعلق رکھتے ہیں نمایاں طور پر ظاہر کر دیا ہوگا[1]۔
۵۔ معززین اور حکام رس طبقہ نے سر جیمس مسٹن بہادر سے مولانا کی رہائی کے متعلق خاص طور پر درخواستیں کیں۔

---

[1] شیخ الہند مطبوعہ ۱۹۱۸ء ص ۲۔

درخواست علمائے دیوبند

ڈاکٹر انصاری نے مذکورہ سطور میں علمائے دیوبند کے متعلق شکوک کا اظہار کیا ہے لیکن یہ شکوک صرف شکوک کے درجہ میں ہیں ان کے پیچھے اصلیت بالکل نہیں ہے یہ دیگر بات ہے کہ علمائے دیوبند کا گزشتہ شعار کیا ہے ؟ وہ معاملہ اور یہ معاملہ دونوں علیحدہ علیحدہ ہیں، پہلی صورت میں یکسو رہنا کم از کم اپنے کو دام بلا سے بچا لینا ثابت ہوتا ہے اور یہ صورت اظہار ہمدردی اور دوسرے کو دام بلا سے نجات دلانے کی کوشش ہے اگرچہ چند غیر شعوری یا اضطراری حرکات کی وجہ سے یہ مصائب آئے تھے بہرحال سطور ذیل میں ڈاکٹر انصاری کے شکوک کا جواب موجود ہے۔

ہم علمائے دیوبند کے اس وفد کا حال اختصار کے ساتھ شائع کر چکے تھے جو ۲؍ نومبر ۱۹۱۷ء کو بمقام میرٹھ بحضور لاٹ صاحب بہادر صوبہ متحدہ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ اور جس نے مؤدبانہ حضرت مولانا محمود حسن صاحب مدظلہم و دام فیضہم کے متعلق عرض کیا تھا۔ اور حضور ممدوح نے بکمال تلطف امید افزا جواب دیا تھا۔ ہم یہ بھی ظاہر کر چکے ہیں کہ وفد کے پیش کرنے کی اجازت حاصل کرنے کے لئے کئی ماہ پیشتر سے تحریک جاری تھی۔ مگر حضور ممدوح کو کثرت اشتغال کی وجہ سے قبل از ۲؍ نومبر اجازت حاضری وفد کا موقع نہ ملا۔ اور یہ بھی عرض کر چکے ہیں کہ وفد نے حضور ممدوح کی خدمت میں ایک عرضداشت پیش کی تھی۔ ہم نتیجہ کے منتظر تھے اور اسی وجہ سے وفد کے متعلق صرف بغرض اطلاع اہل اسلام جن کے قلوب حضرت مولانا ممدوح کی نظربندی سے بےچین تھے اتنے ہی اعلان کو کافی سمجھا تھا کہ وفد نے حاضر ہو کر عرض کیا اور حضور ممدوح نے حوصلہ افزا جواب عطا فرمایا اور باوجود تقاضائے

ہمدردان اس تحریر کو شائع نہ کیا تھا لیکن جبکہ باوجود انتظار شدید اب تک نتیجہ
کا ظہور نہیں ہوا۔ ادھر اکثر حضرات ہم سے اس تحریر کی نقل طلب کرتے ہیں اور یہ
ظاہر ہے کہ اس قدر کثرت کے ساتھ نقول کا بھیجنا سہل نہیں ہے۔ اس لئے ہم مناسب
سمجھتے ہیں کہ اس تحریر کو طبع کر کے شائع کر دیا جائے، اس تحریر کو دیکھکر وہ حضرات
بھی اپنا اطمینان فرمالیں۔ جن کو بعض روایات غلط کی بناپر یا بعض اپنے تخیلات
ذاتی کی وجہ سے یہ خیال پیدا ہو رہا ہے کہ وفد علما نے حضرت مولانا کے مجرم ہونیکو
تسلیم کر کے درخواست ترحم پیش کی تھی تحریر خود اپنے مضمون کو بتلاتی ہے اور زبانی
بھی جو کچھ عرض کیا گیا۔ وہ یہی تھا کہ مولانا کی طرف جو خیالات منسوب کئے جاتے ہیں
مولانا کا یہ طریقہ کبھی نہیں ہوا۔ اور اسی کی تائید میں حضرت مولانا حافظ محمد احمد
صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند اس سے قبل ۲۰ر دسمبر سنہ ۱۹۱۶ء کو بمقام لکھنؤ حضرت
مولانا کے قلم کا لکھا ہوا فتوے دکھلا چکے تھے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ تحریراً و تقریراً ادب
حکومت کو ملحوظ رکھکر عرض کیا گیا تھا اور اسی طریقہ کو ہم نے پسند کیا۔

نقل درخواست

بحضور عالی جناب معلی القاب ہز آنر سر جیمس اسکارجی
مسٹن صاحب بہادر کے، سی ایس، آئی
لفٹننٹ گورنر ممالک متحدہ آگرہ و اودھ

حضور والا۔ ہم چند خدام دارالعلوم دیوبند بحیثیت ایک خالص مذہبی جماعت
کی مرکزی نمائندگی کے آج ایک ایسے اہم مسئلہ کی طرف ہز آنر کی توجہ گرامی منعطف
کرانا چاہتے ہیں۔ جو اپنی بعض سیاسی حیثیات سے اگرچہ ہمارے دائرۂ بحث کے اندر
داخل نہ ہو لیکن اس کا وہ مذہبی پہلو جس کا تعلق دارالعلوم سے اور دارالعلوم کی کارکن

جماعت سے اور دارالعلوم کی مدد کرنے والے عام مسلمانوں سے ہے کسی وقت بھی نظر انداز نہیں ہو سکتا۔

حضور والا:۔ ہم اپنی اسی فطری سادگی اور صفائی کی راہ سے (جس نے ایک دور از تکلف مذہب کے سایہ میں تربیت پائی ہے۔ اور جس کو ہز آنر کی مہربانی سے گورنمنٹ کے عمل نے بھی آج تک مرہون ضوابط نہیں بنایا) اس وقت کچھ نہایت مؤدبانہ گذارش کریں گے ممکن ہے کہ وہ حالات حاضرہ پر نظر کرتے ہوئے تھوڑی دیر کے لئے ہز آنر کے یا گورنمنٹ کے بعض دوسرے اعلیٰ حکام کے مزاج کو منغص بنادے۔

لیکن سچ یہ ہے (اور سچ ہی ہم کو ہمیشہ کہنا چاہیئے) کہ حالات حاضرہ ہی وہ چیز ہیں جنھوں نے ہم کو ایک ایسے معاملہ میں دخل دینے کی ہدایت کی ہے جس میں اگر ہم کامیاب ہو جائیں تو ہم سمجھتے ہیں کہ یہ مسلمانان ہند کے واحد مذہبی مرکز کا سب سے بڑا اعزاز اور ہندوستان کی عام پبلک کے حق میں نہایت ہی تسکین و اطمینان کا باعث اور خود حکام گورنمنٹ کے لئے بھی بجائے اس وقتی تکدر کے بڑی حد تک حقیقی راحت و سہولت حاصل ہونے کی ضمانت اور اس کی مدبرانہ حکمت عملی کا جس سے کہ عام اہل اسلام کے قلوب مسخر ہو جائیں ایک گہرا ثبوت ہوگا۔

ہماری جماعت کے محسن شفیق ہز آنر سے یہ امر پوشیدہ نہیں کہ حضرت مولانا محمود حسن صاحب صدر مدرس کی غیر متوقع نظر بندی سے (خواہ وہ گورنمنٹ کے نزدیک کیسی ہی قوی دلائل پر مبنی ہو) دارالعلوم کی اجتماعی حالت کو ایک صدمۂ عظیم برداشت کرنا پڑا ہے اور اب بار بار ان کی رہائی کی امیدیں قائم کرتے رہنے کے بعد دارالعلوم کے دوست اور اس کے کثیر التعداد مستفیدین ان کی طویل مفارقت سے نہایت ہی بےچین اور شکستہ

خاطر ہو کر دارالعلوم کی مرکزی حیثیت اور اس وفد کے سالار قافلہ شمس العلما مولانا مولوی حافظ محمد احمد صاحب کے رسوخ و وجاہت خداداد سے اپنی آخری امید وابستہ کئے ہوئے ہیں جس میں اولاً خدا کی رحمت اور ثانیاً ہز آنر کی عنایات خاصہ ہے توقع ہے کہ وہ مایوس نہ کئے جائیں گے۔

اس بات کے اظہار کی ہم چنداں ضرورت نہیں سمجھتے کہ ہماری جماعت ایک قدامت پسند جماعت ہے جس کو قدرتی طور پر طلب حقوق یا عرض مدعا کے نئے نئے طور و طریق سے جو آج کل مروج ہیں قطعاً مناسبت نہیں۔

پھر نہ تو ہمارے ہم مشرب آنریبل موجود ہیں جو کونسلوں میں ہماری کسی خواہش کے متعلق مسلسل جدوجہد جاری رکھیں اور نہ انگریزی تعلیم نے ہمارے دماغوں کو ایسا منور بنایا ہے کہ اپنی معروضات کو منوانے کے لئے ہم آئرلینڈ یا کم از کم نیشنل کانگریس کی کورانہ تقلید میں آئینی ایجیٹیشن برپا کرنے لگیں جس کو ہم اپنی کمزوری کی وجہ سے ادب حکومت کے متعلق سخت ناعاقبت اندیشی سے تعبیر کرتے ہیں۔

ہم کو بلاشبہ خیر خواہانہ مشورہ دیا گیا تھا کہ قانون کے حدود میں رہ کر یہی شور و غل مچاؤ تو تمہارے نظر بند بھی مسز اینی بسنٹ کی طرح آزاد کر دیئے جائیں گے لیکن خواہ ہم کو کوئی خوشامدی اور ڈرپوک کہے یا دور اندیش اور سمجھدار ہم نے یہی کہا کہ اول تو عام نظر بندوں کے معاملہ میں مسز اینی بسنٹ کی نظیر ہماری پوری رہنمائی نہیں کرتی۔ دوسرے اگر ہم چند تیز رزولیوشن پاس کر کے اور دو چار تار حضور وائسرائے بہادر اور سکریٹری آف اسٹیٹ کی خدمت میں بھیجکر غوغائے عام میں شریک بھی ہو جائیں تو اس کا نتیجہ اس کے سوا کیا ہونا ہے کہ ہم اپنے خاموش مسلک پر ثابت قدم رہنے سے جو کچھ فائدہ حاصل

کر سکتے تھے اس کو بھی ہاتھ سے کھو بیٹھیں۔

حضور والا۔ یہ نکتہ خاص طور پر ہزآنر جیسے بیدار مغز حاکم کی توجہ کے قابل ہے کہ مسز اینی بسنٹ کے واقعہ سے جو یورپین ایسوسی ایشن کے ذہین ارکان کو یہ خیال پھیل جانے کا اندیشہ پیدا ہوا ہے کہ گورنمنٹ کے دربار میں بے ادب شور و غل مچانے اور ایجیٹیشن برپا کرنے والے بہ نسبت مہذب اعتدال پسندوں کے زیادہ کامیاب ہوتے ہیں۔ اگر یہ اندیشہ کسی درجہ میں وزن رکھتا ہے تو اس کی تلافی کا طریقہ بھی غالباً اس سے بہتر اس وقت کوئی نہ ہوگا۔ کہ گورنمنٹ ایک بالکل خاموش اور سیاسیات سے محض بیگانہ جماعت کی استدعا پر حضرت مولانا محمود حسن صاحب کو فوری آزادی مرحمت فرما کر ہماری کل جماعت، بلکہ کل اسلامی پبلک کے قلوب سے خراج منت پذیری واحسان شناسی وصول کرے اور اپنے اس طریق عمل سے عام طور پر ثابت کر دے کہ خاموش امن پسند بھی اگیٹیٹروں سے زیادہ کامیاب ہو سکتے ہیں۔

حضور والا۔ تیس چالیس برس کے کامل تجربہ کے بعد ہم کو یہ کہنے میں ذرا بھی پس و پیش نہیں کہ حضرت مولانا محمود حسن صاحب ساری عمر تمام جماعت دیوبندی کی طرح سیاسی انجمنوں سے الگ تھلگ رہے۔ نہ تو وہ کوئی وطن پرست آدمی ہیں اور نہ قوم پرست بلکہ ایک سچے خدا پرست انسان ہیں اور انسان جب تک انسان ہے سہو و نسیان اور غلط فہمی کا شکار ہو سکتا ہے لیکن ایک پاکباز انسان بدنیت نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے ہمارے واسطے اپنے سابق چہل سالہ تجربہ اور حضرت مولانا کے قلم کی لکھی ہوئی بعض تحریروں پر نظر کرتے ہوئے گورنمنٹ صوبہ جات متحدہ کا یہ اعلان کہ تحریری اور دوسری قسم کی شہادت سے ثابت ہوتا ہے کہ مولانا محمود حسن صاحب نے ہز مجسٹی ملک معظم کے دشمنوں کو ان کی فوجی

تجاویز میں مدد دی" اگرچہ نہایت ہی حیرت انگیز اور رنجدہ ہے لیکن جبکہ ان تحریری اور دوسری قسم کی شہادتوں سے واقف ہوئے اور ان کے پرکھنے کا ہمارے لئے کوئی موقع نہیں ہے تو ہم راستہ کو مختصر کرنے کے لئے صرف اسی قدر گذارش کرنا چاہتے ہیں کہ اگر حضرت مولانا ممدوح کی آواز گورنمنٹ کے کانوں میں چند سیاسی لوگوں کی آواز کے ساتھ ملتبس ہوکر پہونچی ہے تب بھی وہ ازراہ کرم گستری و رعایا نوازی ایک ایسی شخصیت کے آزاد کرنے میں دریغ نہ کرے جس کی آزادی سے ایک عظیم الشان جماعت اسلام کے جذبات اسیر احسان ہو جائیں گے۔ اور دارالعلوم کے در و دیوار میں سے عمیق شکرگزاری کا ایک ایسا ابلتا ہوا جوش نظر آئیگا جو شاید اس سے پہلے کبھی نظر نہ آیا ہو۔

ہم کو ہز آنر کے ان وسیع اخلاق والطاف سے جو آج تک ہماری جماعت کی نسبت کام فرمائے گئے ہیں کامل یقین ہے کہ ہماری یہ عرضداشت بے اثر نہیں جائے گی اور ہز آنر کوئی ممکن مہربانی اس معاملہ میں اٹھا کر نہیں رکھیں گے۔

آخیر میں ہم سمع خراشی کی معافی چاہتے ہوئے دعائے کامیابی و فلاح پر اس ناچیز تحریر کو ختم کرتے ہیں۔

ہم ہیں آپ کے صادق خیر اندیش اور وفا کیش

علمائے دیوبند

۶ نومبر ۱۹۱۷ء

قانونی کونسل میں اعتراض و جواب

انجمن اعانت نظر بندان اسلام کے مساعی اور اخباروں کے لکھنے اور

جگہ جگہ احتجاجی جلسوں کا یہ اثر ہوا کہ آنریبل سید علی رضا نے یوپی کی قانونی کونسل میں حضرت شیخ الہند رحؒ کی گرفتاری کے متعلق سوال کیا تو حکومت کی جانب سے جواب دیا گیا۔

> مولانا محمود حسن صاحب، اس وقت مالٹا میں ایک جنگی قیدی کی حیثیت سے اسیران جنگ کے کیمپ میں جس کا نام افضل خاں کیمپ ہے رکھے گئے ہیں۔ صوبہ متحدہ کی گورنمنٹ کو خبر ملی ہے کہ مولانا کی گرفتاری ہندوستان کے حدود کے باہر عمل میں آئی ہے۔ کیونکہ تحریر اور دیگر اقسام کی شہادتوں سے صاف پایا جاتا ہے کہ انھوں نے ہز مجسٹی ملک معظم کے دشمنوں کو ان کی فوجی تجاویز میں مدد دی ہے۔[1]

لیکن اس کے خلاف دیوبند کے وفد کو جو جواب دیا گیا تھا اس میں حکومت نے کہا تھا۔

> میں اس مجلس میں جو کچھ کہوں گا صاف اور صحیح کہوں گا مجھ سے میرے خاص دوستوں نے اس بارے میں کہا لیکن میں نے ان سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ مولانا کی نظر بندی ہمارے یہاں اور ہمارے حکم سے نہیں ہوئی شریف نے گرفتار کر کے ہمارے حوالہ کیا ہے وہاں کوئی بات ہوئی ہوگی۔[2]

حکومت کے ان دونوں بیانوں میں زیادہ تعارض نہیں ہے۔ ہمارا مقصد ان چیزوں کو نقل کرنے سے یہ ہے کہ حضرت شیخ الہند رحؒ کی رہائی کے عوامل صاف طور ظاہر ہو جائیں۔

---

[1] شیخ الہند مطبوعہ ۱۹۱۸ء ص [2] الخلیل بجنور ۲۴ر فروری ۱۹۱۸ء۔

رہائی ۔ اور ہندوستان میں آمد

مسٹر برن مالٹا میں

ہندوستان میں حضرت شیخ الہندؒ کی رہائی کے متعلق ان کوششوں اور حضرتؒ کی اہلیہ محترمہ کی درخواست کے دو تین مہینہ کے بعد فروری ۱۹۱۸ء میں مسٹر برن مالٹا پہونچے۔ یہ حکومت یوپی میں سکریٹری تھے۔ اور لندن جارہے تھے۔ یہاں بھی ٹھہرے اور اسراء ہندوستان سے ملاقات کی اور سوالات کئے۔ اس کے بعد انگلستان چلے گئے۔ وہاں سرکاری سطح پر کچھ بات چیت ہوئی ہوگی۔

اس کے بعد یہ تو ہوا کہ حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ نہایت عزت کا برتاؤ کیا جانے لگا اور وہ تمام رعائتیں حاصل ہوگئیں جو ایک فوجی کرنل کو حاصل تھیں۔

حضرت شیخ الہندؒ کی رہائی

جنگ ختم ہوچکی تھی اس لئے جن اسباب کے تحت جنگی قیدیوں کو گرفتار کیا تھا وہ باقی نہ رہے اس لئے آزاد کرنا شروع کردیا۔ حضرت شیخ الہندؒ بھی ایک جنگی قیدی تھے۔ کیونکہ وہ حکومت کا تختہ لوٹنا چاہتے تھے۔ مگر چونکہ ثبوت پورا نہیں فراہم ہوسکا تھا اس لئے حکومت کی طرف سے ان کے چھوڑنے کے احکامات جاری ہوگئے۔ چنانچہ رہائی سے آٹھ دس دن پیشتر آپ کو اطلاع دیدی گئی۔ جس دن روانگی ہونیوالی تھی۔ اس دن آپ کو الوداع کہنے کے لئے تمام آفیسران اور ترکی کے جنگی قیدی (جو

بڑے عہدیدار تھے) موجود تھے اور مسلمان افسر تو آپ کی جدائی کی وجہ سے آبدیدہ تھے ہی لیکن انگریز افسر بھی دم بخود تھے احترام میں سب کی گردنیں جھکی ہوئی تھیں۔

بہرحال آپ کا جہاز ۲۲ر جمادی الثانی ۱۳۳۸ھ مطابق ۱۲ر مارچ ۱۹۲۰ء کو مالٹا سے روانہ ہوا۔ ۱۵ر مارچ ۱۹۲۰ء کو آپ اسکندریہ پہونچے۔ تقریباً اٹھارہ روز یہاں قیام رہا۔ ۱۳ر رجب ۱۳۳۸ھ مطابق ۲ر اپریل ۱۹۲۰ء کو وہاں سے روانگی ہوئی۔ وہاں سے سوئیز آئے اور ۵ر رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ مطابق ۲۲ر مئی ۱۹۲۰ء کو سوئیز سے روانگی ہوئی۔ ۱۲ر رمضان المبارک کو عدن۔ اور وہاں سے ۲۰ر رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ مطابق جون ۱۹۲۰ء کو آپ بمبئی تشریف لائے۔ اس طرح تقریباً تین سال یا اس سے کچھ اوپر ہندوستان کی بہار اور اس کی عظمت کا نشان پھر ہندوستان میں واپس آگیا۔

بمبئی سے دیوبند تک

جیسے ہی جہاز بمبئی کے بندرگاہ پر پہونچا ویسے ہی سی، آئی، ڈی کے دو افسر حضرت کے پاس آئے اور تنہائی میں کچھ کہا۔ ان کے بعد حکومت کے فرستادہ مولوی رحیم بخش صاحب آئے (جو حکومت کی طرف سے تالیف قلب کے لئے مقرر ہوئے تھے) حضرت نے ان کو صاف جواب دیدیا۔ ادھر بندرگاہ پر ہندوستان کے مشاہیر جمع تھے مثلاً حضرت مولانا شوکت علی اور خلافت کمیٹی کے ہزاروں اراکین موجود تھے۔ نعرۂ تکبیر کے فلک شگاف نعرے سے فضا گونج اٹھی۔ حضرت شیخ الہند زندہ باد کے نعروں سے فضا میں لرزہ پیدا کردیا۔

دیوبند اور دوسرے اطراف سے بھی بہت سے حضرات آئے تھے۔ مثلاً حافظ محمد احمد صاحب، مہتمم دارالعلوم دیوبند مع صاحبزادگان حضرت مولانا حکیم احمد حسن صاحب

برادر حضرت شیخ الہندؒ، حضرت مولانا محمد حنیف صاحب داماد حضرت شیخ الہندؒ حضرت حکیم عبدالرزاق صاحب، ڈاکٹر انصاری صاحب وغیرہ۔

بمبئی دو دن قیام رہا اور یہاں خلافت کمیٹی کی طرف سے ایک جلسہ کیا گیا جس میں حضرت شیخ الہندؒ کو سپاسنامہ پیش کیا گیا۔ اس دو روزہ قیام میں مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی اور جناب مہاتما گاندھی جی بھی تشریف لائے۔ اور سیاست حاضرہ پر تنہائی میں بات چیت ہوئی۔ اس کے بعد حضرت شیخ الہندؒ دہلی کے لئے روانہ ہوگئے یہاں ڈاکٹر انصاری صاحب مرحوم کے یہاں ایک دن قیام فرمایا اور ۲۶ رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ مطابق ۱۴ جون ۱۹۲۰ء کو صبح نو بجے دیوبند پہونچے۔ راستے میں ہر اسٹیشن پر بے پناہ ہجوم تھا خصوصاً میرٹھ، مظفر نگر، دیوبند میں تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انسانوں کا سمندر بہہ رہا ہے۔

مختلف اسفار اور وصال

اکوڑہ جہان آباد وغیرہ

چونکہ حکیم نصرت حسین صاحب کا انتقال مالٹا میں ہوچکا تھا گھر پر ان کی بیوہ اور والدہ محترمہ نہایت پریشان تھیں ان کی دلداری کے لئے جانا ضرور تھا اس لئے وہاں تشریف لے گئے حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی ساتھ تھے۔ الٰہ آباد، غازی پور، لکھنؤ وغیرہ بھی تشریف لے گئے۔ لکھنؤ میں حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے یہاں قیام ہوا۔ اگرچہ آپ تقریر کے عادی نہ تھے لیکن عوام کا یہ عالم تھا کہ پروانہ وار فدا ہو رہے تھے۔ خلافت کمیٹی نے آپ کے لئے شیخ الہند رح کا خطاب تجویز کیا۔ یہ اتنا مقبول ہوا کہ جزو اسم بن گیا۔ بلکہ اسمیت پر غالب آگیا۔ تمام مقامات پر حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی نے تحریک خلافت کی تائید میں تقریریں فرمائیں جس سے تحریک میں جان پڑ گئی اور ہندوستانی تازہ دم ہو کر نہایت جوش کے ساتھ تحریک آزادی میں حصہ لینے لگے۔

مراد آباد میں آمد

وہاں سے واپسی پر آپ مراد آباد بھی تشریف لے گئے۔ حکیم محمد صدیق صاحب (جو حضرت نانوتوی رح کے شاگرد اور آپ کے ہم سبق تھے) ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ ان کے لڑکے حاجی عبدالباری صاحب تھے۔ عادت کے مطابق ان کے یہاں جا کر مقیم ہوئے۔ شوکت باغ میں چائے کی دعوت پر تشریف لائے۔ یہاں اور دوسرے حضرات بھی مدعو تھے۔ مثلاً مولانا مرتضیٰ حسن صاحب

مولانا عزیر گل صاحب، معظم علی خاں صاحب بیرسٹر، مسعود الحسن صاحب بیرسٹر حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ ہیں حضرت مولانا مرتضےٰ الحسن صاحب کا وہ واقعہ پیش آیا تھا جس کا ذکر ہم گرفتاری کے عنوان کے تحت کر چکے ہیں۔

امروہہ میں آمد

حافظ زاہد حسین صاحب امروہوی مدرسہ عربیہ جامع مسجد امروہہ کے مہتمم اور حضرت شیخ الہندؒ کے خاص لوگوں میں سے ہیں۔ موصوف کو اپنے مدرسہ کا جلسہ کرنا تھا اس لئے انھوں نے حضرت شیخ الہندؒ کی خدمت میں دعوت نامہ بھیجا اور غالباً خود بھی تشریف لے گئے۔ چنانچہ حضرت شیخ الہندؒ ۹ رجون ۱۹۲۰ء کو امروہہ تشریف لے گئے اور وہاں کے جلسہ میں شرکت فرمائی۔[۱]

علیگڑھ کا سفر

تحریک خلافت کا زور تھا حضرت شیخ الہندؒ سے علیگڑھ کے طلبا نے ترک موالات پر ایک فتویٰ حاصل کیا تھا جو کہ اجلاس عام میں پڑھ کر بھی سنایا گیا تھا۔[۲] آپ یہاں کے لوگوں کے اصرار پر علیگڑھ تشریف لائے اور ایک آزاد قومی یونیورسٹی کی بنیاد ڈالی۔ علیگڑھ میں عبدالمجید خواجہ کی کوٹھی پر قیام ہوا۔ باوجودیکہ آپ بیمار تھے لیکن یہ فرماتے ہوئے آپ نے اجلاس میں شرکت کی۔

اگر میری صدارت سے انگریز کو تکلیف ہوگی تو میں اس میں ضرور شریک ہونگا۔[۳]

کلکتہ اور بجنور

آخری ستمبر ۱۹۲۰ء کے لئے کلکتہ میں خلافت کے اجلاس کا اعلان ہوا تھا کہ اس کی صدارت حضرت شیخ الہندؒ فرمائیں گے۔[۴] اسی کے مقدم موخر بجنور بھی تشریف لانے کی خبر تھی مگر آپ ان دونوں مقامات پر تشریف نہ لا سکے۔ البتہ کلکتہ کانفرنس کے لئے آپ نے ایک پیغام ارسال فرمادیا تھا جو آئندہ سطور

---

[۱] مدینہ ۱۳ رجون ۱۹۲۰ء [۲] یہ فتویٰ آئندہ سطور میں ملاحظہ فرمائیں [۳] نقش حیات۔ یہ واقعہ ۲۹ راکتوبر ۱۹۲۰ء کا ہے [۴] مدینہ یکم ستمبر ۱۹۲۰ء۔

میں پیش کیا جائے گا۔

دہلی کا سفر علیگڑھ سے فارغ ہو کر آپ دہلی تشریف لائے اور یہاں ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی پر قیام فرمایا۔ بیمار پہلے ہی سے تھے۔ اسفار کی وجہ سے تکلیف اور زیادہ بڑھ گئی۔ اسی دوران جمعیۃ العلما کا اجلاس آپ کی زیر صدارت ہوا۔ لیکن آپ اجلاس میں شرکت نہ کر سکے آپکی طرف سے جو خطبہ صدارت پڑھا گیا اس کو ہم آئندہ سطور میں پیش کریں گے۔

وصال ۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۰ء کو علیگڑھ میں جو جلسہ ہوا تھا اسی وقت سے حضرت کی بیماری میں شدت ہو گئی تھی۔ اسی حالت میں دہلی کا سفر اختیار کیا یہاں آکر مرض اور بڑھ گیا۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم نے نہایت توجہ سے علاج کیا مگر مرض موت کا کچھ علاج نہیں۔

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

حالت مرض میں حضرت کی استغراقی کیفیت بڑھ گئی تھی۔ بات بہت کم کرتے تھے۔ ہر وقت زبان پر ذکر جاری رہتا تھا۔ ۳۰ر نومبر ۱۹۲۰ء کو حالت اور بھی زیادہ ابتر ہو گئی حضرت نے اسی حالت میں آنکھ کر فرمایا۔

> مرنے کا تو کچھ افسوس نہیں ہے مگر افسوس یہ ہے کہ میں بستر پر مر رہا ہوں تمنا تو یہ تھی کہ میں میدان جہاد میں ہوتا اور اعلائے کلمۃ الحق کے جرم میں میرے ٹکڑے کئے جاتے۔

اس کے بعد بلند آواز سے اللہ اللہ سات مرتبہ کہا آٹھویں مرتبہ آواز بند ہو گئی دیکھا تو زبان تالوے سے لگی تھی۔ سورہ یٰسین شریف پڑھی گئی۔ سورت کے ختم ہونے

سے پیشتر ہی آپ نے اپنے جسم کو خود بخود سیدھا کر لیا اور جان. جان آفریں کے سپرد کر دی

انا للہ وانا الیہ راجعون ۵

دہلی سے دیو بند آپ کا جنازہ لایا گیا. ایک مرتبہ دہلی میں نماز جنازہ ہوئی اور اس کے بعد ہر اسٹیشن پر جنازے کی نماز ہوئی. آخری نماز دیو بند ہوئی. اور بالآخر آپ کا جسد خاکی دار العلوم دیو بند کے قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا آج بھی آپ وہیں آرام فرما ہیں.

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

حضرت شیخ الہندؒ کے وصال کے بعد

حضرت شیخ الہندؒ کے وصال کے بعد عالم اسلام میں ایک کہرام مچ گیا. جلسہ، جلوس، مجالس ایصال ثواب، مرثیے، تاریخیں بیانات، تار ہائے برقی. غرضکہ جس طرح اور جس صورت سے بھی بن پڑا. عوام، خواص، مسلم، غیر مسلم، ہندی، غیر ہندی سب نے اپنے محبوب قائد کو خراج عقیدت پیش کیا. اس وقت اخبارات، رسائل میں جو کچھ شائع ہوا. تمام کو اس جگہ نہ پیش کیا جا سکتا ہے اور نہ اس کی ضرورت ہے البتہ نمونتہً پیش کر دینے میں تذکرہ اور سوانح کا ایک عنوان پورا ہو جاتا ہے اسلئے چند اقتباسات مدینہ اخبار بجنور ۲۰ و ۶ ۱۹۲۱ء سے پیش کرتا ہوں۔

شاہ افغانستان

حضرت شیخ الہندؒ کے وصال کی خبر سنکر سرکاری دفاتر بند کر دیئے گئے اور شہروں میں سلسلہ کاروبار منقطع کر دیا گیا. باغ بابر (کابل) میں شاہ افغانستان کی طرف سے مجلس ایصال ثواب کا انتظام کیا گیا تھا. جہاں لوگ جوق در جوق چاروں طرف سے سمٹے ہوئے چلے آرہے تھے. بادشاہ نے خود بہ نفس نفیس اس مجلس میں شرکت فرمائی اور تمام لوگوں کے ساتھ ایصال ثواب کی مجلس میں بیٹھ کر فاتحہ خوانی میں شرکت کی. اختتام مجلس پر ارشاد فرمایا.

مولانائے ما شیخ الہند مرحوم یک نفر ہمارے مولانا حضرت شیخ الہندؒ مرحوم

ہند بودند کہ گل شدہ مگر من امید
دارم کہ خداوند تعالی بعوض یک نور
صدہا نور را در آنجا خواہد افروخت
اگرچہ مناسب ہمیں است کہ کسے از
خدام شاں درینوقت فاتحہ مرحوم
را بگیرد مگر من بہتر میشارم کہ خودم
فی الحال فاتحہ بگیرم۔ امروز من در
مجلس الم شریک برادران ہندی خود
شدہ ام مگر از درگاہ الہی امید قوی
دارم کہ یک روز در محفل شادی شاں
نیز شامل خواہم شد

ہندوستان کا ایک نور تھے جو گل ہو گیا
مگر میں خداوند تعالی سے امید رکھتا
ہوں کہ اس ایک نور کے عیوض اس
جگہ سیکڑوں نور روشن کریگا۔ اگرچہ
مناسب یہی ہے کہ حضرت کے خدام میں
سے کوئی ایصال ثواب کرے مگر
فی الحال میں بہتر سمجھتا ہوں کہ خود
ایصال ثواب کراؤں۔ آج میں ہندوستانی
بھائیوں کی مجلس غم میں شریک ہوا
ہوں مگر اللہ تعالی سے قوی امید ہے
کہ ایک دن ان کی خوشی کی مجلس میں
بھی شریک ہوں گا۔

اس کے بعد حضرت مولانا عبید اللہ سندھی نے شاہی خراج عقیدت کے جواب میں فرمایا۔

مولانا سندھی کا جواب

مولانائے مرحوم

یک عالم بودند در زہد و تقوی و فقر
و علم بسیار علما در ہند ہم پلہ شاں در
ہند خواہند بود مگر ہندوستان کہ
جناب شاں را شیخ الہند خواندہ سبب

ہمارے مولانا مرحوم ایک عالم تھے زہد
تقوی و فقر و علم میں ان کے ہم پلہ، بہت
سے علما ہندوستان میں ہیں مگر
ہندوستان صرف ان ہی کو شیخ الہند
کہتا ہے اس کا سبب یہی ہے وہ ایک
اسلامی خصوصیت کے حامل تھے

آں ہیں بود کہ ایشاں یک روخصوصیت	اور اپنے نصب العین پر مرتے دم تک
اسلامی داشتند و بر نصب العین خود	قائم رہے۔ میں اللہ تعالیٰ سے امید
تا دم مرگ ایستادند من از خداوند کریم	رکھتا ہوں کہ مرحوم کا جو مقصد تھا
امید دارم کہ کار و مقصد اسلامی کہ جناب	وہ آنجناب اعلیٰ حضرت غازی کے
شاں پیش نظر خود را داشتند از دست	ہاتھ سے تکمیل کو پہونچے گا۔
اعلیٰ حضرت غازی بہ تکمیل خواہد رسید	

ان کے بعد وزیر اعظم نے چند کلمات ترکی زبان میں بیان فرمائے۔

خلافت کانفرنس کی تجویز

خلافت کانفرنس منعقدہ ۳۱ر دسمبر ۱۹۲۰ء کا تعزیتی رزولیوشن اللہ اکبر کے نعروں کے ساتھ بالاتفاق منظور کیا گیا جس میں حضرت شیخ الہندؒ کی ذات ستودہ صفات سے گہری عقیدت کا اظہار تھا۔

آل انڈیا مسلم لیگ

آل انڈیا مسلم لیگ حضرت شیخ الہندؒ مولانا محمود حسن صاحب کی وفات حسرت آیات پر اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کرتی ہے جن کی بیغرضانہ خدمات اسلامی و ملکی قربانیوں نے تمام قوم میں انکو ہر دلعزیز بنا دیا تھا۔ تاریخ اسلام کے نازک ترین وقت میں آپ کا بے خوف اور صاف صاف اسلامی شریعت کا اظہار آپ کا مالٹا کی دور دراز اسیری میں جو نہ سب کے لئے ہوئی تھی آپ کا صبر و استقلال، مصیبتیں برداشت کرنا، آپ کی مخلصانہ اور منکسرانہ زندگی مسلمانان ہند کے لئے ایک بیش بہا دراثت ہے۔ مسلم لیگ حضرت مولانا مرحوم کے خاندان سے اس غم میں دلی ہمدردی کا اظہار کرتی ہے اور خدا سے دعا کرتی ہے کہ مولانا کے مدارج

اعلیٰ میں ترقی عطا فرمائے۔

ہندوستان کے طلبا ہندوستان کے تمام کالجوں کے طلبا کی کانفرنس ناگپور میں جو لالہ لاجپت رائے کی صدارت میں منعقد ہوئی تھی۔ اس میں یہ رزولیوشن پاس ہوا۔

یہ کانفرنس حضرت مولانا محمود حسن صاحب شیخ الہندؒ مرحوم کی وفات حسرت آیات پر اپنے نہایت گہرے درد و غم کا اظہار کرتی ہے۔ مولانا ممدوح کی شاندار اسلامی خدمات اور ہندو مسلم اتحاد کی کوششیں ہندوستان کے نوجوانوں کے لئے اس کانفرنس کی رائے میں سرمایہ ہدایت ہوں گی۔

مسلم لیگ کا خطبۂ صدارت ڈاکٹر انصاری مرحوم نے آل انڈیا مسلم لیگ کا خطبہ صدارت پڑھتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

حضرت شیخ الہندؒ کی وفات نے مسلمانان ہند کو نہایت افسردہ کر دیا ہے سارے ہندوستان میں کسی ایک مسلمان کا گھر بھی ایسا نہ ہوگا جہاں اس حامل شریعت حقہ کی مفارقت دائمی کا ماتم نہ کیا گیا ہو۔ کون نہیں جانتا کہ حضرت ممدوح کی زندگی تقویٰ، اطاعت الٰہی مذہبی سادگی اور روحانیت کے اعتبار سے کیسی عدیم المثال تھی آپ عہد حاضر کے سب سے بڑے محدث اور اسوہ حسنہ پیغمبری کے عالم باعمل تھے۔ آپ کے درس کی شہرتیں دنیا کے مختلف اسلامی ممالک سے طالبان علم کو لاتی تھیں۔ اور حلقہ تدریس میں شامل کرتی تھیں۔ آپ کے تلامذہ اور شاگرد ہزاروں کی تعداد میں شمار کئے جاتے ہیں۔ مولانائے مغفور کا اپنی جلاوطنی اور مالٹا کی نظر بندی میں مذہب کے لئے مصائب جھیلنا ۵، برس کے سن میں تکالیف

اور صعوبتوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کرنا اور سب سے زیادہ مرحوم کی وہ
ناقابل فتح قوت ارادی اور آپ کا غیر متزلزل ایمان بالحق یہ تمام خصوصیات
ایک عظیم الشان وراثت ہیں جو حضرت اقدس مسلمانان ہند کیلئے چھوڑ گئے ہیں۔[1]

جلال آباد افغانستان یہاں بھی حضرت شیخ الہندؒ کے ایصال ثواب کیلئے ایک مجلس سپہ سالار افغانستان کی زیر صدارت
منعقد ہوئی جس میں سپہ سالار موصوف نے گہرے رنج وغم کا اظہار کیا اور حضرت
شیخ الہندؒ کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا وہ پوری کارروائی افغانستان کے اخبار
اتحاد مشرقی میں شائع ہوئی ہے جس کو مدینہ بجنور نے خبر کے طور پر شائع کیا تھا۔

اتحاد مشرقی کا اداریہ

بیچارہ اتحاد مشرقی
درمقام تحیر سرگرداں و در تفکر مثالی
پابند احزان است کہ آیا صورت ایں
واقعہ غم اندوز دکیفیت ایں حادثہ
جگر سوز چہ گونہ و بکدام قوت در
قید اشاعت آرد؟ آہ صد افسوس
کہ بندۂ خاص و عاشق تعالیٰ یزدانی
شیدائے سنیت سنیۂ محمدی گوہر شب
چراغ عالم اسلام۔ مقتدائے وعلمائے

بے چارہ اتحاد مشرقی مقام تحیر میں پریشان
ہے اور تفکر مثالی میں پابند غم ہے کہ
اس واقعہ غم اندوز اور حادثہ جگر سوز
کی خبر کو کس طاقت سے قوت اشاعت
میں لائے۔ آہ صد افسوس ایک بندۂ
خاص اور اللہ تعالیٰ کی ملاقات کا عاشق
اور حضور صلعم کی سنت شریفہ کا عالم اسلام
کا روشن چراغ مسلمانوں کا مقتدا
اور علما اور علمائے اعلام کا رہنما
قرون ماضی کا نمونہ راست بازی کا مرکز

---

[1] مدینہ یکم جنوری ۱۹۲۱ء

مسلمین و علمائے اعلام انموذج قرون
ماضی مرکز اعظم راست بازی ستون مستحکم
اخلاص و حمیت و پیکر مجسم فروتنی و محبت
یعنی عالم یگانۂ روزگار متبع سنت و
شریعت سید الابرار استاذ اساتذہ
الکرام شیخ الہند والاسلام واقف اسرار
جلی و خفی حضرتنا و مولانا الحاج محمود الحسن
دیوبندی رحمۃ اللہ الباری وجود مسعود
کہ حب الوطنی در خمیر شاں مخمر و صلاح
و فلاح ملک و ملت در ضمیر منیر شاں مضمر
بودہ، دریں زماں ایشاں در جسد
عالم اسلام از تقاریر پر تاثیر خود یک
روح تازہ پروردند الخ

اعظم اور اخلاص و حمیت کا مضبوط
ستون عاجزی اور محبت کا پیکر
مجسم یعنی عالم یگانۂ روزگار اور سید
الابرار صلعم کی شریعت و سنت کا
متبع استاذ الاساتذہ شیخ الہند اور
شیخ الاسلام جو اسرار خفی اور جلی کے
واقف کار تھے یعنی ہمارے حضرت مولانا
محمود حسن صاحب دیوبندی اللہ تعالیٰ
کی ان پر رحمت ہو۔ ان کے وجود مسعود کے
خمیر میں حب الوطنی .... مخمر تھی اور
ملک و ملت کی صلاح و فلاح ان کے
روشن ضمیر میں پوشیدہ تھی۔ اس زمانہ میں
وہ عالم اسلام کے جسم میں اپنی پر تاثیر
تقریروں کے ذریعہ تازہ روح پرورش کر رہے تھے۔[1]

یہ اداریہ کافی طویل ہے۔ فارسی عبارت میں جس شان و شوکت سے خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے وہ فارسی ادب کا شاہکار ہے افسوس کہ ترجمہ اس خوبی کو ظاہر کرنے سے قاصر ہے۔

---

[1] مدینہ ۲۵ر دسمبر سنہ ۲۳ء۔

شکارپور سندھ ۱۱ر دسمبر ۲۰ء کو شکارپور سندھ میں ایک جلسہ تعزیت منعقد ہوا جس میں مندرجہ ذیل رزولیوشن منظور کیا گیا۔

یہ جلسہ حضرت شیخ الہندؒ کی رحلت پر اپنے دلی افسوس کا اظہار کرتا ہے اور حضرت مولانا کی خدمات جلیلہ کا اعتراف کرتے ہوئے مولانا مرحوم کی اس ناگاہ موت کو ناقابل تلافی نقصان تصور کرتا ہے اور مولانا محدث دیوبندی کے پس ماندگان اور عزیزوں سے اظہار ہمدردی کرتا ہے۔

اس جلسہ کے بعد حضرت کی یادگار کے طور پر ایک مدرسہ محمودیہ قائم کیا گیا اور ساتھ ہی یہ اعلان بھی کیا گیا کہ اس مدرسہ میں علم معقول و منقول مذہب و سیاست بزبان عربی فارسی، اردو، انگریزی پڑھائی جائے گی۔ اس مدرسہ میں ہر ایک مذہب کا پیرو پڑھ سکے گا کسی سے فیس نہ لی جائے گی[۱]

حضرت تھانویؒ حضرت مولانا محمود حسن صاحبؒ کی عجیب ہی ذات تھی مدعیان محبت نے تو مولانا کو پہچانا ہی نہیں اور اسی نہ پہچاننے کی وجہ سے بڑے بڑے لوگ جو قبروں میں پیر لٹکائے بیٹھے ہیں اور ثقہ ہیں وہ شیخ العالم کو شیخ الہندؒ کہتے ہیں ہمارے اعتقاد میں وہ شیخ الہند والسند والعرب و العجم تھے[۲] حضرت تھانوی نے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

حقیر بے بضاعت کا اعتقاد وہی ہے جو مخدوم العالم شیخنا و شیخ الکل استاذی مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہٗ العزیز مخلوق کو ارشاد فرما گئے ہیں وہ ہمارے اعتقاد میں تو نصوص قرآن عزیز سے مستفاد ہیں[۳]

---

[۱] مدینہ ۲۱ر دسمبر ۲۰ء [۲] افاضات الیومیہ ص ۱۴۲ ج ۵

رنگون میں اظہار غم | رنگون میں ۱۳ر دسمبر ۲۰ء کو اظہار غم کے طور پر ہڑتال عام ہوئی۔ اور نماز جمعہ کے بعد نذیریہ اسکول میں ایک جلسہ عام زیر صدارت مولانا مفتی احمد بزرگ صاحب ہوا۔ جس میں حضرت مرحوم کے حالات لوگوں کو سنائے گئے اور عصر کی نماز کے بعد سورتی جامع مسجد میں ایک بڑی جماعت نے قرآن خوانی کر کے ایصال ثواب اور دعائے مغفرت کی۔

ویلور میں جلسہ | عصر کی نماز کے بعد میدان قلعہ میں حضرت قدس سرہٗ کی وفات حسرت آیات پر اظہار غم کیا گیا اور نماز جنازہ غائبانہ ادا کی گئی اور مولانا عبدالجبار صاحب صدر مدرس مدرسہ باقیات الصالحات ویلور نے حضرت قدس سرہٗ کے حالات زندگی پر روشنی ڈالی۔ دعائے مغفرت کے بعد جلسہ برخاست کیا گیا۔

ریاست کھیڑا گڑھ | یہاں حضرت شیخ الہندؒ کی رحلت کی خبر سنکر تمام بستی میں سناٹا پڑ گیا۔ ۵ر دسمبر ۲۰ء کو قرآن خوانی ہوئی اور ایصال ثواب کے لئے فقرا و غربا کو کھانا کھلایا گیا۔ اور بعد نماز مغرب ایک ہندو مسلم متفقہ جلسہ ہوا اور حسب ذیل قرار داد پاس کی گئی۔

یہ جلسہ شیخ الہندؒ کی وفات حسرت آیات پر دلی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے ہم تمام باشندگان ریاست کھیڑا گڑھ مرحوم کی دینی اور قومی خدمات کا اعتراف کرتے ہیں۔

مظفر پور | ۲ر دسمبر ۲۰ء کو مغرب کے بعد یہاں خبر وفات حسرت آیات آئی ۳۰ دسمبر یوم جمعہ کو بڑی جامع مسجد میں ایک جلسہ ہوا اور مقررین نے تقریریں

لہ مدینہ ۷ر دسمبر ۲۰ء۔

فرمائیں ایصال ثواب کے بعد جلسہ برخاست کر دیا گیا۔ ۴ر دسمبر کو مدرسہ جامع العلوم اور مدرسہ فیض عام بند کر دیئے گئے۔ ۵ر دسمبر کو ہندوؤں اور مسلمانوں کا ایک مشترک جلسہ ہوا جس میں مسلم مقررین کے علاوہ بابو جھگڑو لال نے مولانا کے حالات زندگی بیان فرمائے۔

مدرسہ قرأۃ الفرقان کانپور یہاں حضرت شیخ الہندؒ کی وفات کی خبر سن کر قرآن خوانی کی گئی۔ حضرت قدس سرہٗ کے لئے ایصال ثواب کیا گیا اور ایک جلسہ میں حضرت قدس سرہٗ کی وفات پر اظہار غم کیا گیا۔

میرٹھ میں عام ہڑتال یہاں حضرت شیخ الہندؒ کے وصال کی خبر سنکر گورنمنٹ فیض عام کالج، دیوناگری، اے ڈی اسکول، گوپی اسکول اور چند میونسپل اسکول بند کر دیئے گئے اور عام ہڑتال کے لئے ۵ر دسمبر ۲۰ء کا دن معین کیا گیا[1]

مدینہ اخبار بجنور حضرت مولانا محمود حسن صاحب شیخ الہندؒ جو تاج المحدثین زمانہ، صوفی یگانہ تھے آپ مولانا ذوالفقار علی صاحب مرحوم کے خلف اکبر تھے۔ آپ کے والد ماجد کا شمار بڑے علما میں تھا۔ اور خود اجلّ علما میں شامل تھے۔ بحیثیت اتقا اور جاں نثاری اسلام ذات اقدس فرد روزگار تھی۔ علوم درسیہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ، مولانا محمد یعقوب صاحب، مولانا سید احمد صاحب مولانا ملا محمود صاحب وغیرہم سے حاصل کئے اور جس مدرسہ میں تعلیم پائی تھی اسی مدرسہ کے صدر المدرسین مقرر ہوئے اور آخر تک یہ خدمت انجام دی۔

---

[1] مدینہ ۵ر دسمبر ۲۰ء۔

سلسلہ تصوف میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی اور مولانا محمد قاسم صاحب مولانا رشید احمد صاحب کے خلیفہ اور تینوں صاحبوں سے بیعت تھے۔ آپ نے چند بار شرف حج وزیارت حرمین شریفین حاصل کیا۔ اور سب سے آخری حج میں بالزام سرتابی از اطاعت گورنمنٹ اور سلطان المعظم اور ترکوں کے فتوئے کفر پر دستخط کرنے کی وجہ سے بذریعہ شریف مکہ انگریزوں کے ہاتھوں میں گرفتار ہوئے۔ اور دارالامن مکہ سے مصر مصر سے مالٹا بھیجے گئے۔ وہاں ۵ سال اس نظر بندی کے سلسلے میں رہے۔ ۱۹۲۰ء میں عام نظر بندوں کی رہائی کے سلسلہ میں رہا ہوئے۔ اور کوشش کے بعد سب سے آخر میں چھوڑے گئے۔ واپس آنے کے بعد اطمینان کا سانس نہ لینے پائے۔ تھے کہ زوجہ مطہرہ نے وفات پائی۔

آپ کی وفات کا تار ۸ ربیع الاول مطابق ۳۰ نومبر آپ کے بھتیجے حبیب حسن کو بجنور پہونچا۔ عام مسلمانوں کے دل اس صدمہ جانکاہ سے متاثر ہو گئے۔ یہ قید فرنگ اور الزامات سنت پیران مرحوم ہے۔ یعنی تینوں مرشد ایسے ہی الزامات میں مبتلا ہوئے۔

حافظ ضامن صاحب کی شہادت کے بعد بسلسلہ بغاوت حضرت حاجی امداد اللہ صاحب نے مکہ معظمہ کو ہجرت فرمائی۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب روپوش رہے۔ حضرت مولانا رشید احمد صاحب انگریزی جیل میں نو مہینے تک رہے۔ یہ سب غدر ۱۸۵۷ء کی بدولت ہوا۔ قبل از وفات حضرت مولانا رشید احمد صاحب ممدوح مجاز ہونے کی حیثیت سے مرشدین ثلاثہ کی قائم مقامی کی اور سلسلہ بیعت درس کے ساتھ شروع کر دیا۔ تمام عرب اور ممالک اسلامیہ میں آپکے شاگرد ہیں اور مولوی حسین احمد صاحب مسجد نبوی مدینہ طیبہ میں درس دیتے تھے آپ کی نظر بندی کے ساتھ چودھری نصرت حسین صاحب فتحپوری، مولوی حسین احمد صاحب مدنی زید پوری اور ان کے برادر زادہ اور مولوی

عزیر گل صاحب اسیر مالٹا رہے۔

تحریک نظر بندی غالباً آپ کے ایک شاگرد خاص اور حوارین کے ذریعہ ہوئی۔ آپ کے علم و فضل اور اتقا کی شہرت تو پہلے سے تھی لیکن یہ نظر بندی اور بھی سونے میں سہاگہ ہوگئی۔ جو محض ہمدردی اسلام اور جنب داری خلافت کے الزام پر مبنی تھی۔ آپکا استقلال اور اسلامی وفاداری اور بزرگانہ اخلاص قابل ستائش ہے۔ اور ترک موالات پر آپ کا فتویٰ بھی بے نظیر ہے۔

حضرت ممدوح اعلائے کلمۃ الحق اور اظہار جذبات اسلام میں کسی طاقت سے مرعوب اور متاثر نہ ہوئے تھے ہم ظاہر بینوں کی نظر میں بے وقت وفات پائی اور رفیق اعلیٰ کو لبیک کہا۔ آپ کا نظیر بظاہر طبقہ علما میں موجود نہیں۔ ابھی آپ کی رہنمائی کی مسلمانوں کو بہت ضرورت تھی۔ آپ کی تحریک مبارک سے دیوبند میں قصر دارالحدیث تیار ہوا۔ جس کے حوالی کے مکان تعمیر ہوں گے۔ وہ کمرہ تیار شدہ بدون چھت کے ملتوی ہے خدا امراء ملک کو اس کی تکمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ آپ ہی کے دست مبارک سے علیگڑھ میں مسلم قومی یونیورسٹی یعنی جامع اسلامیہ کی بنیاد پڑی جس کے افتتاح کے لئے باوجود ایسے ضعف کے آپ تشریف لائے تھے۔ خاندان عزیزیہ کی یادگاروں میں فرد یگانہ تھے خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنیوالے میں۔ ان اولیاء اللہ لاخوف علیھم ولا ھم یحزنون۔ وان اولیاء اللہ لایموتون کے مصداق تھے انا للہ وانا الیہ راجعون

نور الحسن ذہین مدینہ ۹ر دسمبر ۱۹۲۰ء

انتخاب شیخ الہند کا مسئلہ

حضرت شیخ الہندؒ کے وصال کے بعد چند خبریں اور خراج عقیدت ہم گذشتہ سطور میں پیش کرچکے

ہیں۔ ان دنوں میں جہاں یہ سب کچھ ہوا۔ مسئلہ انتخاب شیخ الہندؒ بھی زور شور سے اٹھا چنانچہ کچھ دنوں تک اس انتخاب کے لئے مولانا عبدالباری صاحب اور مولانا عبدالقادر صاحب کے نام شائع ہوئے۔ اس کے بعد یکم جنوری ۲۱ء کے مدینہ میں مسئلہ شیخ الہند پر تفصیلی کلام کرتے ہوئے اور اس کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے اس منصب کے لئے مندرجہ ذیل حضرات کے اسمار گرامی اور ان پر مندرجہ ذیل نوٹ شائع ہوا۔

(۱) مولانا حسین احمد صاحب مدنی۔ (۲) مولوی عزیر گل صاحب کابلی (۳) مولانا محمد مبین صاحب خطیب دیوبندی (۴) مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی (۵) مولانا انور صاحب کشمیری (۶) مولانا کفایت اللہ صاحب دہلوی (۷) مولانا حافظ احمد صاحب دیوبندی (۸) مولانا اشرف علی صاحب تھانوی (۹) مولانا محمد یٰسین صاحب بریلوی (۱۰) مولانا نورالحسن صاحب دیوبندی (۱۱) مولانا مرتضےٰ احسن صاحب چاندپوری۔

مندرجہ بالا علما کی فہرست سے ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک بجائے خود عالم اور مولانا مرحوم کے اسوۂ حسنہ پر زندہ وجاوید یادگار ہیں۔

اگر پبلک کو اعتراض ہو تو شاید نمبر ۱ اور نمبر ۳ کے متعلق کسی قدر خلفشار ہوگا کیونکہ ہر دو اصحاب کی کوئی ایسی اہم خدمت دینی ظہور میں نہیں آئی جس سے اس منصب عالی کے سزاوار ہوں مگر جبکہ ہر دو صاحب اپنی ناکردہ تقصیرات کے متعلق جو درباۂ خلافت ظہور میں آئیں نہ صرف معافی و استغفار فرماتے ہیں بلکہ آئندہ طرز عمل سے اس معاملہ میں بدل شریک ہیں ایسی حالت میں قوم کو بھی معاف کر دینا چاہیئے۔ مدینہ یکم جنوری ۲۱ء

مقالہ نگار نے اپنی اس تحریر میں ناکردہ تقصیر کا لفظ استعمال کیا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات کو محض قرآن کی وجہ سے ملوث کر لیا گیا ہے وہ (باقی صفحہ ۳۰۰)

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

تحریراتِ شیخ الہندؒ

خطباتِ صدارت اور فتاویٰ و مکتوبات و پیغامات

خطبہ صدارت جمعیۃ علمائے ہند باجلاس دہلی

تمہید خطبہ مسنونہ کے بعد: امابعد۔ خاکسار ذرۂ بے مقدار حضرات علمائے کرام و معززین اہل اسلام برادران وطن کی خدمت میں عرض رساں ہے کہ آپ حضرات نے مجھ جیسے ناچیز و ضعیف کو جس عظیم الشان خدمت کے لئے منتخب فرمایا ہے۔ میں اس کے لئے آپ کی محبت و عزت افزائی کا دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی یہ التماس کرتا ہوں کہ صدارت کی ذمہ داری کی اہمیت اور زمانہ حاضرہ کی ہوش ربا کش مکش موت و حیات پر نظر کرتے ہوئے میں۔ اپنی گذشتہ پنجسالہ قید غربت اور اب موجودہ ممتد علالت کے سبب سے صدارت کی خدمت سے اپنے آپ کو قاصر پاتا ہوں۔ کیونکہ ایسے نازک اور پرخطر زمانہ میں کسی عظیم ملی اور قومی اجتماع کی صدارت کے لئے ضروری تھا کہ صدر تمام جزئیات سے واقف ہو اور نہ تھکنے والی دماغی قوت اور نہ متزلزل ہونے والی قلبی عزیمت اور نہ سست ہونے

بقیہ صفحہ ۲۹۸ کا تقصیرات کیا تھیں اس کے متعلق کچھ تو گذر چکا ہے اور کچھ حضرت شیخ الہند رح کی "تحریرات" کے زیر عنوان حضرت مدنی رح کا تبصرہ ہے وہاں ملاحظہ فرمائیں اسی کے ساتھ اس صفحہ پر اخبار اصلاح بجنور کے حوالہ سے جو حاشیہ درج ہے اس کو بھی ملاحظہ فرمائیں۔

والی اعضاء وجوارح کی طاقت رکھتا ہو۔ بایں ہمہ آپ حضرات نے مجھے ایک دینی قومی خدمت کے لئے نامزد اور منتخب کر دیا تو میرے لئے سوائے اس کے چارہ نہ تھا کہ بنام خدا اس کے لئے سرتسلیم خم کر دوں اور خدا کی تائید پر بھروسہ کر کے خدمت اسلام اور اہل اسلام کے لئے تیار ہو جاؤں۔

معزز حاضرین! میری اس عاجزانہ التماس پر پوری توجہ مبذول فرمائیں کہ کئی مہینہ کی ممتد علالت کی وجہ سے مجھے پورے اطمینان سے غور و غوض کا موقعہ نہیں ملا ہے اس لئے معروضات میں اگر کسی قسم کی کوتاہی ہو۔ مضامین منتشر ہوں تو میرے واقعی عذر کو پیش نظر رکھتے ہوئے معاف فرمائیں۔ والعذر عند کرام الناس مقبول۔

اس اجلاس کی فضیلت

محترم حاضرین آج جس اجلاس میں آپ تشریف فرما ہیں اور طویل و عریض سفر برداشت کر کے شریک ہوئے ہیں یہ وہ مقدس اجتماع ہے جس کا سنگ بنیاد بحکم

۱۔ وشاورھم فی الامر — اور ان سے کام میں مشورہ لے

۲۔ وامرھم شوریٰ بینھم — اور ان کا معاملہ آپس میں مشورے کا ہے۔

۳۔ وتناجوا بالبر والتقویٰ — اور وہ نیکی و تقوے کے کاموں میں مشورہ کرتے ہیں۔

رکھی گئی ہے یعنی حضرت حق جل شانہ نے اپنے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی حکم فرمایا کہ آپ اپنے اصحاب کرام سے مشورہ فرمایا کریں اور پھر مسلمانوں کی شان بھی یہی بیان فرمائی کہ وہ اپنے امور کا آپس میں مشورہ کر کے فیصلہ کرتے ہیں۔ جس سے صاف طور سے ثابت ہو گیا کہ مسلمانوں کے تمام کام بالخصوص ایسے کام جن کا مسلمانوں کی تمام جماعت سے تعلق ہے آپس کے مشورے سے ہونا چاہیئے۔ یہ حکم تو ایسے جلسوں اور اجتماعوں کی

بنیاد ڈالتا ہے جو بغرض مشورہ منعقد کئے جائیں اور ارشاد

تناجوا بالبر والتقوىٰ نیکی اور تقوے میں مشورہ کرو

ان جماعتوں کی نوعیت کی تائید کرتا ہے یعنی مجلس مشاورت کا نیکی اور خوف خدا پر مبنی ہونا لازم ہے پس ایسے تمام جلسے جن کا مقصد دین مقدس کی حمایت و حفاظت ہو اور جن میں نیکی اور بھلائی کے طریقوں پر غور کیا جائے اور جن میں خدائے تعالیٰ قدوس کا خوف شامل حال رہے منعقد کرنا اور ان میں شریک ہونا حکم خداوندی کی تعمیل اور سنت رسول کی اقتدا ہے۔

چونکہ دور حاضر میں دشمنان اسلام نے مقامات مقدسہ کو غصب کرکے اور اقتدار خلافت کو پامال کرکے مسلمانوں کے واجب الاحترام جان و مال سے زیادہ عزیز مذہب کی توہین کی اور ان کے دینی بھائیوں کی جان و مال عزت و آبرو کو برباد کیا اس لئے تمام روئے زمین کے مسلمانوں پر فرض ہوگیا کہ وہ اپنے دینی بھائیوں کی نصرت و اعانت کریں اور اپنے پاک و مقدس مذہب کی حفاظت اور اعدائے اسلام کی مدافعت کے لئے کھڑے ہو جائیں۔ اس فرض میں چین، جاوہ، ہندوستان، افغانستان، ترکستان، بخارہ وغیرہ کے مسلمان برابر ہیں۔ کسی کی تخصیص نہیں جن مقامات میں لڑائی ہوتی ہے جس طرح وہاں کے مسلمانوں پر فرض تھا کہ اپنے بھائیوں کی مدد اور دشمن کی مدافعت کریں اسی طرح روئے زمین کے مسلمانوں پر ایشائی اور یورپین مظلوم مسلمانوں کی امداد و اعانت اور دشمن کی مدافعت کرنا فرض ہے اگرچہ امداد و اعانت کی صورت مختلف اور مدافعت کی نوعیت جداگانہ ہوگی۔

جمعیۃ علمائے ہند کے سامنے جہاں اور مذہبی اور علمی فرائض ہیں اس وقت یہ

فریضہ بھی اس کے پیش نظر ہے بلکہ تمام دیگر فرائض سے مقدم اور اہم۔

رشتہ اخوت یہ سوال کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی بیرون ہند کے مسلمانوں کے ساتھ ایسا کوئی شدید تعلق ہے جس کی وجہ سے ان پر سات سمندر پار کے رہنے والوں کی جانی اور مالی امداد فرض ہو جائے اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام نے اپنے پیروں اور کلمہ گویوں کے درمیان ایک ایسا رشتہ اتحاد قائم کیا ہے جو تمام مصنوعی، قومی، اتحادات سے بالاتر ہے اس میں قومیت اور لباس اور رنگت کا امتیاز نہیں صرف خدائے واحد پر ایمان لانا ایک مغربی شخص کو قصائے مشرق میں رہنے والے کا بھائی بنا دیتا ہے اور ان بعد المشرقین کے رہنے والوں کے درمیان وہ تمام تعلقات قائم ہو جاتے ہیں جو ایک بھائی کو دوسرے بھائی کے ساتھ حاصل ہوتے ہیں حضرت حق جل شانہٗ قرآن مجید میں ارشاد فرماتے ہیں۔

انما المومنون اخوۃ	تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں

اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

ان حقا علی المومنین ان	مسلمانوں پر لازم ہے کہ ایک دوسرے
یتوجع بعضھم بعض کما یالم	کیلئے ایسے دردمند ہوں جیسے سر کے
الجسد للراس (کنز العمال)	درد سے تمام اعضائے بدن دکھ پاتے ہیں

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

المومنون کرجل واحد	تمام مسلمان ایک جسم ہیں اگر آنکھ میں
ان اشتکی عینہ اشتکی کلہ	درد ہو تو تمام بدن دکھ اٹھاتا ہے
وان اشتکی راسہٗ اشتکی	اور سر میں درد ہو تو تمام بدن تکلیف

کلہ　　(رواہ احمد)　　پاتا ہے۔

اسی طرح ایک مسلمان کے درد اور دکھ سے تمام مسلمانوں کو درد اور تکلیف پہونچنا ضروری ہے۔

خدائے پاک کے فرمان اور رسول مقبول صلعم کے مقدس ارشاد سے صاف ثابت ہوگیا کہ ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کے درد سے اسی قدر صدمہ ہونا چاہیئے جس قدر ایک عضو کی تکلیف سے دوسرے اعضا کو تکلیف ہوتی ہے۔ اور اس مثال سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ ایمان اسی وقت کامل ہوگا جبکہ ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کی تکلیف سے ایسی ہی بے اختیاری اور اضطراری ہوتی ہے۔ ایک اور حدیث میں ارشاد فرمایا ہے۔

المسلم اخو المسلم لا یظلمہ	ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی
ولا یسلمہ وفی روایۃ المسلم	ہے نہ اس پر ظلم کرتا ہے اور نہ اسے
ولا یظلمہ ولا یخذلہ لا ینصرہ	دشمن کے پنجے میں چھوڑتا ہے اور مسلم

کی روایت میں نہ اس پر ظلم کرے اور نہ اس کی نصرت اور مدد سے منہ موڑے نہ اسے حقیر کرے

ایک اور حدیث میں ارشاد فرمایا ہے۔

مامن امرء مسلم یخذل	جو مسلمان کسی مسلمان کی ایسے موقع
امراء مسلما فی موضع ینتھک	میں مدد نہ کرے جہاں اس کی بے عزتی
فیہ الا خذلہ اللہ فی موضع	کی جاتی ہو اور آبرو پامال ہوتی ہو تو
یحب فیہ نصرتہ ومامن امرء	خدا اس کی اس جگہ مدد نہ کریگا جہاں
مسلم ینصر مسلما فی موضع	وہ خدا کی مدد چاہتا ہے اور جو مسلمان
ینقص فیہ من عرضہا	کسی مسلمان کی ایسی مدد کریگا جہاں

وینتہک فی من حرمتہ الانصرہ	اس کی عزت خراب اور بے آبروئی ہو رہی
اللہ فی مواطن یحب فیہ	ہے تو خدا اس کی اس جگہ مدد کرے گا
نصرتہ	جہاں وہ خدا کی مدد چاہتا ہے مسلمان

مسلمان کا بھائی ہے اس کو ہلاکت سے بچاتا ہے اور پس پشت اسکی حفاظت کرتا ہے

یہ ہیں خدا کے برتر اور اس کے پاک رسول کے صریح فرمان اور یہ ہیں مذہب اسلام کے جلیل القدر احکام جن کی وجہ سے ہندوستان کے مسلمان اپنے سمندر پار کے مذہبی بھائیوں کی امداد اور اعانت، کو اپنا مذہبی پاک فریضہ سمجھتے ہیں اور اعتقاد رکھتے ہیں کہ اگر ہم نے اس حالت دردناک میں بھی انکی بات نہ پوچھی کانوں میں تیل ڈالے بیٹھے رہے اور انکو دشمنوں کا تختۂ مشق بنانے کے لئے چھوڑ دیا اور ان کی امداد و اعانت میں امکانی کوشش، نہ کی تو قیامت کے دن خدائے جلیل و جبار کے قہر سے چھٹکارا مشکل ہے۔

رشتہ اسلام اور عہد باہمی

اسلام سے پہلے قومی زندگی قائم رکھنے اور بنی نوع کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے اقوام عالم کا یہ طریقہ تھا کہ ایک دوسرے کے ساتھ حلف یعنی معاہدہ کر لیا جاتا تھا دونوں معاہد قومیں ایک دوسرے کی مددگار ہوتی تھیں ایک دوسرے کی طرف سے دشمنوں سے لڑتی تھیں معاہدے کی یہ رسم غیر مسلم اقوام میں آج تک جاری ہے۔

اسلام نے حلف یعنی معاہدۂ نصرت کو جو مسلمانوں کے لئے آپس میں ضروری قرار دیا تو چیخ پکار کرتے ہیں ہم تمام ایسے لوگوں سے بھانگ دہل کہے دیتے ہیں کہ مسلمانوں میں باہمی نصرت و معاونت کا معاہدہ انسانی معاہدہ نہیں ہے بلکہ خدائے قدوس کا قائم کیا ہوا اور سخت تاکیدی مذہبی احکام کا قرار پایا ہوا معاہدہ ہے۔ اگر تمہارے اپنے قائم کئے

ہوئے معاہدے تمھیں مجبور کرتے ہیں کہ امریکہ والے آکر یورپ میں تمھاری مدد کریں اور ان کی یہ مدد آئین والنصاف کے خلاف نہ سمجھی جائے تو مسلمانوں کو ان کا خدا ان کا رسول ان کا پاک مذہب حکم کرتا ہے کہ وہ اپنے دینی بھائیوں کی مدد کریں خواہ وہ کہیں کے رہنے والے ہوں۔ کسی انسانی قانون وطاقت کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کو ان کے مذہبی فرائض سے روکے یا ان کی جائز مذہبی جدوجہد کو غیر آئینی قرار دے۔

یہاں پر طبعاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سے واقعات ہیں جنھوں نے مسلمانوں کو اس قدر بے چین اور مضطرب کر دیا ہے۔ اور کیا اسباب ہیں جن کی وجہ سے بیرون ہند کے رہنے والے بھائیوں سے ہمدردی اور ان کی اعانت فرض ہو گئی ہے اس کا جواب دینے اور سننے کے لئے پتھر کا دل اور فولاد کا کلیجہ درکار ہے اور اس کی تفصیل کے لئے بہت زیادہ وقت کی ضرورت ہے۔ اس لئے اول تو اپنے ضعف کی وجہ سے دوسرے اس لئے بھی کہ بہت سے واقعات اور مظالم اخباروں اور تحریروں کے ذریعہ سے عالم آشکار ہو چکے۔۔۔۔ میں صرف چند جملوں پر اختصار کرتا ہوں۔

ٹرکی اور برطانوی طرز عمل

معزز ناظرین! دنیائے اسلام میں گذشتہ چند صدیوں سے سلطان ٹرکی واحد سلطنت اسلامی شوکت کی ضامن تھی۔ اور حرمین محترمین، بیت المقدس، عراق وغیرہ کے تمام اماکن مقدسہ ومقامات محترمہ کی حفاظت کی کفیل تھی۔ جمہور اسلام کے اتفاق سے سلطان ٹرکی خلیفۃ المسلمین مانے جاتے تھے۔ اور خلافت کے فرائض نہایت خوبی سے انجام دیتے تھے۔ ان کا عروج وترقی اور ان کی سلطنت کی وسعت جابر وغاصب سلطنتوں کی آنکھ میں کانٹے کی طرح کھٹکتی تھی اور وہ ہمیشہ اسی فکر میں لگی رہتی تھیں کہ خلیفۃ المسلمین کا اقتدار

گھٹایا جائے اور مستقر خلافت پر قبضہ کر کے یورپ سے اسلام کا نام و نشان مٹایا جائے
اگرچہ سلطان ٹرکی پران مسیحی بھیڑیوں کے درمیان بالکل ۳۲ دانتوں میں ایک زبان
کی مثل صادق تھی. مگر خلیفۃ المسلمین کی اسلام کے لئے جانبازانہ مقاومت ان غاصبونکی
متعصبانہ یورشیں پوری نہ ہونے دیتی تھیں. تاہم ان دشمنان اسلام کے دندان غریب
ٹرکی کے بدن میں سے گوشت کے لوتھڑے نوچتے رہے اور ۱۸۷۰ء سے تو اس نوچ کھسوٹ
کا متواتر ایک سلسلہ قائم ہوگیا. مصر جیسا زرخیز علاقہ قبرص، طرابلس، سالونیکا، یونان
بلغاریہ، سرویا، البانیہ، وغیرہ ٹرکی علاقے یکے بعد دیگرے ان ظالموں کی جوع الذئب
کی بھینٹ چڑھ گئے اور یہ ان بڑے بڑے لقموں کو ہضم کر گئے کہ ڈکار تک نہ لی. یہاں
تک کہ یہ جنگ عظیم چھڑ گئی. اس کا واحد سبب طمع ملک گیری تھا. کچھ ایسے اسباب پیدا ہو گئے
کہ ٹرکی کو بھی شریک جنگ ہونا پڑا .... اس
وقت تمام عالم کے مسلمان جس مصیبت میں مبتلا ہوئے اور بالخصوص برطانوی حکومت میں
رہنے والے مسلمانوں کو جو مشکلات پیش آئیں. اس کو خدائے علیم و حلیم ہی بہتر جانتا ہے
برطانوی مدبرین نے اپنی مسلمان رعایا کی تسلی کے لئے وقتاً فوقتاً چند اعلان شائع کئے
جن میں مسلمانوں کو اطمینان دلایا گیا. کہ ان کے مقامات مقدسہ پر کوئی آنچ نہ آئے گی
اور مستقر خلافت پر کوئی معاندانہ قبضہ نہ کیا جائے گا. اگرچہ مسلمانوں کا ان وعدوں پر
یقین کر کے مطمئن ہونا ایک سخت غلطی تھی. جس کا تلخ ترین مزا آج ان کے روحانی
ذائقہ کو تلخ بنا رہا ہے. لیکن واقعہ یوں ہی ہوا کہ مسلمان اس وعدے پر مطمئن ہو گئے اور
سلطنت. برطانیہ کی جانی و مالی امداد کر کے شاندار فتح حاصل ہونیکے باعث بنے.
شاطرین برطانیہ نے جیسے ہی ہوا کا رخ اپنے موافق دیکھا فوراً عیاری کے داؤں

پر چلنے لگے اور تمام دنیا کی قوموں کی آنکھوں میں خاک ڈال کر وعدے نسیاً منسیاً کر دیئے۔

مقامات مقدسہ پر قبضہ کر لیا۔ مستقر خلافت یعنی قسطنطنیہ کو فوجی قبضہ میں دبوچ لیا۔ سمرنا پر یونانیوں کو قبضہ دلا دیا۔ عرب کو ترغیب اور لالچ دیکر خلیفۃ المسلمین سے باغی بنا دیا۔ ٹرکی فوجوں سے ہتھیار رکھوا لئے۔ اور اس غریب کو زمانہ التوا میں بے دست و پا کر کے نہایت ذلت آمیز شرائط صلح پر دستخط کرنے کے لئے مجبور کیا۔ شرائط صلح میں خاص طور سے اقتدار خلافت کو زائل کرنے والی شرطیں لگائی گئیں اور تمام دیگر طاقتوں کے مسلمان رعایا کا خلیفۃ المسلمین سے مذہبی سرپرستی کا تعلق منقطع کر دیا گیا ولیعہد ٹرکی کو حراست میں کر لیا اور اسی قسم کے ہزاروں غیر منصفانہ سلوک کئے گئے۔

عالم اسلامی کی مصیبت اور اضطراب

ان لڑائیوں میں شام عراق، عرب، سمرنا، ٹرکی کے مسلمانوں پر مصیبت کے پہاڑ توڑے گئے۔ لاکھوں مسلمان قتل کئے گئے۔ لاکھوں عورتیں بیوہ اور بچے یتیم ہوئے۔ ہزاروں کلمہ گو خانہ ویران ہو کر وطن سے بھاگ نکلے اور آج غیر ملکوں میں، سڑکوں اور میدانوں پر بے یار و مددگار پڑے ہوئے ہیں۔ سیکڑوں کے بدن پر کپڑا اور جان بچانے کے لئے قوت لایموت بھی میسر نہیں۔ سمرنا میں ہزاروں بے گناہ قتل کر دیئے گئے۔ عورتوں کی عصمت دری کی گئی۔

یہ ہیں وہ روح فرسا، جاں سوز واقعات جنھوں نے تمام عالم کے مسلمانوں کو بے چین کر دیا ہے۔ اور جس کے دل میں ذرا سا ایمان بھی باقی ہے وہ سیماب وار بیقرار ہے اور اپنا شرعی اخلاق، قانونی حق سمجھتا ہے کہ اپنے مظلوم بھائیوں کی نصرت و اعانت کے لئے اٹھ کھڑا ہو اور جس طرح ممکن ہو اپنے بھائیوں کو دشمن کے نرغے سے نکالے اور

ان کے پنجۂ ظلم سے نجات دلائے۔

اخوت ایمانی کی ایک عالمگیر لہر اٹھی اور طرفۃ العین میں مشرق سے مغرب تک اور جنوب سے شمال تک دوڑ گئی۔ سوتے ہوؤں کو بیدار کر دیا۔ بیداروں کو اٹھا کر کھڑا کر دیا۔ اور کھڑے ہوؤں کو بے محابا دوڑا دیا۔ حجرہ نشین زاہد، کتاب کے کیڑے طالب علم، دوکانوں پر بیٹھنے والے تاجر، اسباب ڈھونے والے مزدور، مدرسوں میں درس دینے والے برق تقریر عالم، سب ایک صف میں آکر کھڑے ہو گئے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ دول یورپ اور بالخصوص برطانیہ کی ظالمانہ اور غاصبانہ پالیسی کو دیکھ کر اکیس کروڑ برادران وطن بھی ان کے ساتھ ہمدردی کے لئے تیار ہو گئے۔

یہ فریضہ تو اپنے مسلمان بھائیوں کی اعانت اور امداد کے متعلق تھا جن میں انسانی ہمدردی اور اخلاقی مروت کی وجہ سے غیر مسلم بھائی بھی مسلمانوں کے دوش بدوش کام کر رہے ہیں۔ اس کے بعد دوسرا فریضہ حمایت مذہب اور اماکن مقدسہ کا احترام باقی رکھنے کے لئے ہے، جو مسلمانوں پر ان کے پاک مذہب نے عاید کیا ہے۔ حضور نبی کریم صلعم کی وہ آخری وصیت جو دنیا سے تشریف لے جاتے وقت مسلمانوں کو فرمائی تھی یہ تھی۔

اخرجوا المشرکین من جزیرۃ العرب	مشرکوں کو جزیرۃ العرب سے نکال دو

اور دوسری روایت میں ہے۔

اخرجوا الیھود والنصاریٰ من جزیرۃ العرب	یہود اور نصاریٰ کو جزیرۃ العرب سے نکال دو

ان احکام میں تمام مسلمان مخاطب ہیں۔ عرب و عجم کی کوئی تخصیص نہیں یعنی، شامی

یا نثر کی پابندی کا کوئی امتیاز نہیں۔ ان احکام کی وجہ یہ ہے کہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ اسلام کے اصلی سرچشمہ ہیں۔ حجاز کی سرزمین پہلی جگہ ہے جہاں توحید ربانی کا آفتاب طلوع ہوا اور اس کے ذروں کو روشن کرکے ہر ہر ذرہ کو دنیا کے مختلف حصوں کے لئے ایک ایک آفتاب بنادیا۔

اس پاک اور مقدس سرزمین پر اسلام کے حقیقی جاں نثاروں اور خدائے پاک کی توحید پر جان قربان کرنے والوں کے خون کے محترم قطرے گرے ہیں۔ اور انھوں نے نہایت جلیل القدر قربانیوں کے بعد ان مقامات کو کفر و شرک کی نجاست سے پاک کیا ہے۔ پس اس لئے کہ جزیرہ عرب اسلام کا اصلی سرچشمہ ہے۔ آفتاب توحید کا مطلع ہے۔ اسلامی شوکت کا مرکز اور تجلیات الٰہی کا مظہر ہے۔ اس میں خدا کے سب سے زیادہ مقدس اور محبوب رسول کی آرام گاہ ہے۔ اس میں دنیا کا سب سے پہلا توحید کا عبادت خانہ ہے اس کے ریگستان کے ذرے صحابہ رض کے خون سے سیراب کئے گئے ہیں۔ اس میں اسلام کے جد اعلیٰ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی یادگاریں ہیں۔ ضروری ہے کہ کسی غیر طاقت اور دشمن اسلام سلطنت کے قبضہ اور تسلط سے پاک رہے۔

کیا تین خدا ماننے والوں کیا مادی قوت کے پرستاروں، کیا دنیا کی سرزمین کو اپنی جاگیر سمجھنے والوں سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ ان کے تسلط اور قبضہ کے بعد رسول پاک کے روضۂ مطہرہ کا احترام اور بیت الحرام کی حرمت باقی رہے گی اور یہ دشمنان توحید اسکی تقدیس و تعلیم کو اپنے خیال سے ضروری سمجھیں گے۔ رعایا کے مذہبی جذبات سے خوف کھاکر اور عام ہیجان کے خطرے سے دفعتہً کوئی ایسی بات نہ کریں گے جس سے عالم اسلامی میں ایک طوفان برپا ہو جائے تو یہ اور بات ہے لیکن کوئی تجربہ کار جسے یورپین

طاقتوں کی اس مذہبی عصبیت کا تجربہ ہے جس کی وجہ سے برطانی ذمہ دار اراکین فتح بیت المقدس کو شاندار صلیبی فتح قرار دیتے ہیں اور سالونیکا یونانیوں کے قبضہ کے وقت یہ کہہ کر خوشی مناتے ہیں کہ یورپ میں عیسائی مذہب کے داخل ہونے کا پہلا دروازہ پھر عیسائیوں کے پاس آگیا کوئی ایک منٹ کے لئے مطمئن نہیں ہوسکتا کہ ان دوست نما اعدائے اسلام کے تسلط کے بعد بھی مقامات مقدسہ کی حقیقی حرمت باقی رہ سکتی ہے۔

حج کیوں کر ہوگا بہت سے ظاہر بین مسلمان بھی اس دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں کہ انگریزی تسلط کے بعد حج جاری رہے گا بلکہ آرام و آسائش کے سامان زیادہ ہوجائیں گے۔ میں ان حضرات سے صرف اس قدر عرض کرتا ہوں کہ آپ نے ایک ظاہری سفر کو حقیقی حج سمجھ لیا ہے، اور ظاہری سفر کے آرام و آسائش کو حضور قلب اور اخلاص و حلاوت ایمانی کی جگہ دیدی ہے، اور پھر ظاہری آرام و آسائش کا بھی آپ کو تجربہ ہو جائے گا۔ ابھی ذرا ٹھہر جائیے۔ یہ سنہرا طوفان جو خود غرض اور عیاری کے ساتھ عرب کی سطح پر محیط ہو گیا تھا ذرا کھل جانے دیجئے۔ پھر آپ کو آرام و آسائش کا بھی پتہ چل جائے گا۔

شریف حجاز یہاں پر یہ کہا جاتا ہے کہ حجاز پر انگریزی قبضہ نہیں ہے بلکہ شریف مکہ کی حکومت ہے۔ میں عرض کروں گا کہ حکومت شریف کی حقیقت بھی واقف کار نظروں سے پوشیدہ نہیں ہے۔ بھلا وہ شریف جس نے اپنے قدیمی ولی نعمت اور واجب الاحترام آقا اور مفروض الطاعت خلیفۃ المسلمین سے ایک مسیحی طاقت کی ترغیب اور ابلہ فریبی کی وجہ سے بغاوت کی ہو۔ وہ شریف جو انگلستان کا وظیفہ

خوار ہو وہ شریف جو مسیحی سرداروں کی تصویروں کو سینہ سے لگاتا ہو وہ شریف جو خدا کے مقدس جائے امن سے مسلمانوں کو گرفتار کر کے کفار کے حوالے کر دے اس کی حکومت صحیح معنی میں اسلامی حکومت ہو سکتی ہے اور اسکا نام نہاد اقتدار اسلامی اقتدار کہلا سکتا ہے حاشاء کلا

الغرض بیت المقدس، سرزمین عراق، عرب یہ سب مسلمانوں کے اماکن مقدسہ ہیں۔ مستقر خلافت یعنی قسطنطنیہ اور ایڈریانوپل قدیمی اسلامی یادگاریں ہیں ان تمام مقامات کو اسلامی شوکت و وقار کا مرکز اور خلافت اسلامیہ کا محور ہونے کی وجہ سے مذہبی احکام کی بموجب غیر مسلم اثر سے پاک و صاف رکھنا مسلمانوں کا مذہبی فریضہ ہے۔ یہاں تک اس کا بیان تھا کہ اس وقت مسلمانوں کے مذہبی فرائض کیا ہیں۔ گذشتہ بیان سے معلوم ہوگیا وہ فرائض یہ ہیں۔

اپنے مسلمان بھائیوں کی نصرت و اعانت۔ مقامات مقدسہ کی حفاظت خلیفۃ المسلمین کی برقراری میں کوشش اور خلافت اسلامیہ کے استحکام کی سعی کرنا۔

فرائض اسلامی اور ہندوستانی مسلمان

اب سوال ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے ان فرائض کے ادا کرنے کی کیا سبیل ہے۔ میں پہلے یہ گذارش کرنا چاہتا ہوں کہ جہاں تک مجھے معلوم ہے نہ صرف ہندوستان بلکہ اقصائے عالم میں کوئی ایک مسلمان بھی ایسا نہ ہوگا جو ان فرائض کی واقفیت سے منکر ہو بلکہ اس میں تردد اور شبہ رکھنے والا بھی غالباً کوئی متنفس نہ نکلے یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک ایک تلاطم برپا ہے۔ ہر شخص بے چین اور مضطرب ہے خلافت کمیٹیوں کی کثرت

اور عام قومی مظاہروں اور جلسوں کی نوعیت اس کی بین دلیل ہے مگر بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو کسی خوف کی وجہ سے جو ان کے دلوں پر تسلط ہو گیا ہے اس فریضہ کے عائد ہونے میں طرح طرح کے شبہات نکالتے ہیں یا کسی دنیوی طمع اور لالچ اور اپنی سنہری روپہلی مصلحتوں کے باعث حیلے حوالے تراشتے ہیں۔

آپ کو معلوم ہے کہ علمائے ہند کی ایک کثیر جماعت یہ فیصلہ کر چکی ہے کہ چونکہ ہندوستان کے مسلمانوں کے پاس مدافعت اعداء کے مادّی اسباب نہیں ہیں۔ توپیں ہوائی جہاز، بندوقیں ان کے ہاتھ میں نہیں۔ اس لئے مادی جنگ نہیں کر سکتے لیکن انھیں یقین رکھنا چاہیئے کہ جب تک برطانیہ کے وزراء اسلامی مطالبات تسلیم نہ کریں اس وقت تک تمام ہندوستان کے مسلمانوں کی ان کے ساتھ معاشرتی اور اخلاقی جنگ کی حالت ہے یعنی مسلمانوں پر حرام ہے کہ وہ اسلام کے دشمنوں کے ساتھ ایسے تعلقات قائم رکھیں جن سے ان کی مخالفانہ اور معاندانہ طاقت کو مدد پہونچے اور ان کے نشۂ غرور و تکبر کو تیز کرے۔ مسلمانوں کا اولین فرض ہے کہ وہ دشمن اسلام کو دشمن کے مرتبہ میں رکھیں اور ایسے تعلقات جو میل جول اور دوستی اور محبت پیدا کرنیوالے ہیں کو ایکدم چھوڑ دیں۔ اس اخلاقی جنگ کا نام ترک موالات ہے جس کے متعلق قرآن پاک میں صریح احکام موجود ہیں۔ حق تعالیٰ نے سورہ ممتحنہ میں فرمایا ہے۔

یاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّیْ وَعَدُوَّکُمْ اَوْلِیَآءَ — اے مسلمانو میرے اور اپنے دشمن کو دوست نہ بناؤ۔

ترک موالات

اس آیت میں حضرت حق تعالیٰ نے مسلمانوں کو دشمنان خدا اور دشمنان اہل اسلام کے ساتھ موالات کرنے سے انکار فرمایا

ہے۔اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ جس وقت حضور نبی کریم صلعم نے غزوہ فتح مکہ کا ارادہ کیا اور اسکا سامان ہونے لگا تو حاطب بن ابی بلتعہ صحابی نے مشرکین عرب کو ایک اطلاع کا خط لکھا جس میں ان کو متنبہ کیا تھا کہ رسول خدا تمھارے اوپر حملہ کی تیاریاں کر رہے ہیں تم اپنا برا بھلا سوچ لو۔ چونکہ قریش کے ساتھ ان کا کوئی نسبی تعلق نہ تھا اسلئے انھوں نے چاہا کہ میں ان کے ساتھ یہ احسان کر دوں۔ اور اس کے بدلے میں وہ میرے اہل و عیال اور جائداد وغیرہ کی جو مکہ میں ہیں حفاظت کریں۔ حضورؐ کو وحی سے اطلاع ہو گئی اور راستہ میں سے وہ خط پکڑا گیا اس پر حق تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اس میں کئی باتیں خاص توجہ کے لائق ہیں۔

اول یہ کہ اس میں حق تعالیٰ نے عدوی وعدوکم فرمایا ہے جس سے صاف طور پر سمجھا جاتا ہے کہ دشمنان خدا اور دشمنان اہل اسلام سے ترک موالات کا حکم دینے کی علت ان کی عداوت اور دشمنی ہے تو جہاں کہیں عداوت اور دشمنی موجود ہوگی وہاں ترک موالات کا حکم اسی طرح عائد ہوگا جس طرح آیت شریفہ کے نزول کے واقعہ میں ہوا تھا۔

دوسرے یہ کہ حاطب بن ابی بلتعہ نے کفار کی محبت یا قلبی میلان یا ان کے کفر سے راضی ہونے کی وجہ سے یہ کام نہ کیا تھا بلکہ محض ایک دنیوی مصلحت کی وجہ سے کیا تھا اور مصلحت بھی ایسی کہ ان کے اہل و عیال کی حفاظت کی کوئی سبیل نہ تھی کیونکہ وہ دشمنوں کے تسلط کے مقام میں تھے گویا ان کا یہ خبر دینا دشمنوں کی ایک معاونت و محافظت جائداد اہل و عیال کا معاوضہ تھا باوجودیکہ حضرت حق نے اس کو موالات سے تعبیر فرمایا اور ممانعت کا حکم بھیجا۔

تیسرے یہ کہ حاطب کا یہ فعل یعنی خبر دینا کفار کی کوئی مادی مدد کرنا نہ تھا بلکہ صرف ان کو ان کے برے انجام سے خبردار کرنا اور اپنی نجات کا طریقہ سوچ لینے کے لئے ہلاکت کا وقت سر پر آنے سے پہلے موقعہ بہم پہونچانا تھا مگر صرف اتنی بات کو بھی حق تعالےٰ نے موالات ممنوع میں داخل فرما کر موالات کی ممانعت کا حکم نازل فرمایا۔ حاطب کے اس خفیہ خط کے یہ الفاظ اس مضمون پر پوری روشنی ڈالتے ہیں۔

ان رسول اللّٰہ صلعم یریدکم	حضور صلعم تمہارے اوپر حملہ کا ارادہ فرما
فخذ واحذرکم	رہے ہیں تم اپنا بچاؤ اختیار کرو

اور جب حضورؐ نے ان سے دریافت کیا کہ کیوں صاحب یہ کیا حرکت تھی تو انھوں نے جواب دیا۔

وما فعلتہ کفراً ولا ارتداداً	حضورؐ میں نے یہ کام کفر کی وجہ سے یا
من دینی ولا رضاً بالکفر بعد	اسلام سے پھر جانے کے باعث یا اسلام
الاسلام۔	لانے کے بعد کفر سے راضی ہونے کے
	سبب سے نہیں کیا

کان اھلی بین ظھرانیھم	میرے اہل و عیال کفار مکہ کے نرغے
فخشیت علی اھلی فاردت	میں تھے مجھے ان کی جان کا خوف تھا
ان اتخذلی عندھم یداً و	تو میں نے چاہا کہ ان کے ساتھ ایک احسان
قد علمت ان اللّٰہ تعالیٰ ینزل	کردوں اور بیشک میں جانتا ہوں
بھم بامرہٖ وان کتابی لا یغنی	کہ خدائے تعالیٰ ان کافروں پر اپنا
عنھم	عذاب نازل کرے گا اور میرے خط

سے انھیں کوئی فائدہ نہ ہوگا

چوتھے یہ کہ حضرت فاروق اعظم رضؓ نے حاطبؓ کے اس فعل کو مظاہرات سے تعبیر فرمایا۔

لکنہ قد نکث وظاھر اعدائک علیک	یارسول اللہ اس حاطب نے اسلام کی بیعت توڑ دی اور آپ کے خلاف آپ کے دشمنوں کی مدد کی

اس کے بعد حضرت حق تعالیٰ شانہٗ ارشاد فرماتا ہے۔

انما ینھکم اللہ عن الذین قاتلوکم فی الدین واخرجوکم من دیارکم وظاھروا علے اخراجکم ان تولوھم ومن یولھم فاولئک ھم الظالمون	یعنی حق تعالیٰ تم کو ایسے لوگوں کی موالات سے منع کرتا ہے جو تم سے مذہبی لڑائی لڑے اور تم کو تمہارے گھروں سے نکالا اور نکالنے والوں کے مددگار ہوئے اور جو لوگ ان سے ترک موالات نہ کریں گے وہ ظالم ہیں

جن کافروں میں یہ تین چیزیں پائی جائیں ان کی موالات کو یہ آیت حرام قرار دیتی ہے۔

۱۔ مسلمانوں سے دینی لڑائی لڑنا۔

۲۔ مسلمانوں کو گھروں سے نکالنا اور خانہ ویران کرنا۔

۳۔ نکالنے والوں کی مدد کرنا۔

پہلی بات یہ کہ برطانیہ کی مسلمانوں سے لڑائی مذہبی لڑائی تھی۔ تمہیں برطانیہ کے وزیر اعظم کے ان الفاظ سے جو جرنیل ایلینبی کو فتح بیت المقدس کی مبارکباد

دیتے وقت کیے گئے تھے۔ اور اس فتح کو شاندار صلیبی فتح قرار دیا گیا تھا۔ صاف ظاہر ہے اور ٹرکی کے ساتھ التوائے جنگ اور صلح کے شرائط پر نظر ڈالنے سے موٹی نظر والے کو بھی حقیقت حال نظر آجاتی ہے۔ تھریس پر یونانیوں کو قبضہ دلانا، قسطنطنیہ پر قبضہ کرلینا، اپنے صریح وصاف وعدوں کی خلاف ورزی کرنا، سمرنا میں یونانیوں کے مظالم کو نہ روکنا، یہ تمام چیزیں ایسی ہیں کہ ان کے بعد کسی کو اس بات میں شبہ باقی نہیں رہتا کہ ترکوں کے ساتھ صرف ان کے مسلمان ہونے کی وجہ سے یہ تمام ناانصافیاں روا رکھی گئی ہیں۔

دوسری بات مسلمانوں کو گھروں سے نکالنا۔ قسطنطنیہ اور اس کے اطراف سے ہزاروں مسلمان وطن سے نکل بھاگے۔ خود ولیعہد سلطنت نے اسلامی حمیت کی وجہ سے کئی مرتبہ نکلنے کا ارادہ کیا مگر ان کو سخت حراست میں کر دیا گیا۔ یونانیوں کے مظالم سے ہزاروں مسلمان سمرنا سے گھر بار چھوڑ کر بھاگے۔ قسطنطنیہ سے بہت سے معززین اور معتمد حضرات کو جلا وطن کرکے مالٹا وغیرہ میں بھیج دیا گیا۔ یہ تمام واقعات ہیں جس کے اخراج من الدیار اور مظاہرات علی الاخراج میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا۔ مالٹا میں ٹرکی کے بہت سے معتمد افراد سے میری ملاقات ہوئی جو وہاں نظر بند تھے۔

برطانیہ سے ترک موالات

پس جب کہ یہ تینوں باتیں سلطنت برطانیہ کے ذمہ دار وزراء کی طرف سے واقع ہوگئیں تو اب بھی کسی مسلمان کو برطانیہ کے ساتھ ترک موالات کے حرام ہونے میں کوئی شبہ ہو سکتا ہے۔ رہا یہ شبہ کہ موالات اور چیز ہے اور معاملات اور چیز ہے۔ آیت موالات کو منع کرتی ہے نہ معاملات کو تو میں کہوں گا کہ ہاں موالات اور معاملہ میں مفہوم کے لحاظ سے

فرق ہے لیکن موالات کے مفہوم میں قربت اور نزدیکی پیدا کرنے والے تعلقات اور باہمی نصرت و معاونت کے تمام ارتباطات لغوی معنی کے لحاظ سے داخل ہیں پس تمام ایسے معاملے جن کی وجہ سے دشمن کے ساتھ میل جول ربط و اتحاد بڑھے ایسے معاملے جو انکی معاندانہ طاقت کو بڑھائیں ایسے تعلقات (فوجی ملازمت وغیرہ) جو مسلمانوں کی ہلاکت اور شوکت اسلامیہ کے مٹانے میں داخل ہوگئے ہیں۔

ایسے روابط جن کی وجہ سے انھیں موقعہ ملے کہ مسلمانوں کی رضامندی پر استدلال کرسکیں ایسے مراسم جن سے ان کے ساتھ محبت اور الفت کا اظہار ہوتا ہو۔ براہ راست یا بالواسطہ ممنوع محرم میں داخل ہیں۔ حاطب بن ابی بلتعہ کے واقعہ کو بغور دیکھا جائے تو پھر کوئی شبہ واقعہ نہیں ہوسکتا۔

اس کی تفصیل کا یہ وقت نہیں ہے اس لئے صرف اسی قدر پر اکتفا کرتا ہوں۔ دوسرا شبہ یہ کیا جاسکتا ہے کہ مسلمان ترک موالات سے تکلیف اور نقصان اٹھائینگے اس کے جواب میں بھی مختصراً یہ واقعہ ذکر کر دینا کافی سمجھتا ہوں کہ جس وقت یہود بنو قینقاع سے مسلمانوں کی لڑائی ہوئی تو عبادہ بن الصامت انصاری نے عرض کیا۔

ان لی اولیاء من الیھود کثیر	حضور! میری یہود کی ایسی جماعت سے
عدوھم شدیدۃ شوکتھم	موالات تھی جن کی تعداد بہت ہے اور
وانی ابرا الی اللہ ورسولہ من	طاقت زبردست ہے آج میں انکی
ولایتھم وحلفھم ولا مولیٰ	موالات سے دست برداری کرتا ہوں
لی الی اللہ ورسولہ وقال	اور اب خدا اور رسول کے سوا میرا
عبد اللہ ابن ابی لکنی لا ابراء	کوئی مولیٰ نہیں اس پر عبداللہ منافق

من ولی یھود آوانا رجل لا   بولایں تو یہود کی موالات سے دست
ہتلی منھم   برداری نہیں کرتا۔ کیونکہ میری تو بغیر
ان کے گزر مشکل ہے۔

اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

یا ایھا الذین امنوالا تتخذوا   اے ایمان والو! یہود اور نصاری کو
الیھود والنصارٰی اولیاء   دوست نہ بناؤ۔

اور منافقین کا یہ قول کہ ہمیں تکالیف اور مصیبتیں پہونچنے کا خوف ہے جواز موالات کے لئے کافی نہ ہوا اور ان کو موالات کی اجازت نہ دی گئی۔ بلکہ ایسے لوگوں کے بارے میں حضرت تعالیٰ نے فی قلوبھم مرض" فرمایا ہے اور ان کے اس قول کا کہ ہمیں تکلیفیں اور مصیبتیں پہونچنے کا خوف ہے یہ جواب دیا کہ عنقریب حق تعالیٰ اپنی طرف سے مسلمانوں کو فتح یا اور کوئی مہتم بالشان امر ظاہر کرے گا جس سے یہ تمام ڈرنے والے اپنی نفسانی منصوبوں پر نادم ہوں گے۔

میدانِ عمل

آج بھی ایک میدان عمل تمہارے سامنے ہے۔ ابتلا و امتحان کی کڑی منزل در پیش ہے مگر آپ ڈر نہ جائیں صرف اپنے آقائے نامدار اور خاتم النبیین صلعم کے حالات پر غور کریں۔ آپ کو مشرکین عرب نے اس قدر سخت تکلیفیں پہونچائی ہیں کہ الامان، الحفیظ۔ مگر آپ ان تمام جاں گداز تکلیفوں کو نہایت استقامت کے ساتھ برداشت کرتے رہے اور اپنے فرض تبلیغ کو جاری رکھا یہانتک کہ کفار مکہ نے آپ کے قتل کا منصوبہ باندھ کر آپ کے مکان کا محاصرہ کر لیا اسوقت آپ خدائے تعالیٰ کے حکم سے مکان چھوڑ کر تشریف لے گئے اور تین دن غار ثور میں

رہ کر مدینہ منورہ چلے گئے وہ زمانہ مسلمانوں کے لئے سخت ابتلا و آزمائش کا زمانہ تھا مسلمانوں کی تعداد نہایت قلیل اور مالی حالت نہایت تنگی کی تھی مگر ان کے ایمان پختہ قلب مطمئن تھے ان کی صداقت اور استقامت کی برکت تھی کہ کفار کے تمام منصوبے خاک میں مل گئے اور ذلیل و خوار ہوکر مغلوب ہوئے اور خدا کا نور تمام دنیا میں پھیل گیا۔ میری غرض صرف اس بیان سے یہ ہے کہ اگر آج مسلمانوں کے ایمان پختہ ہو جائیں اور خدا تعالیٰ کے وعدۂ نصرت (کان حق علینا نصر المومنین) پر انکو پورا بھروسہ ہو جائے اور تکالیف کی برداشت میں ذرا صبر و استقامت سے کام لیں تو ان کی کامیابی یقینی ہے کیونکہ آج دنیا میں مسلمانوں کی تعداد چالیس کروڑ ہے جس میں صرف ہندوستان میں ساڑھے سات کروڑ آباد ہیں۔ اگر یہ سب متفقہ طور پر اسلامی خدمت کے لئے صبر و استقامت کی ڈھال لیکر کھڑے ہو جائیں تو کیا کوئی طاقت ہے جو توحید کی بجلی پر غالب آجائے۔

دشمنان خدا ہمیشہ اسلام اور مسلمانوں کو صفحہ ہستی سے مٹا دینے کی کوشش کرتے رہے ہیں لیکن خدائے تعالیٰ کی نصرت اور توفیق سے مومنین کی قوت ایمانی اور استقامت ہمیشہ انکی کوششوں کے سامنے سد سکندری ثابت ہوئی ہے۔ اسلام خدا کا نور ہے جو ان کور چشموں کی معاندانہ پھونک سے کبھی نہیں بجھ سکتا۔

فرزندان توحید آج تمہارے ایمان و اخلاص کا امتحان ہے۔ خدا تعالیٰ دیکھ رہا ہے کہ کون اس کے جلال و جبروت کے سامنے سر جھکاتا ہے اور کون ہے جو دنیا کی ناپائیدار ہستیوں کے خوف سے خدا کی امانت میں خیانت کرتا ہے۔

اگر تم کو میدان محشر میں خدا کے سامنے پیش ہونا ہے اگر تم کو رسول پاک

صلعم کی استقامت کی آرزو ہے تو اسکے پاک دین کی حفاظت کرو۔ اس کے مقدس احکامات کی اطاعت کرو اس کی امانت توحید کو برباد نہ ہونے دو اور اس کی دی ہوئی عزت کو حقیقی عزت سمجھو۔

اسلام صرف عبادت کا نام نہیں ہے بلکہ وہ تمام مذہبی، تمدنی، اخلاقی، سیاسی ضرورتوں کے متعلق ایک کامل اور مکمل نظام رکھتا ہے جو لوگ کہ زمانہ موجودہ کی کشمکش میں حصہ لینے سے کنارہ کرتے ہیں اور صرف حجرہ میں بیٹھے رہنے کو اسلامی فرائض کی ادائیگی کے لئے کافی سمجھتے ہیں وہ اسلام کے پاک و صاف کے دامن پر ایک دھبہ لگاتے ہیں ان کے فرائض صرف نماز، روزہ میں منحصر نہیں بلکہ اس کے ساتھ اسلام کی عزت برقرار رکھنے اور اسلامی شوکت کی حفاظت کی ذمہ داری بھی ان پر ہے وفقنی اللہ ایاکم اما یحب ویرضیٰ۔

ہندو مسلم اتحاد

برادران وطن نے تمہاری اس مصیبت میں جس قدر تمہارے ساتھ ہمدردی کی ہے اور کر رہے ہیں وہ اخلاقی مروت اور انسانی شرافت کی دلیل ہے۔ اسلام احسان کا بدلہ احسان قرار دیتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ احسان کا نام ہے کہ آپ اپنی چیز کسی کو دیدیں۔ کسی دوسرے کی اٹھا کر دینے کو احسان نہیں کہتے۔ پس آپ برادران وطن کے احسان کے بدلے میں وہی کام کر سکتے ہیں جو شریفانہ طور سے اپنے اختیارات سے کر سکتے ہیں مذہبی احکام خدا کی امانت ہیں ان پر تمہارا اختیار نہیں اس لئے لازم ہے کہ حدود مذہب کے اندر رہ کر تمام احسان کے بدلے میں احسان کرو اور دونوں قومیں مل کر ایک ایسے زبردست دشمن کے مقابلے کے لئے کھڑے ہو جاؤ جو تمہارے ملک میں تمہاری آزادی کو پامال کر رہا ہے۔

(ج ۲۱)

جماعت علما جو حقیقۃً مسلمان کے مذہبی فائدے میں فرض ہے کہ اس وقت موقعہ کی نزاکت اور اہمیت کو نظر انداز نہ کریں۔ آپس کے نزاع اور اختلاف میں پڑ کر اصل مقصد کو خراب نہ کریں ورنہ مسلمانوں کی خرابی اور بربادی کی تمام ذمہ داری ان ہی پر عائد ہوگی علمی تدقیقات کے لئے آپ کے واسطے بہت سے میدان کھلے ہوئے ہیں۔ عبادت اور ریاضت کے لئے بہت سی راتیں بلا شرکت غیرے۔ آپ کو حاصل ہیں مگر جو کام کہ جبل احد اور میدان بدر میں ہوا وہ مسجد نبوی جیسی مقدس جگہ کے مناسب نہ تھا۔

آج احتجاج اور مطالبہ حقوق کے میدان صرف مظاہروں کے پلیٹ فارم ہیں۔ خلوتیں اور تنہائی کی راتیں اس کے لئے کافی نہیں ہیں کہ اگر موجودہ زمانے میں توپ اور بندوق اور ہوائی جہاز کا استعمال مدافعت اعداء کے لئے جہاد ہو سکتا ہے باوجودیکہ قرون اولیٰ میں یہ چیزیں نہ تھیں تو مظاہروں اور قومی اتحادوں اور متفقہ مطالبوں کے جواز میں کبھی تامل نہ ہوگا کیونکہ موجودہ زمانے میں ایسے لوگوں کے لئے کہ جن کے ہاتھ میں توپ اور بندوق اور ہوائی جہاز نہیں یہی چیزیں ہتھیار ہیں۔

معزز حاضرین! برطانیہ کا یہ دعویٰ کہ وہ کسی کے مذہبی امور میں مداخلت نہیں کرتی۔ آپ ہمیشہ سے سنتے آئے ہیں مگر میں پوچھتا ہوں کہ کیا ہندوستان کے مسلمان اپنے مذہبی امور میں آزادی کے ساتھ عمل کر سکتے ہیں۔ کیا سلطنت کا زبردست پنجہ ان کا گلا گھونٹنے کے لئے ہر وقت تیار نہیں۔ آج مولوی ظفر علی خاں اور مولوی لقاء اللہ صوفی اقبال احمد، مولوی محمد فاخر اور اسی طرح دوسرے فرزندان ہند کس جرم میں قید خانوں میں بند ہیں۔ کیا انھوں نے مذہبی احکام کی تبلیغ کے سوا اور کوئی گناہ کیا

تھا کیا مسلمانوں کے مذہبی احکام کے فتوے ضبط نہیں ہوئے کیا مسلمانوں کی ہزاروں خواتین اپنے نکاح و طلاق کے مقدمات میں غیر مسلم عدالتوں کے سامنے جاکر اسلامی احکام کے خلاف فیصلہ کرانے پر مجبور نہیں۔ کیا شفعہ و قبضہ مخالفانہ وغیرہ کے قوانین شریعت اسلامیہ کے موافق ہیں۔ یہ تمام چیزیں ہیں جن کی پوری نگہداشت جمعیت علما کے اہم فرائض میں سے ہے۔ اسی طرح اسلامی، مذہبی تعلیم کے لئے مفید نظام قائم کرنا اور تمام اسلامی درسگاہوں کو ایک سلسلہ میں منسلک کرنا بھی علماء کے ضروری فرائض میں داخل ہے۔ اسلامی اوقاف کا وسیع و عریض سلسلہ بھی ایک خاص نظم کا محتاج ہے۔ غرضکہ بہت سی اسلامی ضروریات ہیں جو علما کے ایک مرکز پر جمع نہ ہونے کی وجہ سے منتشر حالت میں ہیں۔ خدا تعالیٰ کا شکر اور احسان ہے کہ اس نے اپنی رحمت سے ان کو جمع کر دیا۔ اس اجتماع کی بدولت امید ہے کہ تمام پراگندہ اور منتشر امور کا نظام درست ہو جائے گا۔

قبل اس کے کہ میں اپنے بیان کو ختم کروں آپ حضرات سے ایک التجا کرتا ہوں وہ یہ کہ ہر حال میں خدائے قدوس پر بھروسہ رکھیں اور اپنی تدبیر کو تدبیر ہی کے مرتبہ میں سمجھیں۔ اسلامی احکام کی تعمیل کریں۔ اور مذہبی فرائض ادا کرنیکا مضبوط اور مستحکم عہد باندھ لیں۔ خدا کی رحمت نیک بندوں کے ساتھ رہتی ہے اور اسکا رحم ضعیفوں اور خدا پر بھروسہ رکھنے والوں کی مدد کرتا ہے۔ اے زندہ و قدوس خدا۔ اے ارحم الراحمین۔ اے شہنشاہ، رب، رب العالمین ہمارے گناہوں سے درگذر فرما اور ہمارے ضعف و ناتوانی پر رحم کر اعمال صالحہ کی توفیق دے۔ اور اپنے دین کی خدمت کیلئے ہمارے دل مضبوط کر دے۔ ہماری کلائیوں میں طاقت عنایت فرما۔ ہمارے اور اپنے دشمنوں کو

حضرت شیخ الہند کا آخری تحریری بیان

یہ بیان حضرت ..... کے حکم سے آخری اجلاس میں پڑھ کر سنایا گیا۔

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفٰی اما بعد

حضرات علماء کرام، حضار جلسہ! میں اولاً جمعیت کی تمام کارروائیوں کے باحسن اسلوب انجام پانے پر خدائے قادر و توانا کا شکر ادا کرتا ہوں۔ اور ثانیاً یہ عرض کرتا ہوں اگرچہ میں ناقابل انکار عذر کی وجہ سے آپ کے جلسوں کی شرکت سے بظاہر محروم رہا لیکن آپ یقین کیجئے کہ میرا دل آپ کے مجمع سے بہت کم غائب ہوا ہے اور مجھے یہ معلوم ہو کر نہایت مسرت ہوئی کہ جسم قوم کی روح (جماعت علما) نے بعض ان شعب سیاسیہ میں پھر ایک مرتبہ اپنی زندگی کا ثبوت پیش کیا ہے جن میں وہ بالکل مردہ سمجھی جاتی تھی۔ اور جن میں اگر وہ مردہ ثابت رہتی تو اسلامی عزت و وقار کا بالکل ہی خاتمہ تھا۔ آپ رنجیدہ نہ ہوں تو میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ کا علم و تدین اگر اب بھی عالم اسلامی کے خوفناک مصائب سے آنکھ بند رکھنے کی اجازت دیتا تو آج دنیا ہماری غیرت ایمانی اور شرافت انسانی دونوں کے ہیک وقت دفن کئے جانے پر ماتم کناں ہوتی۔

...

ہم ہلاک کریں حق کو فتح اور باطل کو شکست دے آمین یا ارحم الراحمین واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔[1]

---

[1] مدینہ۔ ۵، ۹ دسمبر سنہ ۲۰ء۔

اور اب بھی اگر ہم تجاویز پاس کر کے اور صرف چند ساعت کی گرمی محفل کو اپنی تمام تقریروں اور خطبوں کا ماحصل سمجھ کر منتشر ہو گئے تو ہماری مثال ٹھیک اس مریض کی سی ہو گی جو اکسیر شفا کی تکرار زبان سے بار بار کرتا ہے لیکن اس کا استعمال ایک دفعہ بھی نہ کرے۔

میں اس وقت آپ سے رخصت ہو رہا ہوں اور جو کچھ مجھے کہنا تھا خطبۂ صدارت میں کہہ چکا ہوں اور بسوط مولوی شبیر احمد صاحب عثمانی نے آپ کو آج ہی کے اجلاس میں سنایا ہے۔ اس کے ضمن میں بھی میرے مقاصد اور محسوسات نہایت خوبی سے ادا ہو گئے ہیں اور حضرات علما متدینین نے بحث و تمحیص کے بعد جو امور طے کئے ہیں ان سے یہ بندۂ ضعیف عملاً علیحدہ نہیں ہے۔ اس لئے اب مجھ کو اس سے زائد کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ہم سب مل کر متوکلاً علی اللہ ان طے شدہ تجاویز پر عمل کرنا اور عمل کرانا شروع کر دیں۔ جن سے ہمارے ایمان، ہمارے کعبہ، ہماری خلافت، ہماری عزت و آبرو اور ہمارے مقامات مقدسہ اور ہمارے وطنی اور قومی حقوق کا تحفظ ہو سکتا ہے۔ اگر اس وقت بھی ہم نے غفلت اور تن آسانی اختیار کی تو شاید عاقبت حاصل کرنے کا یہ آخری موقعہ ہو گا جس کو جان بوجھ کر ہم ہاتھ سے کھوئیں گے۔ جو صراط مستقیم آپ نے معلوم کر لیا ہے۔ قرآن و سنت کی روشنی میں اس پر سیدھے چلے جائیے اور یمین و شمال کیطرف مطلق التفات نہ کیجئے۔

ان ھذا صراطی مستقیما	میرے اس سیدھے راستے کی اتباع
فاتبعوہ ولا تتبعوا السبیل	کرو اور راستے نہ ڈھونڈو تاکہ تم سیدھی
فتفرق بکم عن سبیلہ	راہ سے نہ بھٹک جاؤ۔

جو لوگ اس وقت آپ سے علیحدہ ہیں ان کو بھی حکمت اور موعظت حسنہ سے اپنی جماعت کے اندر جذب کیجئے اگر اس میں مجادلہ کی نوبت آئے تو بالتی ہی احسن ہونا چاہیئے۔

کچھ شبہ نہیں ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ نے آپ کے ہم وطن اور ہندوستان کی سب سے زیادہ کثیر تعداد قوم (ہنود) کو کسی نہ کسی طریق سے آپ کے ایسے پاک مقصد کے حصول میں مؤید بنا دیا ہے اور میں ان دونوں کے اتفاق و اجتماع کو بہت ہی مفید اور مفنتیج سمجھتا ہوں اور حالات کی نزاکت کو محسوس کر کے جو کوشش اس کے لئے فریقین کے عمائدنے کی ہے اور کر رہے ہیں اس کی میرے دل میں بہت قدر ہے۔ کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ صورت حال اگر اس کے خلاف ہوگی تو وہ ہندوستان کی آزادی کو ناممکن بنا دے گی اور دفتری حکومت کا آہنی پنجہ روز بروز اپنی گرفت کا سخت کرتا جائے گا۔ اور اسلامی اقتدار کا اگر کوئی دھندلا سا نقش باقی رہ گیا ہے تو وہ ہماری بداعمالیوں سے حرف غلط کی طرح صفحۂ ہستی سے مٹ کر رہے گا۔ اس لئے ہندوستان کی آبادی کے یہ دونوں عنصر بلکہ سکھوں کی جنگ آزما قوم کو ملا کر اگر صلح و آشتی سے رہینگے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی چوتھی قوم خواہ وہ کتنی ہی بڑی طاقت ور ہو ان اقوام کے اجتماعی نصب العین کو محض اپنے جبر و استبداد سے شکست کر سکے گی۔ ہاں میں پہلے یہ کہہ چکا ہوں آج پھر کہتا ہوں کہ ان اقوام کی باہمی مصالحت و آشتی کو اگر آپ خوشگوار اور پائیدار رکھنا چاہتے ہیں تو اس کی حدود کو خوب اچھی طرح دل نشین کر لیجئے اور وہ حدود یہی ہیں کہ خدا کی باندھی حدود میں اس سے کوئی رخنہ نہ پڑے جس کی صورت بجز اس کے کچھ نہیں کہ اس صلح و آشتی کے تقریب سے فریقین کے مذہبی امور میں کسی

ادنیٰ امر کو بھی ہاتھ نہ لگایا جائے اور دنیوی معاملات میں ہرگز کوئی ایسا طریقہ اختیار نہ کیا جائے جس سے کسی ایک فریق کی ایذا رسانی اور دل آزاری مقصود ہو۔

مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اب تک بہت جگہ عمل اس کے خلاف ہو رہا ہے۔ مذہبی معاملات میں تو بہت لوگ اتفاق ظاہر کرنے کے لئے اپنے مذہب کی حد سے گذر جاتے ہیں لیکن محکموں اور ابواب معاش میں ایک دوسرے کی ایذا رسانی کے درپے رہتے ہیں

میں اس وقت جمہور سے خطاب نہیں کر رہا ہوں بلکہ یہ میری گذارش دونوں قوموں کے زعما لیڈروں سے ہے کہ ان کے جلسوں میں ہاتھ اٹھانے والوں کی کثرت اور رزولیوشنوں کی زبانی تائید سے دھوکہ نہ کھانا چاہیئے یہ طریقہ سطحی لوگوں کا ہے ان کو ہندو مسلمانوں کے نجی معاملات اور سرکاری محکموں میں متعصبانہ رقابتوں کا اندازہ کرنا چاہیئے۔

اگر فرض کرو ہندو مسلمان کے برتن سے پانی نہ پیئے یا مسلمان ہندو کی ارتھی کو کندھا نہ دے تو یہ ان دونوں کے لئے مہلک نہیں البتہ ان دونوں کی وہ حریفانہ جنگ آزمائیاں اور ایک دوسرے کو ضرر پہونچانے اور نیچا دکھانے کی وہ کوششیں جو انگریزوں کی نظروں میں دونوں قوموں کا اعتبار ساقط کرتی ہیں اتفاق کے حق میں سم قاتل ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ حضرات میرے اس مختصر مشورے کو سرسری نہ سمجھ کر ان باتوں کا عملی انسداد کریں گے۔

اب آخر میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ جل شانہٗ ہم کو اور آپ کو نیکی اور سمجھ دے اور ہمارے دلوں کو سیدھا کرنے کے بعد کج نہ کرے اور ہماری وجہ سے ہمارے مذہب پر حرف

پیغامات اور فتاویٰ

تہنیت نامہ کا جواب

۱۳ر جون سنہ ۲۰ء کو مسلمانان میرٹھ نے ایک تہنیت نامہ آپ کی خدمت میں پیش کیا تھا اس کا مندرجہ ذیل تحریری جواب حضرت شیخ الہندؒ نے یہ ارشاد فرمایا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ و سلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ اما بعد

بندہ ضعیف ناچیز اپنے برادران مکرمین کی خدمت میں نیازمندانہ عرض کرتا ہے کہ آپ حضرات نے جو سچی توجہ اور شفقت اس ناچیز کے حال پر غائبانہ اور حاضر وقتاً فوقتاً ظاہر اور بیان فرمائیں وہ اس قابل ہرگز نہیں کہ میں اس کا صرف شکریہ زبان سے ادا کر کے سبکدوش ہو سکوں۔ حق سبحانہٗ تعالیٰ اس کا نعم البدل دارین میں آپ کو عطا فرمائے جو تکالیف کہ اس عرصہ میں بندہ حقیر اور میرے مخلص رفقا کو پیش آئیں وہ اول تو مقدرات الٰہیہ سے تھیں جو ہمکو پیش آئیں بلکہ عالم کی آفرینش سے پہلے مقرر ہو چکی تھیں۔ دوسرے ارشاد اکابر "بحمد اللہ بہ مصیبتے گرفتارم نہ بمعصیتے" میری تسکین کے لئے ایک مضبوط دوسرا دلکو تضحیک کا موقعہ نہ دے اور ہمکو ہر ایک آسان اور کٹھن منزل میں صبر و استقلال کیسا تھ ثابت قدم رکھے اور اسوقت کے حالات سے بہتر حالات میں پھر ہمکو جمع کرے آمین یا رب العٰلمین۔[1]

---

[1] مدینہ۔ ۱۳ر دسمبر سنہ ۲۰ء۔

ذریعہ تھا۔ تیسرے جو تکلیف گذر چکی اس کی یاد کرنے کی نہ ضرورت نہ حاجت نہ قول قائل۔

سفینہ جبکہ کنارے پر آ لگا غالب ۔۔۔ خدا سے کیا ستم و جور ناخدا کہیئے

چہارم آپ حضرات مکرمین نے جو اپنے قدوم سے ہم ناچیز بندوں کی عزت افزائی کی وہ سب تکالیف کا پورا کفارہ ہے بدین وجوہ آپ حضرات کو کسی امر کا ملال نہ رہنا چاہیئے۔

والحمد للّٰہ ان مع العسر ۔۔۔ خدا کی تعریف تنگی کے ساتھ راحت ہے

یسرا ان مع العسر یسرا ۔۔۔ اور تنگی کے ساتھ راحت ہے۔

اے حضرات یہ امر معلوم ہو خدمت اسلام جو ہر مسلمان پر اس کے مرتبے کے موافق فرض ہے اس سے کسی قسم کا انحراف مسلمان کی شان سے بعید ہے یہ احقر بھی اپنی لیاقت اور استطاعت کے موافق اس کو بجا لانا اپنے اوپر فرض سمجھتا ہے وماتوفیقی الا باللّٰہ۔ جو امر احقر سے کسی وقت میں دریافت فرمایا جائے۔ اللہ کی عنایت سے امید ہے کرتا ہوں کہ اس کے اظہار میں ہرگز تامل نہ ہوگا۔ میں خدمت اسلام جو تمام عمر کرتا رہا ہوں اس خدمت کو ہمت اور راستبازی سے انجام دینے میں حاضر ہوں۔ اور اس کو ذریعہ نجات سمجھتا ہوں البتہ جو امر میری استعداد سے زائد ہو اور جس کا تحمل اور انجام دہی اس ضعیف سے ناممکن ہو اس میں اگر معذوری عرض کروں تو آپ حضرات سے امید قبول رکھتا ہوں والعذر عند کرام الناس مقبول۔ اس وقت چونکہ بوجوہ متعددہ معذور ہو رہا ہوں اس لئے کسی کوتاہی پر خیال نہ فرمایا جائے۔ آخر میں بکمال عجز و اظہار مسرت آپ کے سامنے اور اہل اسلام کے لئے حق تعالیٰ شانہ سے التجائے نجاح و فلاح

دارین کرتا ہوں۔ ارحم الراحمین ارحمنا وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین[1]۔

خلافت اور ترک موالات

بمبئی کمیٹی کے جلسہ میں حضرت شیخ الہندؒ نے ارشاد فرمایا جس کو مولانا شوکت علی صاحب نے فوراً ہی قلمبند کر لیا تھا اور اشاعت کے لئے مدینہ اخبار بجنور کو بھیجا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے۔

۱۔	ولا تنازعوا فتفشلوا و	آپس میں جھگڑا د کرو ورنہ بزدل ہو
	تذھب ریحکم واصبروا	جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی
	ان اللہ مع الصابرین	اور صبر کرو اللہ تعالیٰ صابرین کیساتھ ہے

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

۲۔	وتعاونوا علی البر والتقویٰ و	نیکی اور تقوے میں ایکدوسرے کی مدد
	لا تعاونوا علی الاثم والعدوان	کرو بدی اور گناہ میں اعانت نہ کرو
۳۔	ومن یتولھم منکم فانہ منھم	جس نے ان سے دوستی اور محبت باقی
	ان اللہ لا یھدی القوم الظلمین	رکھی وہ شخص بھی ان ہی میں شمار ہوگا

اللہ تعالیٰ ظالموں کو ہدایت نہیں کرتا

گر پڑے ہے آگ میں پروانہ سا کرم ضعیف

آدمی سے کیا نہ ہو لیکن محبت ہو تو ہو

امابعد:۔ آج جبکہ شرق وغرب کے مسلمانوں پر قیامت خیز مصائب کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے جبکہ اندیشہ ہے کہ خلافت اسلامیہ کا جہاز امنڈتے ہوئے طوفان میں موجوں سے

---

[1] مدینہ ۔۹ ؍ جولائی سنہ۲۰ء۔

ٹکرا کر خدانخواستہ پاش پاش ہو جائے جبکہ ہر فرد مسلم کی روح موت کی دھمکیاں دینے والے حوادث سے لرز رہی ہے بلکہ اگر عاقبت بینی سے کام لیا جائے تو ہر ایک ایشائی اور خصوصاً ہر ایک ہندوستانی اپنی اخلاقی حریت اور آزادانہ مستقبل کو سخت خطرہ کی نگاہ سے دیکھ رہا ہے۔ علمائے ہند کی تعداد کثیر اور ہندو، مسلم ماہرین سیاست کا بہت بڑا طبقہ اس جدوجہد میں ہے کہ اپنے جائز حقوق اور واجبی مطالبات کو پامال ہونے سے بچائے۔ کامیابی تو ہر وقت خدا کے ہاتھ میں ہے لیکن جو فرض شرعی، قومی اور وطنی حیثیت سے کسی شخص پر عائد ہوتا ہے اس کے ادا کرنے میں ذرہ برابر تقصیر کرنا ایک خطرناک جرم ہے۔

میں اصل فطرت سے کوئی سیاسی آدمی نہیں ہوں اور جیسا کہ میری طویل زندگی شاہد ہے میرا مطمح نظر ہمیشہ مذہب رہا ہے۔ اور یہی وہ مطمح نظر ہے جس نے مجھے ہندوستان سے مالٹا اور مالٹا سے ہندوستان پہونچایا۔ پس میں ایک لمحہ کے لئے کسی ایسی مفید تحریک سے اپنے کو علیحدہ نہیں پاتا جس کا تعلق تمام جماعت اسلام کے فوز و فلاح سے ہو یا وہ دشمنان اسلام کے حربوں کے جواب میں حفاظت خود اختیاری کے طور پر استعمال کی گئی ہو۔

مالٹا سے واپس آکر مجھے معلوم ہوا کہ ہندوستان کے ارباب بست و کشاد نے آخری طریق کار اپنے فرائض کی ادائیگی اور اپنے جذبات و حقوق کے تحفظ کا یہ قرار دیا ہے کہ وہ قرآن کریم کی ایک صریح تعلیم اور رسول کریم صلعم کے ایک روشن اسوۂ حسنہ کو مضبوط تھام لیں اور نفع و ضرر قومی کا موازنہ اور عواقب ملیہ کی پوری جانچ کر کے اس کو بے خوف و خطر انجام تک پہونچائیں اور وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اعداء اسلام کے ساتھ تعاون و موالات کو اعتقاداً و عملاً ترک کر دیں اسی مسئلہ کی شرعی حیثیت

ناقابل انکار ہے اور صادق مسلمان کی غیرت کا ایسے حالات میں یہی اقتضاء ہو تاکہ وہ
سرکاری اعزازوں و سرکاری خطابوں کو واپس کردے[1]۔

۲۔ ملک کی جدید کونسلوں میں شریک ہونے سے انکار کر دے۔

۳۔ صرف اپنی ملکی اشیاء اور مصنوعات کا استعمال کرے۔

۴۔ سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں اپنے بچوں کو داخل نہ کرے اسکے علاوہ جو
تجاویز وقتاً فوقتاً شائع کی جائیں ان پر عمل کرے بشرطیکہ

أ۔ اتباع احکام شریعت کیا جائے اور عمل درآمد میں خلاف حکم شرع کا ارتکاب
پیش نہ آئے۔

ب۔ نیز اس امر کا پورا لحاظ رکھا جائے کہ جن امور میں فساد یا نقض امن کا اندیشہ ہو
ان سے احتراز کیا جائے اور ہر کام میں افراط و تفریط سے بچ کر اعتدال مدنظر رہے۔

ج۔ ارشاد عثمانی :۔

اذا احسن الناس فاحسن	جب لوگ نیکی کریں تو ان کے ساتھ
معھم واذا اساؤا فاجتنب	رہو اور جب برائی کریں تو ان کی
اساءتھم	برائی سے بچو

کا لحاظ رکھنا ہر ایک امر میں مفید اور ضروری سمجھا جائے۔ واللہ الموفق والمعین[2]۔

مسئلہ ہجرت ایک مستفتی نے حضرت شیخ الہند ؒ سے مندرجہ ذیل استفسار کیا
جسکا جواب حضرت شیخ الہند ؒ نے عطا فرمایا سوال و جواب دونوں

---

[1] حضرت شیخ الہند ؒ اور علمائے ہند کا رجحان بلکہ مطالبہ دیکھ کر حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے اعزازات اور خطابات انگلشیہ کو واپس کر دیا تھا۔ مدینہ۔ ۱۷ اکتوبر ۱۹۲۰ء

[2] مدینہ۔ ۵ اگست ۱۹۲۰ء

درج ذیل ہیں۔

سوال:۔ میں سرکاری نوکری سے مستعفی ہو چکا ہوں اور خلافت کے اس نازک معاملے کو مدنظر رکھتے ہوئے جو اظہر من الشمس ہے برائے خدمت گذاری اسلام ہجرت کا ارادہ رکھتا ہوں۔ ذاتی معاملات کی صورت یہ ہے کہ والدین اس معاملہ میں ازحد مانع ہیں۔ میرے اور بھائی بفضلہ تعالیٰ جوان ہیں والد صاحب برسر روزگار ہیں اور یہی حالت میری اہلیہ کے والدین کی ہے۔ میری دو لڑکیاں ہیں جن کی عمر تین سال کے اندر اندر ہے چونکہ میں اپنے آپ کو یہاں کسی طرح مطمئن نہیں کر سکتا۔ اور ایک عظیم ولولہ دل میں ہجرت کا پیدا ہو چکا ہے اس لئے شرعی فتوے کی ضرورت تھی کہ متذکرہ بالا حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ (ض از ملتان)

جواب:۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

عنایت نامہ کاشف حالات ہوا۔ اس میں شک نہیں ہے کہ حالات موجودہ میں ہجرت کی ضرورت اور اہمیت ۔۔۔۔ سے انکار نہیں اور آپ جب اس امر کی اہمیت اور نزاکت کو کما حقہ سمجھ چکے ہیں تو آپ پر اس بارے میں جدوجہد فرض ہے اگر کوئی جاہل وغافل بعذر جہل قابل معافی سمجھا جائے تو ممکن ہے مگر جن کو حقیقت الامر منکشف ہو چکی ہے وہ کسی قسم کی معافی کے مستحق نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا بندہ کے نزدیک آپ جیسے باخبر اور قوی الہمت کے لئے اس امر میں ہرگز ہرگز کوتاہی جائز نہیں معلوم ہوتی۔

جس قدر امور اپنے متعلق آپ نے تحریر فرمائے ہیں اس میں قابل لحاظ والدین کی اطاعت اور زوجہ کی معیشت ہے اس لئے احتیاط اس میں ہے کہ آپ زوجہ اور صغیر اولاد کے گذران کی کوئی صورت فرما دیں اور والد سے حصول اجازت کی

کوشش بلیغ سے کام لیں۔ اگر والدین کسی طرح رو براہ نہ ہوں تو پھر مناسب ہے کہ آپ ہجرت کا ارادہ نہ فرمائیں بلکہ بطور خدمت گذاری اسلام اور بطور ملازمت ارادہ وہاں جانے کا فرمالیں اور ان کی عدم اجازت کی پرواہ نہ کریں۔ ہاں ارادہ یہ ضرور رکھیں کہ خدمت ضروری ہے جب فارغ ہوں گا والدین کی خدمت میں چلا آؤں گا اور آپ وہاں پہونچ کر جس تدبیر اور رائے سے مشورہ متعلقین کر کے اسلام کو نفع پہونچا سکیں اس میں کوشاں اور ساعی رہیں۔

بندہ محمود بقلم محمد مبین ۲۸ر ذیلقعدہ ۳۸ھ۔

خلافت کانفرنس کلکتہ علالت اور کمزوری کی وجہ سے آپ اس کانفرنس میں شریک نہ ہو سکے بلکہ اپنا ایک پیغام حضرت مولانا مرتضیٰ حسن صاحب کے بدست ارسال فرمایا جو کانفرنس کے بھرے اجلاس میں پڑھ کر سنایا گیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بندۂ ناچیز و ضعیف اپنے مکرمین اور مخلصین حضرات کی خدمت میں تسلیمات مسنونہ کے بعد ملتمس ہے۔ سب سے پہلے یہ عاجز آپ حضرات کی ان مساعی جمیلہ کا شکریہ واجب سمجھتا ہے جن کو آپ حضرات نے اپنی لگاتار کوششوں سے اپنے ملک و قوم اور ملت کی بہبودی کے لئے بے دریغ مبذول فرما رہے ہیں اور سوتے ہوؤں کو خواب غفلت سے جگا جگا کر اور کمزوروں کو چونکا چونکا کر مفید باتیں دکھا اور سنا رہے ہیں فجزاکم اللہ عنا احسن الجزاء وافضل الجزاء

اس وقت تمام ملک میں جو آثار بیداری کہیں زیادہ کہیں کم نظر آتے ہیں وہ

آپ ہی کی جدوجہد کا نتیجہ اور آپ ہی کی جان توڑ مسلسل محنت اور ہمت کا ثمرہ ہے
اللّٰھم زد فزد۔

اس کے بعد یہ عرض ہے کہ آپ حضرات نے جو اس ناتواں اور ناکارہ کو یاد فرما کر عزت واحترام کے ساتھ مکرر سہ کرر اپنی شرکت سراسر برکت کے لئے طلب فرمایا اس کا جواب بجز لبیک کے کچھ نہ تھا مگر کیا عرض کروں ہجوم عوارض اور کمزوری طبیعت ایسی سد راہ ہے کہ باوجود عزم واشتیاق شرکت کسی طرح حرکت نہ کر سکا اور افسوس کے ساتھ آپ حضرات کی تعمیل سے بالکل قاصر رہا۔ آپ کے اخلاص کریمانہ سے بوجہ اپنی معذوری قوی کے معافی کا مستحق ہوں۔ اب بجز اس کے کیا کر سکتا ہوں کہ حق سبحانہ تعالیٰ آپ کے نیات ومساعی میں برکت عطا فرمادے اور اہل اسلام اور تمام ملک کو اس کی خیر وبرکت سے مستفیض کرے یہ دورافتادہ باوجود ضعف وناتجربہ کاری آپ کی ہمدردی وشرکت میں باذن اللہ ہرگز قاصر نہیں فالحمد للہ۔

یہ ضرور ہے کہ ترک موالات وغیرہ جملہ امور میں انجام بینی اور احتیاط سے کام لیا جائے کسی جوش اور جذبہ کی اتباع بغیر تامل ومشورہ ہرگز نہ کی جائے واللہ الموفق والمعین[1] بندہ محمود عفی عنہ ۱۰ ذی الحجہ

---

[1] کلکتہ کے اس اجتماع کہ جس میں یہ پیغام پڑھ کر سنایا گیا ہندوستان بھر کے دو سو علما سے زیادہ شریک تھے جنہوں نے حضرت شیخ الہندؒ کے مکتوب کی روشنی میں ترک موالات کے متعلق ٹھوس تجاویز پاس کیں جن کے بارے میں اخبار مدینہ راقم ہے۔ "چونکہ یہ حضرت رسول کریم صلعم کے نائبین کا اجتماع ہے یعنی علمائے ہند کی کانفرنس ہے اس لئے اس کی تجاویز دراصل فتاوی تھیں۔

مدینہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۲۰ء

مسئلہ ہجرت

ڈیرہ اسماعیل خاں سے ایک استفسار کے جواب میں آپ نے تحریر فرمایا۔

مخدوم و مکرم بندہ جناب خلیفہ صاحب مدفیوضکم!

احقر محمود تسلیم مسنون کے بعد عرض رسا ہے جناب کا والا نامہ ایسے وقت پہونچا کہ بندہ سہارنپور گنگوہ وغیرہ گیا تھا وہاں سے کل واپس آیا تو جناب کا گرامی نامہ بندہ کو ملا۔ مگر سب جانتے ہیں کہ ہجرت کی فضیلت اور خوبی ہر وقت مسلمہ ہے کہ اس کے استحباب اور استحسان میں ہر طرف سے تاکید وجوب محسوس ہوتا ہے جو اہل محبت کے عمل کرنے کے لئے بالکل کافی ہے اب اس میں خواہ مخواہ فرضیت اور عدم فرضیت کا مباحثہ اور منازعت کرنا ان ہی لوگوں کا کام ہے جو حیلہ جو طبائع رکھتے ہیں اور ایک حق کو رلانا چاہتے ہیں۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ اس تحقیق کی چند جوانب ملحوظ رکھنا ضروری ہیں۔

۱۔ دارالحرب کہ جس سے ہجرت کریں اس کو غور سے ملاحظہ کرنا۔

۲۔ جس دارالاسلام میں جانا چاہتے ہیں اس کے احوال پر نظر کرنا۔

۳۔ جو ہجرت کریں ان کے حالات کو پیش نظر رکھنا کیونکہ حالات بیحد مختلف ہیں خلاصہ یہ ہے کہ یہ وقت پریشانی کا ہے اور اہل اسلام کی آزمائش کا ہے۔ پس اہل اسلام اس سے جان نہ چرائیں اللہ کے واسطے ہجرت کریں۔ اس ضروری وقت کو بحث و مباحثہ میں صرف نہ کریں۔

ہجرت ضروری ہے تو ایسی ضروری نہیں کہ نہ والدین کی اجازت کی حاجت ہو اور نہ اہل و عیال کی کفالت اور جملہ اہل اسلام کو علی العموم ہجرت لازم کر دی جائے اور مستحب ہے تو ایسی مستحب بھی نہیں کہ تمام اہل ہند بے حس و حرکت ہو کر آرام و اطمینان

سے اس دارالکفر میں لمبے پیر پسار کر سوتے ہیں بلکہ فرض ہے کہ ہر شخص اپنی ہمت اور وسعت کے مطابق تائیدوں کے لئے مال اور جان سے کوشش کرے خواہ یہاں رہے یا کہیں باہر جاوے۔ لہٰذا موافق اکابر اور عمائد اسلام پر علی الخصوص واجب ہے کہ خود ہمت کریں اور عوام کو ہمت بندھائیں اور جو شخص جس کام کے لائق ہو اس کو اس کام میں لگائیں اور بحث و اختلافات جس کا منشا نفسانیت ہے اس سے بچیں اور دوسروں کو بچائیں اور العلم حجاب اللہ کے مصداق نہ بنیں۔ احقر نے حالات موجودہ پر نظر کر کے جو مناسب حق سمجھا جناب کی خدمت میں پیش کر دیا۔ باقی عبارات کتب جن کو ہمارے علماء نے اپنے قول کی مؤید سمجھ کر اپنے استدلالات پیش فرمائے ہیں ان کا مطلب اہل علم جو سمجھ رہے ہیں اس میں مجھ کو عرض کرنے کی حاجت نہیں۔ میں نے فقط یہ عرض کیا ہے کہ ہجرت فرض ہے یا مستحب قابل غور یہ ہے کہ ہم کو اس حالت میں کیا کرنا چاہیئے۔

گر قبول افتد زہے عز و شرف

احقر اس خاص وقت میں ایسی منازعت کو نہایت منحوس اور مضر سمجھتا ہے

والسلام۔ ۳ ذی الحجہ۔ بندہ محمود عفی عنہ[1]

ایک دوسرا فتویٰ

علیگڑھ کالج خلافت کمیٹی کی اپیل پر آپ نے تحریر فرمایا۔ میں آج کل بیمار ہوں اس لئے مفصل جواب نہیں دے سکتا صحت رو بہ صلاح ہے۔ ۲۹ اکتوبر سے پہلے پہلے عدم تعاون کی کامل تائید میں مفصل جواب عرض کروں گا۔ مختصر یہ ہے کہ ایک فرزند اسلام کو اپنی طاقت و قوت[م]

---

[1] مدینہ۔ ۱۳ اکتوبر ۱۹۲۰ء۔

ترکِ موالات پر حضرت شیخ الہندؒ اور مولانا تھانویؒ کا اختلاف

استفتا کیا فرماتے ہیں علمائے دین و شرع متین اس مسئلہ میں
۱۔ اس وقت جو گورنمنٹ سے مدارس میں بضرورت زیادتی اخراجات مدارس امداد لی جاتی ہے اس امداد کا ترک موالات کی وجہ سے لینا جائز ہے یا نہیں۔
۲۔ جو وظائف کہ سرکاری کی طرف سے طلبا کو اور خطاب یافتہ اصحاب کو ملتے ہیں ان کا لینا ان کو جائز ہے یا نہیں۔
۳۔ طلبہ کے ذمہ والدین یا دیگر مربیوں کو بغیر اطلاع دیئے ہوئے بلا ان کی مرضی ایسے مدارس کو چھوڑ دینا واجب ہے یا نہیں۔
۴۔ جن کا نان و نفقہ طلبہ کے اوپر فرض ہے مثلاً اولاد یا زوجہ یا والدین ضعیف

حوصے عدم تعاون کی تائید کرنی چاہیئے۔ میں نے اپنے خیالات کا اظہار پہلے ہی کر دیا ہے میں اب بھی عدم تعاون اختیار کرنے پر زور دیتا ہوں مجھے توقع ہے کہ برادران اسلام اتحاد اتفاق اور اخوت و یگانگت کو ہاتھ سے نہ دینگے۔ تاکہ اعدائے اسلام کو ہمارے اتفاق سے فائدہ حاصل کرنیکا موقع نہ ملے اور آپ اس طرح سے ذلیل و رسوا نہ ہوں۔[1]

---

[1] مدینہ ۲۸ اکتوبر ۱۹۲۰ء۔

ان کو چھوڑ کر ہم کو لوجہ اللہ خلافت کے کام میں لگ جانا ضروری ہے یا نہیں۔

۵۔ جن مدارس میں کہ سرکاری امداد لی جاتی ہے یا جو والی ریاست ترک موالات اور مسئلہ خلافت کے مخالف ہوں ان سے کچھ رقم ملتی ہے ایسے مدارس میں پڑھنا یا پڑھانا یا ان میں امامت وعظ و نصیحت یا مذہبی تعلیم دینے کے امور کے انتظام کرنیکی ملازمت کرنا جائز ہے یا نہیں۔

۶۔ اپنے ذاتی اخراجات کے لئے اور ان لڑکوں کیلئے جن کا نان و نفقہ اس کے ذمہ فرض ہے بقدر مایکفی خلافت کے بیت المال سے لینا جائز ہے یا نہیں۔

۷۔ ان لوگوں سے کیا معاملہ رکھنا چاہئیے جو سرکاری ملازم ہیں یا ایسے مدارس میں ملازم ہیں جن کو سرکار سے امداد ملتی ہے۔

۸۔ مسئلہ خلافت اور ترک موالات میں اہل ہنود سے اتحاد رکھنا اور ان سے امداد و اعانت (یعنی خواہ مالی ہو یا زبانی یا اور کسی قسم کی) جائز ہے یا نہیں۔

۹۔ مدرستہ العلوم علیگڑھ کے درزی فنڈ کا روپیہ یا اس کی عمارتیں جو تقریباً چالیس لاکھ روپیہ کی ہیں اور کتب خانہ جو کثیر رقم کا ہے اور دیگر حوائج کی اشیاء جو ہزار ہا روپیہ کی مالیت کی ہیں ان تمام چیزوں کی حفاظت اور ہر چیز کو اپنے مصرف میں کرنا ممبران مدرسہ کے ذمہ فرض ہے یا نہیں۔

۱۰۔ جو طلبا انگریزی خواں ہیں ان کے لئے شرعاً یہ ضروری ہے کہ وہ علم دین کی تکمیل میں مشغول ہوں تاکہ فارغ التحصیل ہو کر دوسروں کو تعلیم دیتے رہیں یا ایسے طلبا کو اس وقت ترک موالات و خلافت کو کامیاب بنانا ضروری ہے۔ خلاصہ سوال یہ ہے کہ تکمیل علوم دینیہ کو ترجیح ہے یا ترک موالات یا خلافت کے کام میں مشغول ہونیکو۔

طلبا مدرسۃ العلوم علیگڑھ
صفر ۱۳۴۹ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جواب الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں رلائے کیوں

ان مسائل کا جواب سننے سے پہلے نہایت ضروری ہے کہ ایک مسلم صادق تمام گرد و پیش کے خیالات سے علیحدہ ہوکر اپنے ایمان کی قدر و قیمت اور شعار الٰہیہ کی عظمت اور مقامات مقدسہ کی تقدیس و احترام کو اچھی طرح دل نشین کرے اور دور رس ماضیہ کے ساتھ واقعات حاضرہ پر ایک گہری نظر ڈالے تو اس کو معلوم ہوگا کہ آج مسلمانوں کی سب سے بڑی متاع گرانمایہ جس کا تحفظ ہر ایمان رکھنے والے کا اولین فرض ہے کس طرح لوٹی جارہی ہے اور کن کن شرمناک عیاریوں اور روباہ بازیوں سے جزیرۃ العرب کے متعلق پیغمبر اسلام فداہ ابی و امی کی سب سے اہم وصیت کا مقابلہ کیا جارہا ہے۔
اعداء اللہ نے اسلام کی عزت اور شوکت کی بیخ کنی کرنے میں کوشش کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ عراق، فلسطین اور شام میں جن کو صحابہ اور تابعین رضی اللہ عنہم نے خون کی ندیاں بہا کر فتح کیا تھا پھر کفار کی حریصانہ حوصلہ مندیوں کے جولا نگاہ بن گئے۔ پیراہن خلافت کی دھجیاں اڑا دی گئیں۔ خلیفۃ المسلمین جس کی ہستی سے تمام روئے زمین کے مسلمانوں کی ہستیوں کا شیرازہ بندھتا ہے اور جو بحیثیت ظل اللہ فی الارض ہونے کے آسمانی قانون کا رائج کرانے والا اور مسلمانوں کے حقوق و

مصالح کا محافظ اور شعائر اللہ کی صیانت کا ضامن اور کلمۃ اللہ کی رفعت کا کفیل تھا وہ بھی بیشمار دشمنوں کے نرغہ میں پھنس کر بے دست و پا ہو چکا ہے۔

صبت علے مصائب لو انھا

صبت علے الایام صرن لیا لیا

رسول اللہ صلعم کا جھنڈا (خاکم بدہن) سرنگوں ہو رہا ہے۔ حضرت عبیدہ، سعد بن ابی وقاص، خالد بن ولید، اور ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہم کی روحیں اپنی خوابگاہوں میں بے چین ہیں۔ یہ سب کچھ کیوں ہے اس لئے کہ مسلمانوں میں سے غیرت اور حمیت مفقود ہو رہی ہے۔ جو جرأت دینی اور حرارت ان کی میراث تھی وہ انھوں نے غفلت اور تعیش کے نشہ میں دوسروں کے حوالہ کر دی۔

یہی نہیں کہ اس مصیبت کے وقت ایک مسلمان نے دوسرے کی مدد نہیں کی بلکہ قیامت تو یہ ہے کہ کفار کی موالات اور اعانت اور وفاداری کے شوق میں ایک مسلمان نے دوسرے کی گردن کاٹی۔ بھائی نے بھائی کا خون پیا اور دشمنوں کے سامنے سرخرو ہونے کے لئے اپنے ہاتھ اپنے ہی خون میں رنگے۔

اے فرزندان اسلام اور اے محبان ملت و وطن آپ کو مجھ سے زیادہ معلوم ہے کہ جس برق مسلم سوز نے ان بلاد اسلامیہ کے خرمن آزادی کو جلایا اور خلافت اسلامیہ کے قصر کو آگ لگائی اس کا اصلی ہیولیٰ عربوں اور ہندوستانیوں کے خون گرم سے تیار ہوا تھا اور جس دولت سے نصاریٰ ان ممالک مقدسہ میں کامیاب ہوئے اس کا بہت بڑا حصہ تمہارے ہی دست بازو سے کمایا ہوا تھا پس کیا اب بھی کوئی ایسا بلید و غبی مسلمان پایا جاتا ہے جس کو نصاریٰ کی موالات اور مناصرت کے نتائج قبیحہ معلوم

نہ ہوئے ہوں اور ایسی تشویشناک حالت میں جبکہ ڈوبتا ہوا آدمی ایک تنکے کا سہارا ڈھونڈتا ہے، وہ اس فکر میں ہو کہ کوئی صورت موالات کے جواز کی نکالے۔

اے میرے عزیز! یہ وقت استحباب اور فرضیت کی بحث کا نہیں ہے بلکہ غیرت اسلامی اور حمیت دینی سے کام لینے کا ہے۔ کہیں علمائے زمانہ کا چھوٹا بڑا اختلاف تمہاری ہمتوں کو پست اور تمہارے ولولوں کو پژمردہ نہ کر دے۔ میں تم سے اس وقت یہ نہیں کہتا کہ تم تلوار لیکر جہاد کرو یا عراق و شام میں جاکر اپنے بھائیوں کا ساتھ دو بلکہ صرف اس قدر درخواست کرتا ہوں کہ اپنے دشمنوں کے بازوؤں کو قوی مت بناؤ اور حق تعالیٰ شانہ کے ان ارشادات پر نہایت مستعدی اور جوانمردی اور اخلاص نیت سے عمل کرو۔

۱۔	یٰایھا الذین اٰمنوا لا تتخذوا الیھود والنصاریٰ اولیاء بعضھم اولیاء بعض ومن یتولھم منکم فانہ منھم	اے ایمان والو! یہود اور نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ۔ وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں تم میں سے جو بھی انسے دوستی کریگا وہ انھیں میں شمار ہوگا۔
۲۔	لا یتخذ المومنون الکٰفرین اولیاء من دون المومنین ومن یفعل ذلک فلیس من اللہ فی شیء	مومن کو چاہیئے کہ وہ مومنوں کو چھوڑ کر کافروں سے دوستی نہ گانٹھے اور جو ایسا کرے گا وہ اللہ کے نزدیک حق پر نہیں ہے۔
۳۔	بشر المنافقین بان لھم عذاباً الیماً الذین یتخذون الکافرین اولیاء من دون	ان منافقوں کو خوشخبری سنا دیجئے جو مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں سے دوستی گانٹھتے ہیں کیا ان کے پاس

المومنین۔ ایبتغون عندھم
العزۃ فان العزۃ للہ جمیعا

سے عزت چاہتے ہیں۔ عزتیں تو سب
اللہ ہی کے لئے ہیں۔

۴۔ یاایھا الذین امنوا لاتتخذوا
الکافرین اولیاء من دون
المومنین تریدون ان تجعلوا
للہ علیکم سلطانا مبینا

اے ایمان والو! مسلمانوں کو چھوڑ کر
کافروں سے دوستی نہ کرو کیا تم یہ
چاہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کی تم پر کھلی ہوئی
حجت قائم ہو جائے۔

۵۔ یاایھا الذین امنوا لاتتخذوا
الذین اتخذوا دینکم ھزوا
ولعبا من الذین اوتوا الکتاب
من قبلکم والکفار اولیاء و
اتقوا اللہ ان کنتم مومنین

اے ایمان والو! جن لوگوں نے اپنا
دین کھیل کود اور مذاق کو بنا رکھا ہے
وہ تم سے پہلے اہل کتاب اور کفار ہیں
ان کو دوست نہ بناؤ۔ اور اللہ سے
ڈرو۔ اگر تم مومن ہو۔

۶۔ تری کثیرا منھم یتولون
الذین کفروا لبئس ما قدمت
لھم انفسھم ان سخط اللہ
علیھم وفی العذاب ھم
خالدون۔ ولو کانوا یومنون
باللہ والنبی وما انزل الیہ
ما اتخذوھم اولیاء ولکن کثیرا
منھم فاسقون

ان میں سے بہت سے تم ایسے دیکھو گے
جو رفیق بنتے ہیں کافروں کے بیشک
برا ہے وہ جو آگے بھیجا ہے انھوں نے
خود اپنے لئے کہ اللہ کا غضب ہے ان
پر اور وہ ہمیشہ عذاب میں رہیں گے اگر
یقین رکھتے وہ اللہ پر اور نبی پر اور اس
پر جو نبی کی طرف اتارا ہے تو کافروں
کو رفیق نہ بناتے لیکن ان میں سے

بہت سے نافرمان ہیں

۷۔	لاتجدوا قوماً یومنون باللہ	تم کسی ایسی قوم کو نہ پاؤ گے جو خدا اور
	والیوم الآخر یوادون من	آخرت پر تو ایمان رکھتی ہو اور اللہ
	حاد اللہ ورسولہ ولو کانوا	اور اس کے رسول سے دشمنی رکھنے والوں
	اٰباءھم او ابناءھم او اخوانھم	سے دوستی رکھتی ہو اگرچہ وہ انکے باپ
	او عشیرتھم اولئک کتب	ہوں یا بیٹے ہوں یا بھائی ہوں یا
	فی قلوبھم الایمان وایدھم	خاندان والے ہوں ایسے ہی لوگوں
	بروح منہ ویدخلھم جنت	کے دلوں میں اللہ نے ایمان رکھدیا
	تجری من تحتھا الانھار	ہے اور اپنی روح کے ذریعہ انکی مدد کی
	خالدین فیھا رضی اللہ عنھم	اور ان کو جنت میں داخل کریگا جنکے
	ورضوا عنہ اولئک حزب	نیچے نہریں جاری ہیں اور وہ ہمیشہ
	اللہ الا ان حزب اللہ ھم	اس میں رہیں گے اللہ ان سے راضی ہے
	المفلحون۔	اور وہ اللہ سے راضی ہیں یہی لوگ اللہ

کی جماعت ہیں اور اللہ ہی کی جماعت کامیاب ہوتی ہے۔

۸۔	یاایھا الذین اٰمنوا لاتتخذوا	اے ایمان والو! میرے اور اپنے دشمن
	عدوی وعدوکم اولیاء تلقون	کو دوست نہ بناؤ۔ تم تو ان سے محبت
	الیھم بالمودۃ وقد کفروا بما	ظاہر کرتے ہو اور وہ تمہارے حق کا انکار
	جاءکم من الحق	کرتے ہیں۔

اس مضمون کی آیات قرآن مجید میں بکثرت ہیں جن کا استیعاب مقصود نہیں مگر اسقدر واضح

رہے کہ اولیا، کا ترجمہ جو ہم نے دوست سے کیا ہے اس کا مآخذ امام ابن جریر طبری اور حافظ عماد الدین ابن کثیر اور امام فخر الدین رازی وغیرہم اکابر مفسرین کی تصریحات ہیں۔ ہماری نظر میں صرف اسقدر رہے کہ ترک موالات کے تحت میں جیسا کہ ان کی امداد کرنا داخل ہے اسی طرح ان سے امداد لینا بھی ہے لہٰذا آپ کے سوال اول، دوم کا جواب یہ ہوگا کہ مدارس میں جو امداد گورنمنٹ سے لی جاتی ہے اور جو وظائف طلبا وغیرہ کو ملتے ہیں وسب قابل ترک ہیں اور اس ترک موالات میں طلبا اپنے والدین کی اجازت کے محتاج نہیں ہیں بلکہ ان کا حق ہے کہ وہ ادب اور تہذیب کے ساتھ اپنے والدین کو بھی ترک موالات پر آمادہ کریں۔

اس وقت جو قلبجان بعض طلبا کو پیش آ رہا ہے۔ عہد نبوت میں بھی بعض مومنین کو پیش آیا تھا چنانچہ انھوں نے رسول اللہ صلعم کی خدمت میں عرض کیا کہ یا رسول اللہ کفار سے بالکل علیحدگی اور قطع تعلق کس طرح ہو سکتا ہے۔ اگر ہم ایسا کریں گے تو اپنے ماں باپ، اپنے بھائیوں اور سب خویش و اقارب سے چھوٹ جائیں گے۔ ہماری تجارتیں تباہ ہو جائیں گی۔ ہمارے اموال ضائع ہوں گے اور ہماری بستیاں اجڑ جائیں گی۔ اس کا جواب حق تعالیٰ نے یہ عنایت فرمایا کہ

قل ان کان اٰباءکم وابناؤکم	کہدو تمھارے باپ اور تمھارے بیٹے اور
واخوانکم وازواجکم وعشیرتکم	تمھارے بھائی اور تمھاری بیویاں اور
واموالِ اقترفتموھا وتجارۃ	تمھارا کنبہ اور مال جو تم نے کمایا ہے اور
تخشون کسادھا ومساکن	تجارت جس کی کساد بازاری سے تم ڈرتے
ترضونھا احب الیکم من اللہ	ہو اور مکان جو تم کو پسند ہیں اگر یہ سب

ورسولہ وجہاد فی سبیلہ	خدا اور خدا کے رسول اور خدا کی راہ
فتربصوا حتی یاتی اللہ بامرہٖ	میں جہاد کرنے سے زیادہ عزیز ہیں
واللہ لایھدی القوم	تو منتظر رہو تاکہ لے آئے اللہ اپنے
الفاسقین	حکم کو اور اللہ دستگیری نہیں کرتا جو نافرمان ہیں۔

کبھی دل میں یہ وسوسہ گذرتا ہے کہ یہ تحریکات جو ملک میں پھیل رہی ہیں خدا نہ کرے کہ وہ ناکام ہوں اور گورنمنٹ اپنی ضد پر اڑی رہے تو ہم کو سخت ضرر پہونچنے کا اندیشہ ہے اس طرح کے معاملات اس زمانہ میں بھی پیش کئے گئے تھے چنانچہ قرآن مجید میں ہے کہ

یقولون نخشیٰ ان تصیبنا	کہتے ہیں کہ ہمارے دوستانہ تعلقات
دائرۃ	یہود کے ساتھ اس لئے ہیں کہ زمانہ کی

گردش سے کہیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ارادے ناکامیاب ہوں اور یہود غلبہ حاصل کرلیں تو اسوقت ہمارے لئے بڑی مصیبت کا سامنا ہوگا۔

اس کے جواب میں حق تعالیٰ شانہ نے فرمایا۔

عسی اللہ ان یاتی بالفتح	قریب ہے کہ لے آئے اللہ تعالیٰ فتح یا
اوامر من عندہٖ فیصبحوا	اور کوئی بات اپنے پاس سے پھر
علیٰ ما اسروا فی انفسہم نادمین	منافقین ان خیالات پر نادم ہوکر

رہ جائیں گے جو انکے دلوں میں مکنون ہیں

پس اے میرے عزیزو! تم اللہ پر بھروسہ کرکے اور اس کی رسی کو مضبوط تھام کر اپنے عزم پر قائم رہو اور موالات نصاریٰ ترک کرو اور اپنی استطاعت کے موافق جو خدمت گذاری اسلام اور اہل اسلام کی کرسکتے ہو اس سے درگذر نہ کرو کہ اب وقت درگذر کا

نہیں ہے۔

حسن اتفاق سے اس وقت ہندوستان کی سب سے بڑی کثیر تعداد قوم (ہنود) کا مطمح نظر بھی تمہاری ہمدردی اور واقعات پنجاب اور خواہش سیلف گورنمنٹ کی وجہ سے ترک موالات مع النصاریٰ ہے اور ابھی حال میں سنا گیا ہے کہ سکھ لیگ نے بھی فیصلہ کر لیا ہے اس موقع کو غنیمت سمجھ لینا چاہیئے۔ تم اپنی نظر فقط خدا پر رکھو تمہارا دوست اور مددگار صرف وہی ہے۔ البتہ جو قومیں تمہارے اس پاک مقصد میں خود بخود شریک ہو جائیں یا تمہاری تائید یا غمخواری کریں ان سے تم بھی مصالحت اور رواداری کا برتاؤ کرو اور مروت اور حسن سلوک سے پیش آؤ قرآن حکیم میں ہے۔

لاینھاکم اللہ عن الذین	اللہ ان لوگوں کے متعلق جو دین کے
لم یقاتلوکم فی الدین ولم	معاملے میں تم سے نہیں لڑے اور نہ انھوں
یخرجوکم من دیارکم ان	نے تم کو تمہارے گھروں سے نکالا اس
تبروھم وتقسطوا الیھم	سے نہیں منع کرتا کہ تم ان کیساتھ بھلائی
ان اللہ یحب المقسطین انما	اور منصفانہ سلوک کرو بلاشبہ اللہ
ینھاکم اللہ عن الذین	انصاف کرنے والوں کو چاہتا ہے اللہ
قاتلوکم فی الدین واخرجوکم	تو ان لوگوں کی دوستی سے روکتا ہے
من دیارکم وظاھروا علے	جو تم سے دین کے معاملہ میں لڑے اور
اخراجکم ان تولوھم ومن	تم کو تمہارے گھروں سے نکالا اور تمہارے
یتولھم منکم فاولئک ھم	نکالنے میں امداد پہونچائی اور جو لوگ
الظالمون۔	ان سے دوستی رکھیں وہی ظالم ہیں۔

اس موقعہ پر اس قدر تنبیہ ضروری ہے کہ ہندو اور مسلمان پر ان تعلقات کا اثر یہ نہ ہونا چاہیئے کہ مسلمان اپنے کسی حکم کو بدل ڈالیں یا شعائر کفر و شرک کو اختیار کرنے لگیں اگر وہ ایسا کریں گے تو نیکی برباد گناہ لازم کی مثال اپنے اوپر منطبق کرینگے۔

میری عرض یہ ہے کہ آپ ترک موالات پر نہایت دیانت سے عمل کریں اور خاص خدا پر اپنی نظر رکھیں اور جن طلبہ سے حقوق واجبہ فوت نہ ہوتے ہوں وہ اس تحریک کی تبلیغ میں بھی حصہ لیں بقدر ضرورت تعلیم دینی اور ضروریات زندگی حاصل کرنے کے بعد آج کل یہ مشغلہ نہایت ہی سود مند ہے۔ حق تعالیٰ ہم سب کو اپنے مرضیات پر چلنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔

باقی جن لوگوں کے ذمہ اولاد یا بیوی یا ماں باپ کے حقوق ہوں وہ اسی حد تک اس کام میں حصہ لیں جہاں تک ان کی خبرگیری سے اغماض نہ ہو کہ وہ بھی فرض ہے اور اگر خلافت کی امداد و حفاظت میں سعی کرنے والے کو بقدر اس کی ضروریات کے خلافت کمیٹی اس چندہ میں سے جو اس کام کے لئے کیا گیا ہو کچھ حق الخدمت دے اسکا لینا بھی جائز ہے۔

الحاصل موالات کفار حرام ہے اور جہاں تک قدرت ہو اپنے کو اور دوسروں کو اس سے بچانا ضروری ہے اور ہر مسلمان کو چاہیئے کہ اپنی توجہ سب سے ہٹا کر اسی رب العزت سے وابستہ کرے جس کے ہاتھ میں ہر ایک شاہ و گدا کی باگ ہے۔

مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار
بگزارند و سر طرۂ یارے گیرند

اب بندہ یہ التماس ختم کرتا ہے۔ اس قدر معروض ہے کہ بندہ کوئی مفتی نہیں۔

فتویٰ لکھنا دوسرے علما کا کام ہے تاہم امید کرتا ہوں کہ میری معروضات سے آپ کو اپنے سوالات کا جواب مل جائے گا اور علیگڑھ کالج کی عمارتوں اور کتب خانوں کی حفاظت کے ساتھ ساتھ یہ بھی خیال آپ کے دل کو دستک دے گا کہ قسطنطنیہ، شام فلسطین اور عراق کی قیمت سے ان چیزوں کی قیمت کو کیا نسبت ہے۔

بالکل آخر میں مجھے یہ کہہ دینا بھی ضروری ہے کہ تحریک ترک موالات کا موجودہ حالات میں کامیاب بنانا صرف اس پر منحصر ہے کہ کوئی حرکت ہماری طرف سے ایسی نہ ہونی چاہیے جو نقض امن یا سفک دما کے موجب ہو۔ اور یہی نصیحت اس ملک کے تمام سربرآوردہ دانشمندوں کی ہے اس کو دانتوں سے مضبوط پکڑ لیا جائے ورنہ فائدہ کی جگہ نقصان کا اندیشہ ہے۔

آپ کا خیر اندیش:۔ بندہ محمود عفی عنہ مورخہ ۱۲ صفر ۱۳۳۹ھ[1]

حضرت تھانویؒ کا مکتوب

اس مسئلہ میں حضرت تھانوی کا فتویٰ ملاحظہ فرمانے سے قبل ایڈیٹر مدینہ بجنور کا نوٹ ملاحظہ فرمایئے تاکہ کچھ پس منظر سمجھ میں آجائے۔ ایڈیٹر صاحب تحریر فرماتے ہیں

حضرت مولانا شیخ الہندؒ مدظلہ کا فتویٰ ترک موالات کی موافقت میں درج ہو چکا ہے۔ جس کے شائع کرنے سے پیشتر ہماری نظر سے اخبار مشرق اور علیگڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ میں مولوی ظفر احمد صاحب عثمانی کے نام سے شائع کردہ ایک اور فتویٰ گذرا جس پر گزٹ میں موٹے حروف میں مولوی اشرف علی صاحب کی خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون کا فتویٰ بطور عنوان درج تھا۔ چونکہ یہ ایک نئی بات تھی کہ ایسی ذمہ داری کا عالمانہ فتویٰ

---

[1] مدینہ، ۱۷ نومبر ۱۹۲۰ء۔

حضرت مولوی اشرف علی صاحب تھانوی کی طرف منسوب ہو اور دستخط خود ان کے نہ ہوں اس لئے ہم نے احتیاطاً مولوی اشرف علی صاحب ممدوح کی خدمت میں ایک عریضہ دریافت حال کے لئے ارسال کیا لیکن اس کا جو جواب موصول ہوا اس سے ابہام کی کی کوئی تشفی نہ ہوئی حضرت موصوف کے الفاظ یہ ہیں۔

السلام علیکم:۔ میں پہلے ایسے سوالات کا جواب سادگی سے لکھ دیتا تھا مگر تجربہ سے اس کا غیر مفید ہونا معلوم کر کے اب لکھنے کو دل نہیں چاہتا ...... اس مختصر عبارت سے مولوی ظفر احمد صاحب کے شائع کردہ فتوے کی نہ تصدیق پائی جاتی ہے نہ تکذیب۔ خاکسار ایڈیٹر کو دہلی میں ایک واقف حال بزرگ اور مستند عالم کی زبانی معلوم ہوا کہ یہ فتویٰ مولوی اشرف علی صاحب کا نہیں ہے۔[1]

مذکورہ تحریرات پر حضرت مدنی کا تبصرہ

مولوی ظفر احمد صاحب عثمانی اور مولوی حبیب احمد صاحب کیرانوی کی پے در پے چند تحریریں شائع ہوئی ہیں جن کی رو سے طرح طرح کے خیالات و غلط فہمیاں اور بدگمانیاں پیدا ہوگئی ہیں لہٰذا ضروری ہوا کہ ان تحریرات کے متعلق یہ خاکسار بحیثیت خادم آستانہ حضرت شیخ الہندؒ ہونے کے امر واقعی کا اظہار کرے۔

۱۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ یہ تحریرات[2] حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب کی تحریرات ہیں اور یہ خیالات ان کے خیالات ہیں لیکن ان میں سے ایک تحریر بھی حضرت مولانا کے نام اور دستخط کیساتھ شائع نہیں ہوئی اس لئے مولانا کی طرف ان کا انتساب محض خیالی اور بلا دلیل بات ہے۔

---

[1] مدینہ۔ ۱۳؍ نومبر ۱۹۲۰ء [2] مسئلہ انتخاب شیخ الہند میں ناکردہ تقصیر غالباً اسی کو کہا گیا ہے۔

۲۔ ان تحریرات میں علمی اور شرعی حیثیت سے غلطیاں ہیں جن کی پوری تفصیل بھی کسی وقت شائع کی جائے گی۔

۳۔ مولوی ظفر احمد صاحب اور مولوی جنیب احمد صاحب[1] حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہٗ کی خدمت اور طویل صحبت سے مستفید نہیں ہوئے یعنی ان دونوں صاحبوں کو حضرت مولانا کی خدمت میں رہ کر کچھ زیادہ استفادہ کا موقع نہیں ملا ہے اس بنا پر ان کو حضرت اقدس کے جذبات اور احوال سے پوری اطلاع نہیں اور ان کا یہ لکھنا کہ مولانا مرحوم مغفور ہمارے ہم خیال ہیں بالکل غلط ہے اور سراسر واقعہ کے خلاف ہے۔

۴۔ ان کی تحریرات میں بہت سی باتیں حقانیت اور واقعیت اور حضرت مولانا کے جذبات کے بالکل مخالف ہیں۔

۵۔ ان کا یہ کہنا کہ مولانا مرحوم و مغفور بوجہ ضعیف العمری اور مصائب و امراض رائے صائب نہیں رکھتے ایک نہایت شنیع حملہ ہے بالخصوص اس بات کا لحاظ کرتے ہوئے کہ ان صاحبوں نے حضرت مولانا کی خدمت میں حاضر ہو کر اس کا تجربہ بھی نہیں کیا بلکہ محض اپنی مطلب براری کے لئے حضرت مولانا کو اختلال حواس کا الزام لگا دیا۔

۶۔ اسی طرح ان کا یہ لکھنا کہ مولانا کو سیاسیات سے زیادہ واقفیت نہ تھی محض دروغ و افترا اور حضرت مولانا قدس سرہٗ کی علمی و عقلی و فراستی بے نظیر مہارت پر نہایت

---

[1] یہ ہر دو حضرات، حضرت تھانوی کے خاص مریدین میں کہیں۔ موخر الذکر کی کیرانہ میں اس اعتراض پر کہ "حضرت شیخ الہندؒ نے تو یہ سب ڈھونگ اپنی شہرت کے لئے رچایا ہے" بہت زیادہ پٹائی ہوئی تھی۔ (اصلاح بجنور، ۸ جنوری سنہ ۲۰ء) لیکن اس جگہ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ ترک موالات کے متعلق حضرت تھانویؒ نے جو فتویٰ صادر فرمایا تھا اس سے رجوع کی اطلاع مع تبصرہ .... اصلاح بجنور بابت ۲۰ فروری سنہ ۲۱ء میں شائع ہوئی ہے اور حضرت مدنیؒ کا یہ بیان نومبر سنہ ۲۲ء کا ہے۔ واللہ اعلم کیا معاملہ ہے۔

رکیک جملے ہے حضرت مولانا مرحوم نے تمام عمر اخلاص و صداقت میں گذاری خلوت وجلوت میں یکساں رہتے تھے۔ آپ دم وصال تک کسی خارجی اثر سے متاثر نہیں ہوئے اگر کسی نے کبھی آپ کو خلاف حق یا خلاف منشا مائل کرنے کی کوشش کی تو فوراً انکار کر دیا یا رد دیا ہے۔ معاملات اور سیاسیات میں اس قدر فہم و فراست رکھتے تھے کہ بڑے سے بڑے لیڈر اور سیاسی لوگ بھی دنگ رہ جاتے تھے۔ آپ کی عقل و فراست و تقویٰ و دیانت ہوش و حواس آخر وقت تک ساتھ رہے صرف آخری سانس سے چند منٹ پہلے سے سکوت ہو گیا تھا اور بس۔

آخری ایام مرض وفات میں اٹھنے بیٹھنے اور زیادہ بات چیت کرنے سے مجبور ہو گئے تھے مگر آپ کی عالی ہمتی بلند حوصلگی جوش حقانیت، جذبہ صداقت، عقل و شعور میں سر مو تفاوت نہیں ہوا تھا۔ یہ تمام اوصاف اسی طرح باقی رہے جیسے خدا تعالیٰ کے ایک بے طمع اور بے خوف کامل اور قوی بندے میں ہوتے ہیں۔

حضرت مولانا کی جانب سے کوئی تحریر انکی رائے اور حکم اور سننے کے بغیر شائع نہیں کی گئی آخری ایام میں جب کہ ضعف و مرض کیوجہ سے خود لکھنے سے عاجز ہو گئے اپنے بعض خدام کو مضمون بتا کر حکم دیتے تھے کہ اس مضمون کو مرتب کر لو۔ ترتیب مضمون کے بعد خود سنتے اور ضروری اصلاح دیتے اور اسکے بعد اشاعت کی اجازت دیتے آپ کی طرف منسوب تحریرات میں سے کوئی تحریر آپکی اصلاح سے خالی نہیں رہی۔ اب آپ خیال فرما سکتے ہیں کہ جو لوگ کل مولانا مرحوم کے یہاں نہ تو حاضر باش رہے اور نہ مولانا کے متوسل ہیں نہ ان کے شاگرد نہ انکے عزیز نہ اقارب نہ انکے ہم وطن اگر وہ دور ہی دور سے بیٹھے بیٹھے حضرت مولانا کے متعلق اور آپکے خیالات و جذبات کی نسبت رائے زنی کریں تو وہ سوائے ظن و تخمین کے ہم

مکتوبات مالٹا وغیرہ سے
حکیم محمد حسن صاحب کے نام

الحمد للہ رب العالمین والعاقبۃ للمتقین

اخ معظم .... اکرمکم اللہ وسلّم

کل انتظار مدید کے بعد آپ کا خط ساتویں جمادی الاول کو لکھا ہوا ہم کو مالٹا میں ملا۔ سب کی خیریت مجمل معلوم ہو کر مسرت ہوئی۔ الحمد للہ۔ عزیز مسعود کے بعد[1] چھ ماہ میں آپ کا خط آیا۔ بہت غنیمت معلوم ہوا بقول شخصے ؎

یوں اسیران قفس تک پہونچا کوئی گلبرگ
جیسے غربت میں شفیقان وطن کا کاغذ

چند خطوط بعض رفقا نے اور بھی روانہ کئے ہیں غالباً پہونچے ہوں گے

---

[1] غالباً حج کر لینے کے بعد جب قاضی مسعود صاحب تشریف لائے تھے اور پھر انھوں نے جا کر افشائے راز کر دیا تھا اس وقت کے خط کی طرف اشارہ ہے۔

ہم کسی مد میں شمار ہو سکتی ہے اور جبکہ اپنے قول کی تقویت اور اپنی کار برآری کیلئے مولانا پر الزام لگائیں تو سوائے خود غرضی انکی کیا وقعت ہو سکتی ہے۔ اگر ناظرین سمجھیں تو ہم مولوی ظفر احمد صاحب کی علمی اور شرعی غلطیاں مفصل طور پر ظاہر کریں؟

---

[1] مدینہ۔ یکم جنوری ۲۱ء۔

بالجملہ ہم سب بحمد اللہ خیریت سے ہیں اور راحت سے ہیں۔ آپ کو خط[1] لکھنے کے پندرہ بیس روز بعد یہ ہوا کہ ہم لوگ مصر سے کچھ ترقی کر کے مالٹا آ گئے۔ مسافت تو کچھ بڑھ گئی مگر تکلیف کچھ نہیں بلکہ یہاں راحت زیادہ ہے۔ الحمد للہ گو اس عرصہ میں حالات وطن سے بے خبری رہی مگر دو روز درانکے وہ حالات معلوم ہوئے جو خواب میں بھی نہ دیکھے تھے۔ آدمی جب تک زندہ ہے حرکت زمانی تو کسی وقت رکتی نہیں مگر حرکت زمانی اور مکانی دونوں ملکر بہت سے انکشافات جدیدہ کی موجب ہو گئیں۔

تبدیٰ لك الایام ماکنت جاھلاً

ویاتیك بالاخبار من لم تزود

ترجمہ:- عنقریب زمانہ بہت سی نامعلوم باتیں تجھ پر ظاہر کر دیگا اور تجھے وہ شخص خبر دیگا جسے تو نے کوئی توشہ اور اجرت بھی نہیں دی۔

متعدد اسباق و دیگر مشاغل میں اچھی طرح گذر رہی ہے۔ ادھر و ترجون من اللہ مالا یرجون کا مبارک سلسلہ بھی ایسا نہیں کہ جو کسی وقت منقطع ہو جائے۔ الحمد للہ ثم الحمد للہ گھر میں سب کو اور مکان میں بچوں کو سلام کہہ دینا فقط والسلام۔[2]

بندہ محمود عفی عنہ ۲۲۱۹

---

[1] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے مصر کے قید خانہ سے بھی کوئی مکتوب ارسال فرمایا تھا۔
[2] ماخوذ از رسالہ شیخ الہند۔

حافظ زاہد حسن صاحب امروہی کے نام

از مالٹا   ھوالرحمٰن الرحیم

سراپا فضل وکرم دام لطفکم   السلام علیکم ورحمتہ اللہ

عنایت نامہ سراپا شادمانی ہوا۔ جناب کی یادآوری کا مشکور ہوں۔ اور اس پر متاسف ہوں کہ اس سے پہلے جو آپ نے خطوط بھیجے قسمت کی نارسائی سے ایک بھی نہیں ملا۔ یہ بات تو ضرور ہے کہ یہ دور افتادہ کسی مخلص کو ابتدائً خط لکھنے سے عمداً بھی کچھ رکتا ہے مگر جس قدر ابتدا کرنے سے قاصر ہوں اس سے زیادہ جواب دینے میں چست ہوں خطوط کا حال ایسا ہی ہے جو مل گیا مل گیا۔ نہ ملا نہ ملا۔ جتنی چائے بھی اس وقت تک نہیں پہونچی۔ ان مخلصان مراد آباد اور مکرمان امروہہ شریف کی خدمات میں سلام عرض کر دیجئے جن کو یہ ناکارہ یاد رہ گیا ہو۔ اور جو بھول گئے ہوں سو خیر۔ بالخصوص مدرسین امروہہ۔ اور مراد آباد سے ضرور سلام عرض کر دیجئے۔ خوب یاد آیا سنبھل جناب منشی صاحب[1] کی خدمت میں سلام و نیاز پہونچا دیجئے۔ اگرچہ ایک کارڈ صرف ہو۔ خدا کرے آپ سب حضرات خیریت سے ہوں۔ احقر کے پاس کارڈ یا خط بھیجنے میں ٹکٹ لگانا فضول ہے۔ جملہ رفقاء اور ان کے طفیل سے یہ ناکارہ بحمد اللہ خیریت اور راحت سے ہیں۔ آپ کی اس موٹی مراد آبادی چائے نماز نے بہت کام دیا۔ آپ کی عنایات کو یاد دلاتی رہتی ہے۔ یہ تو فرمائیں مولانا مرحوم[2] کے صاحبزادے کس مشغلہ میں ہیں کتب ضروریہ سے فارغ بھی ہو چکے؟ اللہ کرے بخوبی فارغ ہو کر اپنے مقدس بزرگوار کے پیرو ہوں۔ جملہ رفقاء آپ سب حضرات کو سلام مسنون عرض کرتے

---

[1] منشی حمید الدین صاحب سنبھلی حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کے متوسلین میں سے تھے۔

[2] مراد حضرت مولانا احمد حسن صاحب امروہی۔ متوفی ۱۳۳۰ھ

ہیں. آپ کے کارڈ پر تاریخ نہ تھی مگر ہم کو اخیر محرم میں ملا. یہ عریضہ ۲۹ محرم کو روانہ کرتا ہوں. جناب سید صاحب بالاجمال سب جگہ کو خیریت لکھدیں. مناسب ہے سنبھل بچھرایوں. نگینہ وغیرہ. والسلام علیکم.

مالٹہ. سنیٹ کلیمنٹ براکس ۲۹ محرم ۱۳۳۶ھ
محمود حسن ۲۲۱۹

دوسرا خط ایضاً

سراپا فضل وکرم دام لطفکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کا گرامی ۶ شعبان ہم کو ذی الحجہ میں وصول ہوا. ممنون فرمایا. آپ کی اور جمیع حضرات امروہہ، مرادآباد، سنبھل، نگینہ، حسن پور، بچھرایوں کی بالاجمال خیریت معلوم ہوئی. الحمد للہ وجزاکم اللہ.

مکرما! کیا عرض کروں. اس قدر بُعد پر اپنے مکرمین واحباب سے تعلق میں کچھ کمی واقع نہیں ہوئی. اس لئے بالاجمال بھی خیریت معلوم ہوکر یک گونہ سکون ضرور ہوجاتا ہے، اور حوادث ہندوستان معلوم ہوکر مکروہ وپریشانی ہوتی ہے. جب کسی کی خیریت معلوم ہوتی ہے یک گونہ اطمینان ہوجاتا ہے اللہ تعالیٰ سب کو عافیت دارین عطا فرمائے. اس سے میں یہ سمجھتا ہوں کہ مرنے کے تعلق سے گو احیاء کے قلوب میں یکسوئی یا غفلت آجاتی ہے جیسا کہ مشاہد ہے مگر غالباً اموات کے تعلق قلبی میں کمی نہیں آتی گو کسی حال میں ہوں واللہ اعلم

جب سے بعض خطوط سے معلوم ہوا ہے کہ مولوی احمد شاہ صاحب بوجہ ضعف و

مرض ترک تعلق کر کے وطن آ گئے۔ بار بار خیال آ کر ملال ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اور ان بزرگوں کی برکت سے ان کو جملہ افکار و تکالیف سے محفوظ رکھے۔ الحمد للہ قاضی صاحب بخیر اپنے مرکز پر قائم ہو گئے۔ ان کے خط کے جواب میں ایک عریضہ روانہ کیا تھا خدا کرے کہ پہونچ گیا ہو۔ غالباً آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ رفیق جان نثار مولوی سید نصرت حسین بماہ ذیقعدہ پیش قدمی کر کے راہی آخرت ہوئے۔ اللہ تعالیٰ رحمت اور مغفرت فرماوے ان کی والدہ صاحبہ کو اطلاع کر دی تھی۔ کوئی ان کا خط ابھی تک نہیں آیا۔ باقی سب رفیق بخیریت ہیں۔ آپ کو اور سب کو سلام عرض کرتے ہیں۔ آپ کی دال اور گوشت کی پارسل سے خوشی ہوئی۔ مگر اس وقت تک کوئی نہیں پہونچا۔ آپ کو تحریر جواب میں بھی اس لئے تاخیر کی کہ پارسل آ جاویں تو آپ کو رسید بھی پہونچ جاوے۔ مگر افسوس ہے کہ اسوقت تک نہیں پہونچا۔ احباب مراد آباد کی خدمت میں سلام عرض ہے۔ جو صاحب پارسل بھیجنے کا ارادہ فرماویں ان کو منع کر دیجئے۔ اول تو چنداں حاجت نہیں۔ دوسرے اس قدر مسافت میں ضائع ہونے کا خطرہ۔ تیسرے پینٹھ چھٹر فی شروع ہے رفتہ رفتہ متفرق طور پر لوگ جا رہے ہیں۔ سو یہ احتمال ہے کہ پارسل کہاں پہونچے۔ مرسل الیہ کہاں ہو۔ مولوی کفایت اللہ[۱] صاحب سے بعد سلام مسنون فرما دیجئے کہ اپنی سعی کو اس زائد امر میں صرف نہ فرمائیں۔ اس میں شک نہیں کہ کسی مخلص کا کوئی پارسل آتا ہے تو مسرت ہوتی ہے۔ اس لئے کہ علامت محبت ہے۔ باقی سعی اور ترغیب یقیناً مکروہ معلوم ہونی چاہیئے۔ مولوی امین الدین[۲] وجملہ ان کے مدرسین کو سلام۔ قاری سید محمد[۳] صاحب کو سلام مسنون۔ کاش آپ یہ بھی لکھدیتے کہ کتب درسیہ سے فارغ ہو گئے۔

۱؎ مراد مفتی کفایت اللہ صاحب ۲؎ بانی مدرسہ امینیہ دہلی ۳؎ مراد حضرت محدث امروہی کے صاحبزادے جناب قاری بنے میاں صاحب۔

اور اب یہ شغلہ ہے والسلام وفقط

اپنے مدرسہ اور دیگر مواقع میں جہاں سلام پہونچا سکیں پہونچا دیجئے۔

مالٹا سینٹ کلیمنٹ براکس۔ ۲۰ صفر محمود حسن ۱۳۳۹ھ

مکتوب ۱

اخی فی دین اللہ الا حدرزقکم اللہ علما نافعا وعملا متقبلا

احقر محمود۔ سلام مسنون کے بعد ملتمس ہے آپ کا عنایت نامہ پہونچا۔ خیریت معلوم ہو کر اطمینان ہوا اور عزم سفر مبارک سے مسرت ہوئی حق سبحانہٗ آپ کو بخیر لاوے اور قبول فرماوے۔ وہاں کی خصوصیات سے یہ بات ہے کہ مکہ میں حرم شریف کی نماز باجماعت کا پورا التزام کیا جاوے اور وہاں کی حاضری اور کثرت طواف جدوجہد کے ساتھ کی جاوے اور مسجد نبوی کی بھی جماعت اور حاضری میں اہتمام ہو اور روضۂ مطہرہ کے سامنے جس قدر ہو سکے حاضر رہنا اور وہاں بیٹھنا نعمت کبریٰ سمجھا جاوے مگر جس قدر بیٹھنا ہو غایت تعظیم وحرمت اور توجہ تام اور شوق وخشوع کے ساتھ ہو باقی سفر میں اپنے کام میں مستعد اور ہوشیاری سے رہنا چاہیئے جس پر اطمینان نہ ہو اس کی شرکت سے اجتناب بہتر ہے۔ اگر سفر میں کسی قسم کی تشویش یا تکلیف پیش آوے تو گھبرانا نہ چاہیئے بلکہ اس تکلیف کو بھی شوق ومحبت کے ساتھ برداشت کرنا چاہیئے۔ حفت الجنۃ بالمکارہ ہر ایک حاجت عسر ویسر میں اللہ پر اعتماد ہو کسی سے کچھ توقع نہ کی جاوے۔ مکہ مکرمہ میں کوئی شخص جس کو خط لکھوں یاد نہیں آتا اور مدینہ طیبہ میں مولوی حسین احمد صاحب اور ان کے ہر دو بھائی موجود ہیں وہ انشاءاللہ آپ کی رفاقت کریں گے۔ ان کو خط کی حاجت نہیں اور ان سے جو حاجت ہو بے تکلف فرمادیں وہ تعمیل کریں گے اور میرا سلام بھی ان کی اور ان کے والد ماجد کی

خدمات میں عرض کردینا آپ کے خواب اول کا یہ مطلب معلوم ہوتا ہے کہ باذن اللہ عالم میں اسلام کو فروغ ہو اور انوار سنت عالم میں جلوہ گر ہوں واللہ اعلم ۱۲ بندہ حقیر آپ کے مطالب دارین کے لئے دعا کرتا ہے اور انشاء اللہ کرتا رہے گا۔ واللہ معکم این ماکنتم والسلام فقط

مواقع متبرکہ اور اوقات مخصوصہ میں بندہ کو دعائے خیر سے گاہ گاہ یاد کرلیا جاوے واللہ لایضیع اجر المحسنین۔ مولانا مسعود احمد صاحب خیریت سے ہیں مدرسہ دیوبند میں خیریت ہے۔ والحمد للہ۔

مکتوب ۵

برادر مکرم بارک اللہ فیکم وعلیکم۔

بندہ محمود — سلام مسنون کے بعد ملتمس ہے مولوی کفایت اللہ صاحب کے خط سے آپکی تشریف بری کی خبر معلوم ہوئی تھی خط لکھنے کا ارادہ کرتا تھا مگر پورا پتہ معلوم نہ تھا۔ الحمد للہ آپ کے خط سے خیریت اور دیگر حالات معلوم ہو کر اطمینان ہوا۔ بخیر و خوبی اس سفر مبارک طویل کا انجام پذیر ہوجانا حق تعالیٰ کا انعام ہے فلہ الحمد والمنۃ۔

بچہ کے انتقال سے افسوس ہوا مگر کچھ مضائقہ نہیں آپ کا فرط خیر کہ میں ہاجس سے خیر و فلاح کی توقع ہے اللہ تعالیٰ قبول فرماوے آمین۔

اللہ کے فضل سے جب آپ کو اس وقت فراغت ہے تو ضرور زم کرکسی کار خیر میں لگ جائیں۔ حیات دنیوی کا کچھ اعتبار نہیں آدمی سے جو کچھ ہوسکے اس میں دیر نہ کرے "ای ز غفلت بے خبر در ہر چہ باشی زود باش" مگر آپ تمام جوانب پر نظر ڈال کر یہ طے کرلیں کہ مقام کہاں مناسب اور سہل ہوگا چونکہ اہلیہ بھی معیت میں ہیں اسلئے

تامل کر لینا بہتر ہے وطن میں سہولت ہوتی ہے عورات اور اطفال کو باہر رہنے میں دقت ہوتی ہے۔ آپ تو یہاں رہے ہوئے ہیں۔ آپ کو انشاء اللہ پریشانی نہ ہوگی۔ بہتر ہو جو آپ ایک دو مرتبہ استخارہ بھی کر لیں اور پھر جو رائے ہو اس کو قائم کریں۔ یہ بھی خیال کر لیجئے کہ وہاں کے قیام میں وہاں کے لوگوں کو ہدایت ہو جانے کی توقع ہے اور بدعات میں اور لوگوں کی جہالت میں کمی ہونے کی امید ہو سکتی ہے اتنے میں آپ بہنوں کے عقد سے فارغ ہوں۔ اس عرصہ میں ان امور کو باطمینان طے فرمالے ویں۔ آپ کی تحریر کے موافق دربارہ طلبی ایک تحریر روانہ کئے دیتا ہوں آپ جملہ جوانب سے مطمئن ہو کر اگر یہاں آنے کی ہی رائے قائم ہو جاوے تو اس تحریر کو دکھلا دیں تازہ سانحہ یہ گذرا کہ میری بڑی لڑکی عوارض اسقاط میں انتقال کر گئی۔ آپ اس کی مغفرت کی دعا ضرور فرماویں۔ یہ امر بھی ملحوظ ہے آپ کے قیام کی وجہ سے وہاں کے مدرسہ میں کسی حد تک ترقی ہو سکے گی۔ ایک صورت یہ بھی ہے کہ آپ برس روز چھ مہینے کیلئے آجاویں اور اسکے بعد وطن چلے جاویں اور پھر وہاں کی باتوں کو انجام دیں۔ بہرحال جو صورت مناسب اور مفید تر نظر آوے اسے معین فرماویں۔ واللہ ولی التوفیق۔ والسلام فقط

بندہ محمود عفی عنہ۔ جمعہ

مکتوب ۶

برادر معظم اکرمکم اللہ وسلم

بندہ محمود سلام مسنون کے بعد ملتمس ہے۔ عرصہ کے بعد آپ کا عنایت نامہ صادر ہوا۔ آپ کی خیریت معلوم ہو کر مسرت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ آپکو خیریت کے ساتھ اپنی مرضیات کی توفیق روز افزوں عنایت فرماوے آدمی کو لازم ہے کہ وقت کو ضائع نہ کرے اپنی وسعت کے موافق نیک کام اور نیک خیال میں لگا رہے اور جہاں

رہے۔ ہر وقت مفید کام سے غافل نہ ہو۔ بندہ بھی بحمد اللہ خیریت سے ہے اور مدرسہ میں
بھی سب خیریت سے ہیں۔ خواب مبارک و مفید ہے۔ اول خواب میں اس امر کی
ہدایت معلوم ہوتی ہے کہ آدمی کو صرف اپنے نفع پر اکتفا نہ کرنا چاہیئے بلکہ خلق اللہ کی نفع
رسانی ہر امر خیر میں ملحوظ رہے۔ خواب دوم میں اس امر کی طرف تنبیہ ہے کہ جملہ مرغوبات
نفس صرف زندگی تک نظر آتے ہیں بعد حیات کارآمد نہیں آدمی کو ایسے کاموں کی طرف
متوجہ ہو جانا چاہیئے جو بعد میں کام آویں۔ تیسرے خواب میں اس کی طرف اشارہ معلوم
ہوتا ہے کہ بحمد اللہ آپ کی طلب مقبول اور آپ کی دوستی اور تربیت اور اصلاح
عند اللہ ملحوظ ہے اور آپ کو کسی مقبول بندہ سے نفع پہونچےگا مزنی حضرت امام شافعی
کے بلا واسطہ شاگرد رشید اور غالباً امام طحاوی کے ماموں ہیں ۱۰ اکابر علماء اور مشاہیر
میں سے ہیں رحمۃ اللہ علیہ۔ باقی خیریت ہے۔ والسلام فقط مولوی حسین احمد صاحب دیوبند
میں مقیم ہیں۔ بعد رمضان عزم مدینہ طیبہ مصمم رکھتے ہیں

بندہ محمود عفی عنہ۔ یکشنبہ

مکتوب ۱۷

مخدوم بندہ دام فضلکم

بندہ محمود سلام مسنون کے بعد ملتمس ہے ذیقعدہ کے آخیر میں
آپ کا گرامی نامہ مع بلٹی پہونچا تھا۔ بندہ گنگوہ وغیرہ چلا گیا۔ جواب میں اسلئے تساہل
ہو گیا۔ لیموں اور ادرک بجنسہٖ پہونچ گئی۔ مفتی صاحب مہتمم صاحب اور بعض حاجیوں
کو بھی پہونچا دیا گیا۔ لیموں بہت بڑے تھے اور ادرک تازہ عمدہ باقی بندہ بحمد اللہ
خیریت سے ہے اور مدرسہ میں بہمہ وجوہ خیریت ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو خیریت سے رکھے
اور فلاح دارین عطا فرماوے۔ مولوی محمد شفیع صاحب سے سلام فرمادیجئے مولوی

حسین احمد صاحب کی بکہ سے خیریت آگئی مدینہ طیبہ سے کوئی خط نہیں آیا. ڈاک بھی بند معلوم ہوتی ہے حرب و ضرب کا طول بڑھتا جاتا ہے تشویش میں ترقی ہے. اللہ تعالےٰ انجام بخیر کرے. مولوی محمد میاں دیوبند میں ہیں خیریت سے ہیں. بعض تدابیر میں مشغول ہیں مقدمہ کے لئے روپیہ کی بھی فکر میں ہیں اللہ تعالیٰ کامیاب فرماوے اپنے اوراد التزام سے کئے جائیں. حق سبحانہٗ استقامت نصیب کرے. مولوی عزیر گل گھر گئے ہیں. مولوی خان محمد صاحب خیریت سے ہیں ان کا سلام قبول ہو. اپنی خیریت سے مطلع فرماتے رہیئے. والسلام فقط

بندہ محمود عفی عنہ شنبہ

مکتوب ۸

مکرم بندہ السلام علیکم

آپ کا خط اس وقت ملا جب کہ میں جہاز پر سوار ہونے کے لئے لب دریا پڑا ہوں. اس وقت سند لکھنے سے مجبور ہوں. انشاء اللہ دوسرے وقت لکھدوں گا. آپ کی ہمشیرہ خدیجہ عائشہ اور جو درخواست کریں اور آپ مناسب سمجھیں ان کی بیعت قبول کرتا ہوں اللہ تعالیٰ برکت دے سب کو صبح وشام کا وظیفہ مع تاکید نماز وغیرہ فرمادیجئے. سعی فی الدین کا خیال رہے. اللہ مددگار ہے آپ کے لئے انشاء اللہ دعا کرتا رہوں گا. آپ بھی دعا فرماتے رہیں. اور سب سے سلام فرما دیجئے. والسلام فقط

بندہ محمود عفی عنہ بمبئی شنبہ

مکتوب ۹

برادر مکرم ومحترم مد فیوضکم. السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کا محبت نامہ ۱۴ر صفر کا آٹھ نو ماہ کے بعد ذیقعدہ کے شروع

میں مجھ کو ملا، بہت ہی مسرت ہوئی۔ آپ کی یادآوری کا ممنون اور آپ کی خیریت معلوم ہونے سے مسرور ہوں...... الحمد للہ۔

بخاری شریف، ہدایہ وغیرہ کتب کی تدریس سے بہت خوشی ہوئی اللہ تعالیٰ آپ کے علم وعمل میں برکت دے اور اپنے بندوں کو آپ کے فیض سے مستفیض فرماوے یہ عاجز حق سبحانہ تعالیٰ کی رحمت اور آپ کی دعا سے مع جملہ رفقاء بہمہ وجوہ خیریت سے ہیں۔ مولوی حسین احمد صاحب مدنی، وحید احمد ان کا برادر زادہ، مولوی عزیر گل مولوی حکیم نصرت حسین۔ یہ چار حضرات میرے ساتھ ہیں۔ سب خیریت سے ہیں۔ اور سلام مسنون عرض کرتے ہیں۔ جس کاغذ پر یہ خط لکھ رہا ہوں انھیں پر خط لکھنے کی اجازت ہے اس لئے سند حدیث اس وقت ارسال کرنے کا موقع نہیں۔ خدائے تعالیٰ کو منظور ہے تو دوسرے وقت آپ کے فرمانے کی تعمیل ہو جائے گی۔ آپ طلبہ کو سند دیجئے، اس میں تامل نہ فرمائیں۔ بندہ کی سند یہ ہے کہ بندہ کو حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ سے ان کو حضرت شاہ عبدالغنی مہاجر مدنیؒ اور مولانا احمد علی صاحب سہارنپوری سے ان دونوں حضرات کو حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب سے ان کو حضرت شاہ عبدالعزیزؒ سے ان کو اپنے والد حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ سے رحمہم اللہ علیہم اجمعین اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی سند کتابوں میں اور علماء میں مشہور ہے اس کے لکھنے کی حاجت نہیں۔ آپ احقر کے لئے دعاء عافیت دارین فرماتے ہیں۔ بندہ بھی آپ کے لئے دعا کرتا ہے۔ تولد فرزند سے خوشی ہوئی اللہ تعالیٰ عمر اور سعادت دارین عطا فرماوے۔ ایک تعویذ لکھتا ہوں اس کو لکھ کر عزیز معصوم کے گلے میں ڈال دینا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اعوذ بکلمات اللہ التامۃ من شر کل شیطانٍ وہامۃ

وعین لامۃ تحصنت تحصن الف الف لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔

اصحاب سورت خدا کرے سب خیریت سے ہوں۔ سب کی خدمت میں سلام مسنون پہونچا دیجئے۔ والسلام مع الاکرام۔ بندہ محمود حسن

مالٹا سینٹ کلیمنٹ براکس ۲۸ ذیقعدہ ۱۳۳۶ھ ۲۲۱۹

مکتوب نمبر ۱۰ از مالٹا بنام مولوی محمد حنیف صاحب۔

عزیز محترم اسعدکم اللہ واکرم السلام علیکم ورحمۃ اللہ

پہلے بھی کئی خط روانہ کر چکا ہوں۔ تمھارے بھی کئی خط آئے۔ بحمد اللہ خیریت سے ہوں۔ اور جملہ رفقا بھی خیریت سے ہیں۔ جمادی الثانی کے شروع پر تمہارا مرسلہ گوشت پہونچا عجیب چیز معلوم ہوا کئی برس کے بعد گائے کا گوشت نظر آیا۔ کچے میں کسی قدر بو آتی تھی مگر پکنے کے بعد اچھا ہو گیا مزے سے کھایا چونکہ گوشت کا قدر دان اور شائق اپنی جماعت میں صرف میں ہی ہوں اس لئے باوجود دانتوں کی کمزوری کے اوروں سے زیادہ کھایا تم نے جو چوغے بھیجے تھے ان کی رسید اسی وقت تمھارے پاس روانہ کر دی تھی۔ مولوی زاہد حسن صاحب امروہی نے سب کے واسطے متعدد کرتے اور پاجامے سادہ اگر اور بہت سی چائے اور چاول وغیرہ اشیاء بھیجی تھی اس کی رسید بھی ان کے نام روانہ کر چکا ہوں۔ تمھارے پاس خط پہونچ جائے تو تم بھی ان کو مطلع کر دینا۔ میرا سلام چھوٹوں بڑوں سبھی کو پہونچا دینا اور جملہ رفیق آپ کو اور سب کو سلام عرض کرتے ہیں۔ اسیروں کے متعلق تحریکات شروع ہیں حق سبحانہ کو منظور ہے تو جلد یا کچھ دیر کے بعد نتائج بھی ظاہر ہو جاویں گے اللہ بس باقی ہوس والسلام۔

۴ جمادی الثانی ۱۳۳۷ھ

مکتوب ۱۱ | بنام مولوی محمد حنیف صاحب از مالٹا (مختصراً)

میں اور جملہ رفقا اطمینان سے ہیں حق تعالیٰ بخیریت آپ سے ملا دے دعا کرتے رہیئے۔ یہاں کہیں کی کمی نہیں۔ جملہ رفقا جس عزم اور ہمت سے میرے ساتھ ہوئے تھے اسی عزم پر پختہ ہیں۔ بعض موقعوں پر بعض صاحبوں کو میں نے چھوڑنا بھی چاہا کہ تم کیوں میری وجہ سے مفت دقت میں پڑتے ہو مگر کسی نے علیحدگی گوارا نہیں کی ہر جگہ ہر طرح سے میری راحت اور تقویت میں مستعد ہیں گویا اپنے گھر بیٹھا ہوا ہوں۔ مجھ کو کچھ فکر کرنا نہیں پڑتا۔ جزاہم اللہ تعالیٰ
خدا گر بحکمت بہ بندد درے ؛ کشاید بفضل و کرم دیگرے۔ اکثر یاد آجاتا ہے۔

چند اشعار مناجات حضرت شیخ الہندؒ

سب مراتب ہیں تیری ذات مقدس سے ورے ؛ کس زباں سے کہوں ہے مرتبہ اعلیٰ تیرا
نور خورشید چمکتا ہے ہر اک ذرہ میں ؛ چشم بینا ہو تو ہر شے میں ہے جلوہ تیرا
بیم دوزخ ہے اسے اور نہ شوق جنت ؛ جس کو مطلوب ہے اک درد کا ذرا تیرا
تیرے دیوانوں کو کیا قید علائق سے گزند ؛ دونوں عالم سے بھی آزاد ہے . بردا تیرا
دل صد پارہ ہو ہر پارہ میں ہو داغ جنوں ؛ نام کندہ ہو ہر اک داغ پہ مولا تیرا
نفس و ابلیس کے پھندے میں پھنسا ہوں لیکن ؛ دل سے اقرار یہی ہے کہ ہوں بندہ تیرا

ہم سیہ بخت اگر ایسے ہی ناکام رہے
کیسے جانیں گے کہ کیا فضل ہے ربا تیرا

۔ تمت ۔

مصنف کی چند دوسری کتابیں

امام اعظم ابو حنیفہؒ اردو زبان میں بے نظیر ریسرچ آج تک امام اعظم ابو حنیفہ کے حالات پر اس شان کی کتاب اردو زبان میں شائع نہیں ہوئی ہے۔ عربی اردو، فارسی، انگریزی کی سینکڑوں مشہور اور معروف کتابوں کا خزانہ ہے۔ پھر ترتیب اس شان کی ہے کہ آج تک ہندوستان میں اس ترتیب پر کوئی کتاب طبع نہیں ہوئی ہے اس کتاب میں امام صاحب کی مکمل سوانح حیات کے علاوہ مندرجہ ذیل ابواب بھی موجود ہیں۔ امام صاحب اور تابعیت، سیاسی زندگی، امام صاحب اور علم الکلام، امام صاحب اور تصوف، امام صاحب اور حدیث، تاریخ تدوین فقہ، قواعد کلیہ، مفکرین کی رائیں۔ غرضکہ پوری کتاب بارہ ابواب پر مشتمل ہے۔ مصنف نے پانچ سال کے عرصہ میں اس کو ترتیب دیا ہے، ہمارا دعویٰ ہے کہ یہ کتاب پڑھنے کے بعد آپ بھی یہی فرمائیں گے کہ کتاب لاثانی ہے۔ صفحات ۳۲۰، قیمت ۵ روپئے ۵۰ نئے پیسے

محبت والے عورتوں، بچوں، لڑکیوں، طلبا اور تبلیغی جماعت کے لوگوں، ائمہ مساجد غرضکہ ہر طبقہ کو پیش نظر رکھ کر اس کتاب کو ترتیب دیا گیا ہے۔ سیرت رسولؐ، سیرت صحابہؓ، سیرت تابعین، سیرت اولیاء اللہ میں بے نظیر کتاب ہے۔ حضرات صحابہؓ سے لیکر اب تک کے بزرگوں کے ترتیب وار عشق و محبت رسول میں ڈوبے ہوئے حالات اور واقعات اس کتاب کی زینت بنے ہوئے ہیں۔
قیمت ایک روپیہ ۵۰ نئے پیسے۔

وصایا
اس کتاب میں انبیاء علیہم السلام کی وہ زرین نصیحتیں موجود ہیں جنکو وصیت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ قرآن شریف، حدیث، سیرت، تاریخ کی سینکڑوں کتابوں سے تلاش کر کے اس کتاب میں زرین نصیحتوں کو جمع کیا گیا ہے اسکی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اہل ملایا نے اس کے تین سو نسخے خریدے ہیں۔ پہلا اڈیشن قریب الختم ہے جلدی فرمایئے۔ قیمت مجلد دو روپے ۲۵ پیسے۔

انفاس قدسیہ
یہ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رح کی سیرت قرآن و حدیث کی روشنی میں لکھی گئی ہے۔ حضرت مولانا محترم کے تمام گوشہائے زندگی کو قرآن و حدیث کی روشنی میں پیش کر کے مصنف نے کمال کر دیا ہے۔ اس کتاب کا پہلا اڈیشن ختم ہو چکا ہے۔ اب دوسرا اڈیشن جدید اضافوں کے بعد طبع کیا گیا ہے جس کی وجہ سے کتاب کا حجم بڑھ گیا ہے۔ کتابت، طباعت اعلیٰ قسم کی ہے۔ قیمت مجلد تین روپئے۔

تذکرہ مشائخ دیوبند
اس کتاب کا پہلا اڈیشن ختم ہو چکا ہے۔ اب دوسرا اڈیشن زیر طبع ہے۔ اس کتاب میں مشائخ دیوبند کی دو صد سالہ تاریخ کو بیان کیا گیا ہے۔ حضرت میانجی نور محمد صاحب سے لیکر حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری مرحوم اور حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب حضرت مولانا محمد یوسف امیر تبلیغ کے حالات اس کتاب کی زینت بنے ہیں۔ یہ کتاب کتاب عربی ممالک میں مقبول ہو رہی ہے۔ وہاں کی وجہ سے اس کی طباعت میں خاص اہتمام کیا جا رہا ہے۔ ایک خط بھیج کر نسخہ محفوظ کرائیں۔